قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جنوری 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

خوبصورت سوچ کے ساتھ

ایک نئی صبح کا آغاز

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

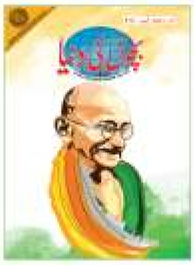

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24، شمارہ:01، جنوری 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

سرورق خطاطی: محمد احرار ہندی

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات

اردو ادب میں خواتین کی نیرنگیاں — معزہ قاضی دلوی 9

تیج بہادر سپرو کی آئینی اور تہذیبی بصیرت — عمیر منظر 13

تحقیق میں اخلاقیاتی ملحوظات — نوشاد حسین 16

قاضی عبدالغفار کی ادبی سرگرمیاں — جہانگیر احمد خان 20

کرشن چندر بہ حیثیت ریڈیائی ڈراما نگار — جوہی بیگم 22

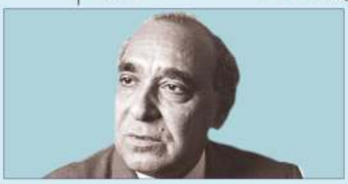

افسانہ سمت اور امکانات

بیسویں صدی کا افسانوی ادب اور ہندوستانی سماج — ارشد اقبال 25

بلراج مین را کے افسانوں کی فنی وفکری جہتیں — اقلیمہ حبیب 29

زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے لپٹی روٹیاں — شاذیہ تمکین 32

اردو اور ادب اطفال

سیوان میں ادب اطفال: ماضی تا حال — ارشاد احمد 35

کامکس اور ادب اطفال — رضی شہاب 38

شاعر اطفال: ابوالمجاہد زاہد — دلشاد حسین اصلاحی 40

زبان و تعلیم

مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور قومی تعلیمی پالیسی — شفاعت احمد 43

خراجِ عقیدت

سحر سعیدی: ایک وضع دار شخصیت — عظیم راہی 45

سلسلۂ صحافت

اردو صحافت کی خشت اوّل جام جہاں نما — محمد ضیاء المصطفیٰ 48

کتب خانے

امیر الدولہ پبلک لائبریری — زین البشر انصاری 51

سائنس اور سماجیات

جھاگ چھوڑتے اور جلتے ہوئے پانی کے ذخائر — صدف کلام 54

غیر حکومتی تنظیموں کی بدلتی جہات — ابو اسامہ 57

دوسری زبانوں سے

احمقوں کی ٹولی — توفیق الحکیم، مترجم: محمد قطب الدین 60

عالمی ادبیات

بنارس میں فارسی ادب — تمنا شاہین 63

خصوصی گفتگو

پروفیسر صادق سے انٹرویو — نوشاد عالم ندوی 66

نیا آسمان نئے ستارے

اکبر حیدری کشمیری کی تحقیقات عالیہ — سجاد احمد صوفی 68

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ 73

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

قارئین! ایک بار پھر ہم نئے جذبات، نئے خوابوں، نئے منصوبوں اور نئی امنگوں کے ساتھ نئے سال میں داخل ہو رہے ہیں۔ دعا کیجیے کہ یہ نیا سال ہماری توقعات کے مطابق ہو اور ہم سب زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی کی منزلوں کو طے کرتے چلے جائیں۔ اس موقع پر ہم دل کی اتھاہ گہرائیوں سے قارئین اردو دنیا کی خدمت میں نیک خواہشات اور ڈھیر ساری مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ نئے سال کی صبح اپنی تازگی کو سایہ فگن کر کے بندگانِ خدا کے سینوں میں جینے اور کچھ پانے کے جذبات موجزن کرتی ہے۔ اسی لیے بہت سے لوگ آفتاب کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی خوابوں کی تعبیر کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو اپنے اس جوش کی حرارت کو وقت کے ساتھ سرد نہیں ہونے دیتے اور پورے سال اپنے اہداف کے تعاقب میں لگے رہتے ہیں، نتیجتاً کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو چند ماہ و ایام کے بعد ہی تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے اور پھر وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنی ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو نئے سال میں بھی کوئی کامیابی ہاتھ نہیں آتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ خواب جو ہم سال کے آغاز میں دیکھیں یا اس موقع پر جو منصوبہ بندی کریں اس کو پانے کے لیے پورے سال سرگرم رہیں۔

حضرات! نئے سال کے اس پر مسرت موقع پر ہم جہاں اپنی زندگی اور مستقبل کے حوالے سے مختلف منصوبے بنائیں، وہیں ہم اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے بھی کوئی نہ کوئی لائحۂ عمل ضرور تیار کریں۔ اس زبان کے فروغ کا مطلب قومی یکجہتی و ہم آہنگی کے جذبے کو فروغ دینا ہے۔ کیونکہ اردو زبان کے خمیر میں قومیت، وطنیت اور گنگا جمنی تہذیب کا تصور موجود ہے۔ گویا کہ اردو زبان کی خدمت نہ صرف زبان کی خدمت ہے بلکہ گنگا جمنی تہذیب، اور ملک و قوم کی بھی خدمت ہے، اور وقت کا تقاضا ہے کہ وطنیت و قومیت کے جذبے کی حرارت کو سرد نہ ہونے دیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے اور اردو کی نئی نئی بستیاں وجود میں آرہی ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کی قدیم بستیوں میں اردو کے تعلق سے سرد مہری دکھائی دے رہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی بستیوں کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ قدیم بستیوں میں بھی اردو کی جڑیں ترو تازہ رہیں۔ نئے سال کے موقع پر اردو زبان سے وابستہ تمام افراد اردو کے تعلق سے کوئی نہ کوئی عہد لیں۔ مثلاً ہر اردو داں کم از کم ایک شخص کو اردو سکھانے کا عزم کرے۔ اس طرح نئے سال میں اردو جاننے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو سکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس بات کے لیے بھی عہد بند ہو سکتے ہیں کہ وہ پورے سال اپنے گھر کے لیے اردو کا کوئی ایک اخبار یا رسالہ جاری کروائیں گے۔ اس ایک قدم سے کتنے ہی نیم جان اردو اخبارات و رسائل کو زندگی مل جائے گی۔ اردو کے قلمکاروں اور تحقیق کاروں کو بھی چاہیے کہ وہ نئے سال میں مضامین و مقالات یا تخلیقات تیار کرنے کا خود سے وعدہ کریں، اس طرح یقیناً بہت سی نئی تحریریں اور کتابیں اردو کے کتابی و ادبی ذخیرے میں اضافے کا باعث بن سکتی ہیں۔ کسی بھی زبان کے فروغ کے لیے کتابوں کی خریداری بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے اردو جاننے والے سال میں دو تین کتابیں ضرور خریدیں تاکہ قارئین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو۔ یہ بہت حیرت کی بات ہے کہ فی زمانہ اردو والوں میں کتابیں پڑھنے کا رواج بتدریج کم ہو رہا ہے۔ اگر پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے لوگ سال میں دو تین کتابیں بھی پڑھیں گے تو اس سے اردو زبان کو بہت فائدہ ہوگا اور اس طرح اردو کی کتابیں خریدنے کی رفتار میں تیزی آئے گی اور اردو کی مارکیٹ کو تقویت حاصل ہوگی۔ شعرا حضرات کم از کم ایک نظم وطنیت کے پس منظر میں ضرور لکھیں تاکہ اردو کی وطنی شاعری میں بھی اضافہ ہو اور عوام الناس کے درمیان حب الوطنی کو بھی فروغ ملے۔ جو لوگ اردو بولتے ہیں مگر پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، انھیں بھی اردو لکھنے اور پڑھنے کا ارادہ کرنا چاہیے، کیونکہ زبان جاننے والوں کے لیے لکھنا اور پڑھنا بہت مشکل عمل نہیں ہے، تھوڑی سی توجہ سے یہ ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس موقعے پر ہم ایک اور نکتے پر توجہ دے سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اردو کی مجلسیں بھی منعقد کریں اور ان میں شرکت بھی کریں تاکہ اردو کا ماحول ہمارے معاشرے میں تیار ہو جائے۔ یہ ماحول یقیناً اردو کے فروغ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ غرض یہ کہ اس نئے سال میں ہم اردو زبان کے تعلق سے اپنی وسعت کے مطابق کوئی نہ کوئی قدم ضرور اٹھائیں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

'اُردو دنیا' دسمبر 2021 ہدست ہوا۔ اس کا سرورق خوشنویسی کے ایک خوبصورت نمونے سے مزین ہے۔ اداریہ میں 13 شہ سرخیاں اور 25 سے زائد ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ 'خطوط' میں چار چٹھیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ کچھ نکتہ چینی اور کچھ مشورے بھی شامل ہیں۔ دیکھیے کون سے قابل اعتنا اور کون سے قابل نظرانداز ہیں۔ 'ادب: زاویے اور جہات' کے تحت کوئی چار مقالے درج ہیں۔ ان میں آخری مقالے کو چھوڑ کر کچھ معروف اور کچھ گمنام ادیبوں کے تذکرے شامل ہیں۔ اس ضمن میں یہ کہنا ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے ادب میں معروف کے ساتھ ساتھ گمنام ادیبوں پر مضامین کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ مگر اس میں قباحت یہ محسوس ہوتی ہے کہ معروف ادیبوں پر بہت کچھ مواد میسر تو آجاتا ہے لیکن گمنام ادیب بس ان پر لکھے ہوئے مضمون میں ہی

یاد رہتے ہیں بعد میں پھر فراموش ہو جاتے ہیں۔ شاید صرف مصنف کو ہی کبھی کبھی یاد رہتے ہوں گے۔ اس لیے کچھ ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ وہ اکثر یاد رہ سکیں۔ آخری مقالہ 'اردو میں بین العلومی تنقید' اچھی تصنیف ہے۔ اس کے مطابق مختلف علوم وفنون کے اثرات شعر و ادب میں تلاش کیے جاتے ہیں اور یہ کہ اس میں کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی۔ اب آپ نے احساس دلایا ہے تو خود بھی کوشش کیجیے اور شاید دوسرے بھی کریں مگر ہر مضمون یا علم خود بہت مفصل ہوتا ہے۔ اس طرح تمام علوم کا تو ایک انسائیکلوپیڈیا بن جائے گا۔ اس مضمون میں مثال کے بطور جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان میں وہ گہرائی نہیں جو موضوع کا تقاضا ہے۔ 'زبان و تعلیم' میں نظام تعلیم پر تین اہم مضامین شامل ہیں۔ تینوں کے موضوعات جدا جدا ہیں لیکن اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں برق رفتاری سے بدلتی ہوئی تکنالوجی اور تیز تر معلومات کے بہاؤ میں سابقہ نظام تعلیم اپنی رفتار برقرار نہیں رکھ پاتا اس لیے اس میں خاطر خواہ تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے پالیسیوں میں تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔ جناب پی پی سری واستو رند اور جناب جگموہن سنگھ نے 'اٹل جی کی یاد میں' میں بھارت رتن اٹل بہاری واجپئی کی زندگی اور کلام پر دو نادر مضامین تحریر کیے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'نگر نگر اُردو' میں 'ودربھ کی خواتین افسانہ نگار' کا بیان درج ہے۔ اس عنوان کے تحت مصنف نے کوئی 22 خواتین افسانہ نگاروں سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ 'سلسلۂ صحافت' کے تحت ضلع بجنور میں عاجلانہ ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ وہاں سے جاری ہونے والا اخبار 'مہر نیم روز' کا صحیح سنہ اجرا 1878 ہے۔ 'یادِ رفتگان' کے تحت دو ادیبوں کے کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اموات کی جانکاہ خبریں بھی شامل ہیں۔ 'شمس و قمر' میں دو ادیبوں کے کارناموں کا ذکر ہے۔ ایک تو ل. احمد اکبرآبادی، اور دوسرے فائز دہلوی جن کے کلام میں مقامی رنگ جھلکتا ہے۔ 'خصوصی گفتگو' میں موجودہ تحقیقی نظام کے متعلق جناب ابرار رحمانی کہتے ہیں کہ یہ موجودہ نظام نہایت لچر ہے۔ اس کی تفصیلات مضمون میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' میں تین اہم مقالے دیے گئے ہیں۔ 'کتابوں کی دنیا' میں کوئی 15 مطبوعات پر تبصرے درج ہیں۔ انھیں پڑھ کر آپ اپنی پسند کی کتاب/کتب منتخب کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔ 'خبرنامہ' میں قومی اردو کونسل کی جانب سے اردو دنیا کی اہم خبروں سے واقف کرایا گیا ہے۔ اس طرح یہ شمارہ قابل تعریف و قابل مطالعہ ہے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'اردو دنیا' کا شمارہ وہ بھی تازہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے پہلے مل جاتا ہے۔ اس کا سرورق اکتوبر کی مناسبت سے موزوں ہے۔ اس پر گاندھی جی کی تصویر شائع ہوئی۔ جگر کا شعر مہاتما گاندھی کے پُرامن رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ گاندھی جی کی شخصیت اور افکار

کے حوالے سے بیشتر زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اردو میں گاندھی جی کی خودنوشت تلاش حق کے عنوان سے شائع ہوئی۔ گاندھی جی کے افکار کی معنویت اور عصریت کے حوالے سے اردو میں بہت سی کتابیں تحریر کی گئیں، ان کے نظریات اور افکار پر مقالات کی کثرت ہے۔

انیس الحسن صدیقی نے اپنے مضمون 'گاندھی جی بطور ایک شوقین ہیئت داں' میں علم ہیئت و اجرام فلکی سے ان کے ذوق وشوق کو ظاہر کیا ہے۔ غزالہ پروین نے 'احمد شوقی کے ممدوح مہاتما گاندھی' میں ان کی سیرت شخصیت اور خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔ بانو سرتاج نے 'اردو اور ہندوستانیت' میں اردو اور ہندی کا تعلق اور موقف پر تجزیہ پیش کیا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے 'اردو میں مکتوب نگاری آغاز و ارتقا اور زوال' پر روشنی ڈالی ہے، لیکن تعجب ہے کہ اردو کا پہلا خطوط نگار کون ہے، انھوں نے خلیق انجم کے حوالے سے بات کی ہے۔ تاریخی ترتیب سے کس نے پہلے خط لکھا۔ افتخار الدین علی خاں شہرت 1810۔ رجب علی بیگ سرور خواجہ غلام خاں بے خبر 1846 جان طپش (راسخ عظیم آبادی) 1914 سے قبل کے خطوط ہیں۔ ڈاکٹر ثریا حسین کی تحقیق کے مطابق شہرت کا خط تاریخی اعتبار سے اردو کا پہلا قرار پاتا ہے۔ کس کے نام لکھا ہے، ذکر نہیں ہے۔ راجا رام موہن رائے، سید احمد، شبلی نعمانی، محمد اقبال، سعادت حسن منٹو وغیرہ کے خطوط دیے گئے جو سادہ اور سلیس نثر میں ہیں۔ معید الرحمٰن نے 'سائنس اور ادب کے امتیازات' میں سائنس اور ادب کا موازنہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں سائنس کے مطابق علم اسے کہتے ہیں جسے تجربہ گاہ میں ثابت کیا جاسکے۔ جس چیز کو ثابت نہ کیا جاسکے وہ احاطہ علم سے خارج ہے۔'' عمران عراقی نے 'ساحر لدھیانوی ایک مقبول اور حقیقت پسند شاعر' میں ان کے کلام کی بنیادی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا کلام انقلابی احتجاجی کے ساتھ رومانی دکھائی دیتا ہے۔ سالک جمیل براڑ نے 'ساحر بطور بچوں کا شاعر' میں ان کی نظمیں جو بچوں پر ہیں اس کا تجزیہ کیا ہے۔ درخشاں تاجور نے '1857 کی جنگ آزادی کا عظیم سپاہی سپہ سالار بخت خاں' کے کارنامے بیان کیے اور 1857 میں ان کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ عظیم انصاری نے 'جنگ آزادی کا ایک عظیم مجاہد مولوی سید علاء الدین حیدر' کی زندگی اور کارناموں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ حیدرآباد کی تاریخ بھی ہے کہ طرہ باز خاں اور علاء الدین نے آزادی کی روح پھونکی۔ اس طرح اس شمارے کے باقی مشمولات بھی ادبی معلومات سے پر اور تنقیدی وتحقیقی نکات حقیقت لیے ہوئے ہے۔ 100 صفحات کا شمارہ ہمہ جہت خوبیوں کا پیکر ہے۔ اسکالروں کے لیے افادیت واہمیت کا حامل ہے۔

ماہ نومبر کا شمارہ یکم نومبر سے پہلے موصول ہوگیا۔ ہماری بات میں مدیر نے عالمی تناظر میں ادب کا جائزہ لیا ہے۔ آمنہ تحسین نے 'صنفی مساوات کا فروغ اور اردو میں معلوماتی ادب' کی ضرورت واہمیت میں معاشرتی وسماجی لحاظ سے اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ دراصل عورت اور مرد اپنے منصب کو سمجھیں اور عورت کو برابر کا شریک گردانیں۔ دونوں برابر ہیں لیکن مرد اساس سماج میں عورت کو کم تر سمجھا جاتا ہے۔ اختر آزاد نے 'غزل کائنات کا آئینہ گر شائق مظفر پوری' کے شعری فکر وفن کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ 'امیر خسرو دہلوی کی نقد نگاری' نیلوفر حفیظ نے ادب میں ان کے موقف کا جائزہ لیا ہے دیباچہ غرۃ الکمال کے حوالے سے بہ حیثیت نقادان پر روشنی ڈالی ہے۔ ویسے تخلیق کار پہلے نقاد ہوتا ہے بعد میں تخلیق کار۔ تسلیم عارف نے 'مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری' پر ایک نظر میں مولانا کی شاعری کا جائزہ لیا ہے جو منفرد ہے۔ محمد فیصل نے 'اکبر اور کمال اکبر' میں اکبر الہ آبادی کی شعری کائنات کا محاکمہ کیا ہے۔ اکبر مشرقی تہذیب کے ہمنوا تھے اور انگریزی تہذیب سے حد درجہ نفرت کرتے تھے تاکہ انگریز یہاں سے چلے جائیں۔

مہتاب جہاں نے 'خدا بخش خاں بہادر اور ان کی لائبریری' میں ان کے کارنامے پر روشنی ڈالی ہے۔ مشتاق احمد گنائی نے 'شعبۂ اردو سیوا سدن کالج برہانپور کی ادبی وتحقیقی خدمات' میں جو تحقیقی کام ہوا یا ہو رہا ہے اس کی تفصیلات بتائی ہیں۔ اس طرح کے اور بھی مضامین شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ رؤف خیر نے جنوبی ہند کے نابغہ روزگار سید احمد ایثار کے کارنامے بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اقبال کی فارسی تصانیف کا اردو میں ترجمہ کیا ہے یہ بہت بڑا کام ہے۔ شبیر احمد لون دیار دکن کا پروقار قلم کار پروفیسر بیگ احساس میں ان کی حیات اور ادبی کارناموں سے بحث کی ہے اور ان کے چند افسانوں کا تجزیہ اور محاکمہ پیش کیا ہے۔ آفتاب عالم اعظمی نے علامہ شبلی نعمانی کے نظریہ تعلیم کی انفرادیت میں جدید اور قدیم تعلیم کی طرف مائل تھے، لیکن حالی، شبلی، سرسید جدید تعلیم کی طرف توجہ کرتے تھے۔ محمد عارف بالی ووڈ فلمیں اور مشاہیر میں منٹو، مجروح، ندا فاضلی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ باقی مشمولات پڑھنے کے لائق ہیں۔ NCPUL کے پورے اسٹاف کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایسا رسالہ شائع کیا ہے جو اردو والوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا ہے اور اردو والوں سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس کو خرید کر پڑھیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ،

'اردو دنیا' کے نومبر ماہ کے اداریے میں کتاب کلچر کے احیا کے نصب العین سے عوام الناس تک کتب کی رسائی وغیرہ مختلف مقاصد کو پورا کرنے کے نظریے سے ایک مربوط ومنظم طریقۂ کار اختیار کرنے کی فوری ضرورت کو احسن نثر میں بخوبی نشان زد کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں محترمہ آمنہ تحسین نے اپنے مضمون 'صنفی مساوات...' میں مرد اساس معاشرے میں عورت کی صنفی مساوات سے متعلق متعدد مسائل کا جو محاکمہ پیش کیا ہے، وہ بھی لائق صد ستائش ٹھہرتا ہے۔

جناب اختر آزاد نے قارئین کو نسبتاً کم معروف، لیکن بلند پایہ شاعر شائق مظفر پوری کی اعلیٰ وارفع شاعری سے واقف کرانے کا مفید کام سرانجام دیا ہے۔ اس شاعر کی شاعری میں حیات کی تلخیاں، خیالات کی پختگی وتازگی تو ہے ہی، مستزاد، قنوطیت آمیزی کے ساتھ ہی امید پرستی اور سہلِ ممتنع کی پے در پے ملنے والی ہیئت بھی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ مثلاً ''نقطہ ہی سہی، تو کوئی زاویہ بنا..'' اور ''تعبیر کے موتی چننے میں زمانہ لگتا ہے۔'' (ص 15)

جناب محمد فیصل خاں نے خصوصاً طنز ومزاح کے ہی شاعر مانے جانے والے عظیم شاعر اکبر الہ آبادی کی شاعری میں سنجیدگی کے مدِ نظر بھی ایک ہمہ گیر تحقیقی کتاب تیار کرنے کی ضرورت کی جو بخوبی خط کشی کی ہے، وہ قابلِ مدح ہے۔ اکبر الہ آبادی کے فرزند کا نام تھا 'عشرت خاں' اور اسی نام پر ان کے دولت خانے کا نام 'عشرت منزل' رکھا

گیا تھا۔ تحقیق کے بعد پتا چلا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے دولت خانے کا نام گویا ترجمہ کر کے ہی 'آنند بھون' رکھا گیا تھا۔

جناب محمد عارف نے اپنے مضمون میں ہندی فلموں کے اہم نغمہ نگاروں، موسیقاروں وغیرہ کا ایک موقر تجزیہ کیا ہے۔ ص 59 پر کیفی اعظمی صاحب کے محولہ نغمے میں (تیسرا کالم نیچے سے 5ویں سطر) 'تم اتنا جو مسکرا رہے ہو' کے بعد 'کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو' یہ اگلا مصرعہ کیوں مفقود ہو گیا ہے؟

ہندی فلم 'امراؤ جان ادا' میں شاعر شہریار کے مشہور نغمے 'دل چیز کیا ہے، آپ میری جان لیجیے۔' کا اصلی محرک اس ناچیز نے کئی دنوں کی ازحد عرق ریزی کے بعد مصحفی کا یہ شعر پایا ہے۔ ''کیا چیز دل ہے، چاہے تو جان لیجیے، پر بات کوئی ہے، جو کہوں مان لیجیے۔'' اول مصرعے کا یہ ایک دیگر متن تو فلمی نغمے والا ہو بہو ہے: ''دل چیز کیا ہے، آپ میری جان لیجیے'' (دیوانِ مصحفی، ص 268)

کلی طور پر اتنی کم قیمت اور صفحات میں معلومات کا ایک ایسا نایاب خزینہ ہر منظر عام پر ظہور پذیر ہو رہا ہے کہ بے ساختہ زبان سے غالب کے شعر کا یہ مصرع نکل جاتا ہے: ''ایسا کہاں سے لاؤں، کہ تجھ سا کہیں جسے۔''

اردو دنیا 'دسمبر 2021' کا شمارہ ملا جس میں اٹل بہاری باجپئی کی شاعری پر مضامین ہیں۔ ہندوستان کے جن سیاسی سربراہوں نے بحروں سے معرا اپنی نثری و آزاد نظموں سے شاعری کی شاہ راہ میں بھی اپنے گوناگوں پرچم بلند کیے تھے، ان میں سابق وزیر اعظم بھارت رتن جناب اٹل بہاری واجپئی کا نام سرفہرست رہا ہے۔ انھوں نے ازحد قنوطیت آمیز و نامساعد ماحول اور حالات میں بھی رجائیت پسندی سے مامور جذبات کو اپنی شاعری میں منعکس کرتے ہوئے ہمیں 'پڑاؤ کو ہی اپنی منزل' سمجھنے کا مفید اہم سبق پے درپے فراہم کیا ہے۔ جناب پی پی سریواستو نے بھی ان کی ہندی کویتاؤں کو موضوع بنا کر بالخصوص شعری نثر میں اپنی بھی انفرادی فکر و نظر کا ایک مستند ثبوت منقوش کیا ہے۔ واجپئی صاحب نے 'ہار ماننے اور رار ٹھاننے' کی بجائے 'کال کے کپال پر نئے گیت گانے' کا جو پیغام دنیا بھر کے لوگوں کو دیا تھا، وہ تا حال بے مثال ہے۔ بالخصوص اونچے پہاڑوں پر پیڑ کے نہ اُگنے' کے بیان سے ان کی وسیع النظری و قدرت کے قابل رشک مناظر کے مشاہدے کا علم ہوتا ہے۔

جگ موہن سنگھ جی نے بھی سیاست کے اسی اہم ستون کو اپنے مقالے کے توسط سے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انھوں نے واجپئی جی کے ہی الفاظ میں یہ خلاصہ کیا ہے کہ کسی بھی شخص کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے یکسر بعید 'آدمی صرف آدمی ہوتا ہے۔'' عبدالحق نے مچھلی شہر کے علمی و ادبی محاسن کو بخوبی نشان زد کیا ہے، مثلاً قلمی نسخوں سے جو حیران کن استفادہ کیا ہے، وہ قابل دید و لائق تقلید بھی ہے۔ ان پر عبرت مچھلی شہری کا ایک شعر صادق آتا ہے'' کچھ لوگوں نے نیزوں پر تاریخ لکھی ہے۔'' (ص 10)

جناب تجمل حسین نے ڈاکٹر خلیق انجم کی بے بہا و بے شمار تخلیقات کے تجزیے سے خراج تحسین پیش کرنے میں کوئی بھی کور کسر نہیں رکھی ہے۔

کلی طور پر آپ کا ادارہ گم نام اور کم نام ادبا و شعرا سے وابستہ جس طرح پے در پے مقالے شائع کرتا جا رہا ہے، وہ بھی اردو ادب و شاعری کی تاریخ میں زریں الفاظ میں لکھے جانے کے لائق ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ اس شمارے میں شامل سارے مضامین اور تبصرے حسب سابق معلوماتی ہیں تاہم محمد تنظیم عالم کا 'مولانا عبدالماجد دریابادی بہ حیثیت تبصرہ نگار'، تسلیم عارف کا 'مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری پر ایک نظر'، مہتاب جہاں کا 'خدا بخش خاں بہادر اور ان کی لائبریری'، معراج الاسلام کا 'جاپان میں اردو'، سالک دھامپوری کا 'طنز و مزاح کا درخشاں ستارہ: ہلال سیوہاروی'، راحت علی صدیقی کا 'جن کتابوں نے متاثر کیا' ان مضامین نے کافی متاثر کیا۔ 'ہماری بات' کے تحت شیخ عقیل احمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ ''ہماری نئی نسل کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ لازمی ہے کہ وسیع پیمانے پر کتاب کلچر کے احیا کی کوشش کی جائے کیونکہ اگر کتابیں نہیں رہیں تو ہمارا پورا سماج ایک شہر خموشاں یا قبرستان میں تبدیل ہو جائے گا۔'' بلاشبہ ادب کے مقاصد کا دائرہ وسیع تر ہے۔ اگر یہ صرف چند مخصوص حلقوں یا ذہنوں تک محدود رہے تو پھر ایسے ادب سے کیا فائدہ؟ شمارہ کا خبر نامہ بیش بہا نعمت ہے۔ میری طرف سے تمام قلمکاروں کو مبارکباد!

معین الدین شمسی: گریڈیہ، جھارکھنڈ

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

اردو ادب میں خواتین کی نیرنگیاں

معزہ (قاضی) دلوی

ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور معاشرہ وجود زن کے بغیر نامکمل۔ چونکہ ادب اور سماج کا گہرا رشتہ ہے لہٰذا ادب کا تصور بھی سماج کے بغیر نامکمل ہے۔ خدا نے حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا اور دنیا آباد کی۔ ہر زمانے میں سماج الگ الگ انداز سے وجود میں آتا گیا جس میں خواتین کو کبھی عزت کا مقام حاصل ہوا تو کبھی وہ خستہ حالی کا شکار ہوئیں۔ وقت کا پہیہ کئی زاویوں پر آگے بڑھتا رہا اور مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے بھی عروج و زوال کے پیش نظر اس نے مصلحین کو بھی جنم دیا جن کی دی ہوئی تعلیم و تربیت کے تحت ایسی تحریریں منظر عام پر آئیں جو اپنے عہد کے زبان و ادب کا حصہ بنتی گئیں۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی ہندوستانی تاریخ اور بالخصوص مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کا ایسا سیاہ ورق ہے جس نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کو نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور پہلی جنگ آزادی کی وجہ سے ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ اس قیامت خیز جنگ آزادی نے بزرگان قوم و ملت کی ذہنیت، خیالات، افکار اور رجحانات میں ایسا تلاطم برپا کیا کہ ان کے دلوں میں ایک نئے احساس نے انگڑائی لی اور نئی منزل کو پانے کی لگن کے ساتھ روشن صبح کا خیر مقدم کرنے کے لیے انھوں نے اپنے قدموں کے رخ موڑ دیے۔ مصلح قوم نے جن راستوں کا انتخاب کیا ان میں ایک راستہ مردوں کی تعلیم، دوسرا سماجی و معاشرتی اصلاح اور تیسرا راستہ تعلیم نسواں کی جانب جا رہا تھا۔ وجود زن سے تصویر کائنات میں بکھرے ہوئے خوشنما رنگ بدنما ہوتے دکھائی دینے لگے تو انھیں دوبارہ خوشنما بنانے کا سفر تحریک تعلیم نسواں سے شروع ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناولوں کی مدد سے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف قدم اٹھایا۔ شیخ عبداللہ (علی گڑھ)، شیخ عثمان (پونے) اور جسٹس بدرالدین طیب جی (ممبئی) اور دیگران نے لڑکیوں کے لیے مدرسے قائم کیے۔ سید احمد دہلوی، شیخ عبداللہ، مولوی ممتاز علی جیسی ہستیوں نے صحافت کے ذریعے خواتین کی تعلیم و تربیت کی اور سب سے اہم بات یہ کہ انھوں نے اپنے ساتھ خواتین یعنی اپنی اپنی اہلیاؤں ہی کو اس کار خیر میں شامل کر کے خواتین کی جہالت اور بے علمی کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ان کے ایسے گروہ کو ترتیب پانے میں مدد کی جو تصنیف و تالیف اور اصلاحی کاموں کے ذریعے خواتین کو اپنا وجود منوانے میں مددگار ثابت ہوا۔ خواتین تعلیم کے میدان میں قدم بڑھاتی چلی گئیں اور ادب میں اپنی شناخت بنانے میں مصروف کار رہیں۔

1857 کے بعد خواتین اپنی تعلیم و تربیت اور اصلاح کے پہلے دور میں تھیں۔ اس دور میں ضعیف الاعتقادی، جہالت، مردوں اور بطور خاص خواتین میں تعلیم کی کمی اور فرسودہ رسم و رواج سے پھیلی ہوئی خرابیوں نے انھیں روشن زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد (1836-1912) نے اصلاحی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ناول تحریر کیے۔ اسی عہد میں بہار کے عظیم آباد (پٹنہ) کی رہنے والی رشید النسا نے 1881 میں اصلاح النسا کے نام سے ایک ناول لکھا جسے بقول رشید النسا، ان کے بیٹے محمد سلیمان نے تیرہ برس ردی میں پڑی کتاب کو 1894 میں چھپوایا اور اس کا نام اصلاح النسا رکھا گیا۔ اس ناول میں مصنفہ نے خواتین کے غیر ضروری شوق، بدعتوں اور جہالت دور کرنے کی غرض سے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کا حوالہ دیتے ہوئے سو میں سے پچہتر لڑکیوں کے اصغری بننے کی امید پر اطمینان کا اظہار کیا اور سرسید کے اس خیال سے کہ مرد جب تعلیم یافتہ ہوں گے تو وہ خود اپنے گھر کی لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دیں گے، سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال پیش کیا کہ:

''جب لڑکیاں شائستہ اور تعلیم یافتہ ہو جائیں گی تو لڑکوں کا تعلیم پانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔''[1]

خواتین کے ادب میں ناول اصلاح النسا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ناول اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک طرف تو یہ تحریک تعلیم نسواں کو تقویت پہنچاتا ہے اور دوسری طرف طبقۂ نسواں کی اصلاح کے راستے ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ اردو ادب میں خواتین کی ناول نگاری کا اولین نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ایک جانب اس طرح کے ناول تھے اور دوسری جانب خواتین کے لیے جاری کردہ وہ رسائل تھے جن کا مقصد خواتین میں تعلیمی ذوق و شوق پیدا کرنا تھا۔ خواتین کے اس کاروان ادب کی چند ناول نگار خواتین کے نام اکبری بیگم (...)، صغرا ہمایوں مرزا (سرگذشت ہاجرہ)، محمدی بیگم (سگھڑ بیٹی)، طیبہ بیگم خدیو جنگ (انوری بیگم)، نذر سجاد حیدر کی پھوپھی اور قرۃ العین حیدر کی نانی والدہ افضل علی (گودڑ کا لال)، خجستہ اختر سہروردی (آئینۂ عبرت)، ظفر جہاں بیگم (افسری بیگم)، نذر سجاد حیدر (حرماں نصیب)، اے آر خاتون (شمع، تصویر)، حمیدہ سلطان وغیرہ ہیں۔

آج کے سائنسی اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی قدم بڑھا رہی ہیں۔ اس حقیقت کو ایک ہندوستانی خاتون رقیہ سخاوت حسین نے 1908 میں قرطاس کی زینت بنایا۔ اپنے انگریزی ناول Sultana's Dream میں خواتین کی مملکت (لیڈی لینڈ) بسا کر خواتین کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے کچھ اس طرح جوڑ دیا کہ سائنس میں ان کی برتری حاصل ہونے کے امکانات واضح ہو گئے۔ بنگلہ دیش کی مصنفہ روشن جہاں رقمطراز ہیں:

اس حوالے سے رقیہ صرف عورتوں کی تعلیم کی سادہ سی بات نہیں کر رہی تھیں بلکہ ایسی تعلیم کی بات کر رہی تھیں جو عورتوں کو سائنس کے میدان میں برتری دلائے۔ [2]

گو کہ یہ ناول انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا اس لیے ممکن ہے کہ اردو ادب کی زنبیل میں اس کے لیے کوئی گوشہ نہ ہو لیکن اس ناول کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ جب بھی مسلم معاشرے کی ناول نگار خواتین کی بات ہوگی، Sultana's Dream کی بجائے سلطانہ کا خواب کا ذکر ہونا لازمی ہے۔

سید احمد دہلوی نے خواتین کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کی غرض سے 1881 میں دہلی سے اخبار النسا جاری کیا۔ ان کے بعد بہت دقتوں کے ساتھ شیخ عبداللہ نے رسالہ خاتون، مولوی ممتاز علی نے رسالہ تہذیب النسواں، راشد الخیری نے رسالہ عصمت جاری کیے۔ ان رسائل نے بھی خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی اصلاح کے لیے ایک ایسی خوش گوار فضا تیار کی جس کی بدولت خواتین کا علمی و ادبی کارواں بنتا چلا گیا اور ناول نگاروں کے علاوہ خواتین مضمون نگار، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار اور شاعرات نے اپنے تخلیقی کارناموں کی بدولت اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان بنیادی تعلیم یافتہ اور ادب نواز خواتین کے بعد کئی اور نظم و نثر نگار خواتین کی شمولیت سے یہ کارواں آگے بڑھتا رہا اور اردو ادب کے سرمایے میں بھرپور اضافہ کرتا رہا۔ مذکورہ بالا مصلحین قوم کے علاوہ دیگر مصلحین نے بھی خواتین کی تعلیم و تربیت کی غرض سے رسالے جاری کیے جن میں بہت سی خواتین نے مضامین شائع کر کے اپنی قابلیت کے نمونے پیش کیے۔ اس ضمن میں مولوی ممتاز علی کی اہلیہ محمدی بیگم، عباسی بیگم، امت الکریم، امت الوحی، نذر سجاد حیدر، خجستہ سہروردی، خاتون اکرم، آمنہ نازلی، خواجہ بانو، اے آر خاتون کے علاوہ اور اہم نام بھی ہیں جنھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے معاشرے کی تربیت کا بیڑہ اٹھایا اور بہترین مضامین سے اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا جن میں محمدی بیگم، صغرا ہمایوں مرزا، وحیدہ یعقوب، آبرو بیگم، بیگم شیخ عبداللہ وغیرہ کو اولیت حاصل ہے۔ عباسی بیگم (مجموعہ مضامین :گل صحرا)، نذر سجاد حیدر، خجستہ سہروردی، امت الکریم (تعلیم کے متعلق)، امت الوحی (قوموں کی ترقی میں عورتوں کا حصہ)، عطیہ فیضی (مسلمانوں کو ایک پیغام)، زہرا فیضی (صحت بڑی نعمت ہے) کے بعد نفیس دلہن (نفس وفا)، ظفر جہاں بیگم (قوم کسے کہتے ہیں)، بیگم ڈاکٹر عبدالغفور (آمیزش غذا کا اثر صحت پر)، عظمت النسا بیگم (دنیا کو لوگ بری جگہ کیوں کہتے ہیں)، حجاب امتیاز علی (ابا جان کی گھڑی)، خاتون اکرم (تغیراتِ زندگی)، آمنہ نازلی، راج کماری جھنگن، اور لیلیٰ خواجہ بانو قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد 1936 تک مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے والی خواتین میں اے آر خاتون (خواتین کے محاورے)، صالحہ عابد حسین (تحریکِ آزادی میں عورتوں کا حصہ) کے علاوہ کئی اہم نام ملتے ہیں۔ تمام مضامین میں لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کے علاوہ معاشرے کے کچھ ایسے مسائل پیش کیے گئے تھے جن کا حل نکالنا ضروری تھا۔ بقول پروفیسر صغرا مہدی:

خواتین نے تقریباً سو سال پہلے مضمون نگاری کی ابتدا کی اور اس کا سہرا اس زمانے کے زنانہ رسائل کے سر ہے۔ مضمون نگاری کا مقصد ایک تو اس میدان میں تربیت اور دوسرے ان کی اصلاح تھی۔ شروع میں مضامین کے موضوعات ایک مذہبی نوعیت کے ہوتے تھے یا پھر ان کا موضوع خانہ داری، آرائش، حفظان صحت وغیرہ ہوتا تھا۔ [3]

خواتین کی افسانہ نگاری کا آغاز 1918 سے قبل ہو چکا تھا۔ یہ افسانے رسالہ تہذیب النسواں اور عصمت میں شائع ہوتے تھے۔ ان افسانہ نگاروں میں سے کسی کسی نے ایک دو افسانوں پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ افسانے اردو مختصر افسانے کے بہترین افسانوں میں شامل ہیں۔ پروفیسر صغرا مہدی کی یادداشت کے مطابق رسالہ عصمت کے ایک پرچے میں ایک افسانہ 'میں اپنے قلندر کے پاؤں پہچانتی ہوں' کے نام سے شائع ہوا تھا اور رسالہ تہذیب نسواں میں شائع ہونے والے افسانے عجلتِ بے جا، ایفائے وعدہ، مشقِ ستم، تیسری تاریخ کا چاند، سالگرہ، مرتا کیا نہ کرتا کے نام سے شائع ہوئے۔ ان افسانوں کے تخلیق کاروں کے نام پردۂ خفا میں ہونے کے باوجود ان کی اہمیت کا اندازہ پروفیسر صغرا مہدی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ:

حالانکہ ان میں سے بعض لکھنے والیوں کے نام تک یاد نہیں مگر اتنی مدت کے بعد ان افسانوں کا یاد رہنا افسانہ کی حیثیت سے ان کی کامیابی پر دلالت کرتا ہے۔ [4]

جب کہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تحقیق کے پیشِ نظر اولین افسانہ نگار خواتین میں محمدی بیگم اور صغرا ہمایوں مرزا کے نام سرفہرست ہیں جنھوں نے طویل افسانے لکھے جو طوالت کی بنا پر ناول کے زمرے میں شمار کیے گئے۔

شاعری میں بھی خواتین نے اپنی شناخت قائم کی۔ 1857 سے پہلے لطف النسا امتیاز اور مہ لقا بائی چندا کے علاوہ کئی مایہ ناز شاعرات گزری ہیں لیکن 1857 کے بعد محمدی بیگم، عباسی بیگم، صغرا ہمایوں مرزا، سکندر جہاں بیگم وغیرہ نہایت اہم نام ہیں۔ ان تمام شاعرات کے بعد رابعہ پنہاں (اشکِ خونین)، زاہدہ خاتون شیروانیہ (آئینۂ حرم) نوشابہ خاتون (موجِ تخیل)، کنیز فاطمہ حیا، نجمہ تصدق اردو ادب میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اگرچہ ان خواتین نے نہایت سلیقے سے اپنی شاعری میں عشق و محبت اور فراق و ہجر کی عکاسی کی ہے، تاہم ان میں چند شاعرات نے ان دیگر موضوعات کو بھی شاعری کا حصہ بنایا جو سرمایہ داری، معاشرے کی چھوٹی بڑی خامیاں اور جبر و ظلم کی عکاسی کرتے تھے۔ بلقیس فاطمہ بیکس اپنی ایک نظم 'شکوۂ خواتین مشرق' میں کہتی ہیں ؎

وفا آشنا دل ہمارا جو پایا
ہمیں خوب دل بھر کے تم نے ستایا
خدا کو تمھارا وتیرہ نہ بھایا
سروں پر تمھاری فلاکت کو آیا
قہر بن کے تہذیب مغرب کا سایہ

عباسی بیگم کا اپنا ایک الگ انداز رہا ہے۔ کہتی ہیں ؎

خودی سے باز آ نہ خوار ہو، خدا کے بندے خدا خدا کر
خدا کا رستہ ہے صاف سیدھا، ادب سے چل سر جھکا جھکا کر
کہاں وہ علم و ہنر کے بانی، کدھر تغلق، کدھر کیانی
ہوئے ہیں زیر زمیں وہ پنہاں، نشان ہستی مٹا مٹا کر

ایک اہم نام زاہدہ خاتون شیروانیہ کا ہے جو ز۔خ۔ش کے نام سے لکھتی تھیں۔ بقول قرۃ العین حیدر زاہدہ خاتون شیروانیہ اپنے عہد کی عالمی سیاست کے تعلق سے کئی بلند پایہ نظموں کے لیے مشہور رہی ہیں اور اپنے انتقال (1922) سے قبل انھوں نے درج ذیل غزل کہی تھی ؎

کارخانے میں جو بارود کے، بم آ کے پھٹا
جل گیا پیکر بے جرم و خطائے مزدور
غلہ ڈھونے سے پسینے میں نہائے سو بار
جب ہوا اک پارہ نان روزہ کشائے مزدور [6]

خواتین کے اس ترقی یافتہ دور کے بعد وقت نے پھر ہلکی سی کروٹ لی اور اس بات کا احساس دلایا کہ ہندوستان اور مسلم معاشرے کی ابھی مکمل ترقی نہیں ہو پائی ہے۔ بدلتے حالات اور انتشار نے معاشرے کو دوبارہ

تہہ و بالا کرنے کی کوشش کی اور ہندوستانی سماج کو ایسے زخم دیے جو ناسور کی شکل اختیار کرنے لگے۔ان حالات نے عورتوں کو دوبارہ پیچھے کی طرف ڈھکیلنا شروع کر دیا اور وہ ایک بار پھر غلط رسم و رواج کی پابند ہوتی گئیں۔ان تمام ناسوروں کا مداوا ضروری تھا۔ترقی پسند تحریک نے ان ناسوروں کی طرف مصنفین اور شعرا کو متوجہ کیا اور منشی پریم چند کے مطابق حسن کے معیار کو بدلنے کی کوشش شروع کی گئی اور

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

کے احساس سے قدم اٹھائے گئے۔ایک بار پھر معاشرے کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا جو تصویر کائنات میں رنگ بھرنے والے وجود زن پر کئی طرح کے بدنما دھبوں کی مانند نظر آنے لگے۔ایک طرف ساحر نے مردوں کے ظالمانہ رویے پر طنز کیا۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو
مردوں نے اسے بازار دیا

اور دوسری طرف مجاز نے اپنے دائروں میں سمٹی ہوئی خواتین کو ان کے وجود کی اہمیت کا احساس دلایا کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

خواتین نے بھی آنچل کو پرچم بنانے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے اپنے ناولوں،افسانوں اور شاعری کے موضوعات میں تبدیلی کی اور نئے انداز سے اپنے وجود کو منوانے کی ٹھانی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواتین نے اردو ادب کے سرمایے میں اضافے اور اپنی شناخت بنانے کے لیے لکھا؟ یا ان کے قلم اور تحریروں نے ان کی شناخت قائم کی؟ بات خواتین اور ادب کے تعلق سے ہو رہی ہے کہ اردو ادب میں خواتین کا کیا حصہ ہے یا ادب کو خواتین نے کیا دیا؟اس ضمن میں پہلے یہ دیکھا جائے کہ ادب کیا ہے؟ یا ادب سے کیا مراد ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ ادب زندگی اور معاشرے کا ترجمان ہی نہیں بلکہ اس کا نقاد بھی ہے۔یہ زندگی کے وسیع ترین مسائل کو گاہے بہ گاہے پیش کرتے ہوئے ان کے حل تلاش کرنے میں مدد کرتا ہے۔اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

انسان کی زندگی کا ہر پہلو ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔محلوں سے جھونپڑوں تک، بازاروں سے دفتروں تک،غرض زندگی کا ہر پہلو ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ادب افراد اور قوموں کے تجربات کا نچوڑ ہے۔تجربات دراصل مردہ واقعات ہوتے ہیں جو دھبوں کی طرح انسان کے ذہن میں پڑے رہتے ہیں۔ادب ان کو زندگی عطا کرتا ہے۔[7]

زندگی کی اسی تنقید یعنی ادب میں خواتین نے بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنی تخلیقات کے ذریعے منفرد انداز سے خواتین کے مسائل، ان کی زندگی کے تاریک اور روشن پہلو، نفسیاتی مسائل، معاشرے میں ان کے حقوق، غرض کہ زندگی کے ہر پہلو کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔

1936 کے بعد خواتین افسانہ نگاروں نے معاشرے کے تکلیف دہ پہلوؤں، سماج میں عورت کی کم حیثیتی، جہالت، بے جوڑ شادیاں، گھر پر انتظار کی تاریکی، طوائفوں کے کوٹھوں پر روشنی، بانجھ پن سے ہونے والے مسائل، بزرگوں سے بے اعتنائی اور لاپرواہی، بچوں کے مسائل، بھوک، غربت... غرض ہر مسئلے کو اپنے افسانے اور ناولوں کا موضوع بنایا۔اس ضمن میں ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، صالحہ عابد حسین، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، صدیقہ سیوہاروی وغیرہ صف اول میں نظر آتی ہیں۔ڈاکٹر رشید جہاں نے اپنے افسانے افطاری میں غربت کی تصویر کشی نسیمہ اور اس کے بیٹے اسلم کی گفتگو کے ذریعے اس طرح کی ہے:

ماں دوزخ کیا ہوتی ہے؟

وہ کہتی ہے... دوزخ! دوزخ وہ تمھارے سامنے ہی تو ہے۔

کہاں؟... اسلم نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا۔

وہ نیچے جہاں اندھا فقیر کھڑا ہے، جہاں وہ جلاہے رہتے ہیں اور جہاں وہ رنگریز رہتا ہے اور لوہار بھی۔

دادی اماں تو کہتی ہیں دوزخ میں آگ ہوتی ہے۔[8]

پھر وہ بتاتی ہے کہ دوزخ کی آگ دراصل چولھے کی آگ جیسی نہیں ہوتی بلکہ بھوک کی آگ ہوتی ہے۔

یہاں سابق پرنسپل مسز رشیدہ قاضی کے انشائیے کا حوالہ دینا بے محل نہیں ہوگا:

پیٹ دنیا کی عظیم ترین قربان گاہ ہے۔پیٹ کی خاطر جوانیاں نیلام چڑھتی ہیں، عصمتیں قربان ہوتی ہیں اور مامتا بنام ہوتی ہے۔خودداری ذبح ہوتی ہے اور غیرت و حمیت کا لاشہ اٹھتا ہے۔پیٹ نہ ہوتا تو چڑیا چڑی مار کے جال میں نہ پھنستی اور پیٹ نہ ہوتا تو چڑی مار بھی اپنا جال نہ پھیلاتا۔بڑے بڑے انقلابات کی تہہ میں پیٹ ہی کارفرما رہا ہے۔اطالیہ کے شہروں میں پیٹ نے آگ لگائی۔فرانسیسی انقلاب پیٹ نے برپا کیا۔روس میں تخت شاہی کو الٹنے کا ذمہ دار بھی پیٹ ہی ہے۔[9]

موجودہ ہندوستانی معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ اولاد اپنے والدین کو وقت دینا پسند نہیں کرتی اور بڑھاپے میں ان کو اپنی ذمہ داری اور فرض نہیں سمجھتی بلکہ بوجھ سمجھ کر ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ المیہ پہلے مغربی معاشرے کا غماز تھا جس کی آہٹ کے اندیشے کو خواتین افسانہ نگاروں نے محسوس کرتے ہوئے اپنے افسانوں کے ذریعے ہندستانی سماج کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔اس ضمن میں بھی کئی نام مل سکتے ہیں لیکن یہاں صالحہ عابد حسین (بیکار سامان) اور بانو سرتاج (تین بوڑھے) کے نام کافی ہیں۔عصمت چغتائی کے بعد غالباً سب سے معتوب افسانہ نگار واجدہ تبسم رہی ہیں جنھوں نے معاشرے کی گھٹن اور تعفن کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا محور بنایا۔بقول حقانی القاسمی:

''واجدہ تبسم نے مجبور اور مظلوم عورتوں کے لیے مقدمہ لڑا اور اس لیے مرد سماج کی خود ساختہ عدالتوں میں وہ مجرم اور معتوب قرار پائیں کہ عورت صرف اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہے، بغاوت کے لیے نہیں... واجدہ نے ان ہی سماجی حقیقتوں کو اپنے فکشن کا محور و مرکز بنایا جو معاشرے کے لیے ناسور بنتی جا رہی تھیں۔''[10]

مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ فسادات سے متاثر سماج کی تصویر کشی بھی ناولوں اور افسانوں میں اس خوبصورتی سے کی گئی کہ قاری کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ جائے اور اس کا ذہن سوچنے پر مجبور ہو جائے۔فسادات کے حوالے سے عصمت چغتائی کا افسانہ 'جڑیں'، رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ 'نمک' اور صالحہ عابد حسین کا افسانہ 'نراس میں آس' اہم افسانے ہیں۔ان کے بعد کی افسانہ اور ناول نگار خواتین کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے چند نام قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، صغرا مہدی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، زاہدہ حنا، آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظور الامین وغیرہ کے بعد ناموں کی طویل فہرست میں بانو سرتاج، شمیم نکہت، ذکیہ مشہدی، لالی چودھری، صادقہ نواب سحر، غزال ضیغم، قمر جمالی، تسنیم کوثر، نگار عظیم، ثروت خان، اندرا شبنم، طاہرہ اور نسرین رمضان وغیرہ کے نام فوری طور پر لیے جاتے ہیں۔

اردو شاعری میں جن شاعرات نے اپنی شناخت قائم کی ان میں ادا جعفری، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس، کشور ناہید، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، نسرین حیات، عنبرین حسیب عنبر، شہناز نبی اور دیگر شاعرات شامل ہیں۔انھوں نے جہاں اپنی شاعری میں معاشرے میں رائج غلط رسم و رواج میں دبی پسی خاتون کی تڑپ اور بے کسی و کسمپرسی کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا وہیں عالمی مسئلے کے نقوش بھی اپنی تخلیقات پر اس طرح ثبت کیے کہ ان کی شاعری اس مسئلے کے خلاف اٹھتی ہوئی آواز ہی نہیں بلکہ ایک شاہکار بن گئی۔ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی

شاعری محض تانیثیت کے دائرے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے عہد کے انسانیت سوز عالمی واقعات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

خواتین نے اپنی تخلیقات کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ کبھی سنجیدہ تو کبھی مزاحیہ۔ طنز و مزاح کے ذریعے اردو ادب کو رونق بخشنے والی خواتین میں پہلا نام مرزا فرحت اللہ بیگ کی بھانجی آصف جہاں کا ہے جن کا مجموعہ گل خنداں کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بعد کئی نام ملتے ہیں جن میں عصمت چغتائی کے علاوہ تین قابل ذکر نام سلمیٰ صدیقی (سکندر نامے، نور جہاں کا لوٹا)، سرور جمال (مشق ستم، مفت کے مشورے) اور شفیقہ فرحت (رانگ نمبر، گول مال) ہیں۔

اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار یوسف ناظم رسالہ 'شگوفہ' حیدرآباد کے ہندوستانی مزاح نمبر ص 47 پر رقمطراز ہیں کہ:

"(ظرافت) معاشرے کے عمومی مسائل سے الجھتی اور انھیں پاک و صاف کرتی ہے۔ معاشرت کے طریقوں، رسوم و رواج اور روایتی بندشوں کے مراحل سے آگے نکل کر سیاسی و ملکی معاملات کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔"

درج بالا قول کی روشنی میں اگر معاشرے کی جانب نظر اٹھائیں تو لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کے رواج کے خاتمے کے بعد ان کے بازاروں میں بکنے کے علاوہ شادی بیاہ کے مقدس رشتے کے نام پر لڑکیوں کے بکنے کا رواج شروع ہوا۔ اس موضوع پر (سابق پرنسپل) مسز رشیدہ قاضی کا انشائیہ 'قصہ قاضی کا' نہایت معنی خیز ہے۔ ہندوستان میں قومی یک جہتی کے فروغ کی طرف اشارہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ قاری کے لبوں پر مسکراہٹ مچل اٹھتی ہے۔ اپنے انشائیے 'کوّے' میں لکھتی ہیں:

ہمارا دیش ہر طرح مالا مال ہے، بس کمی ہے تو قومی یکجہتی کی۔ حکومت وقت قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے جان توڑ کوشش کر رہی ہے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ سارا فتور قومی پرندے کے انتخاب کا ہے۔ مور میں آخر دھرا کیا ہے؟ صرف خوشنما پر۔ پروں کا مصرف کیا؟ مور چھل مزاروں اور مندروں کے سوا کہیں کام نہیں آتے۔ مانگ محدود، فیض محدود، پھر کیوں نہ انھیں متروک قرار دیا جائے؟ مور کی جگہ کوّے کو قومی پرندہ بنانا چاہیے کہ ایکتا، اتحاد اور اتفاق کا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ کسی ایک کوّے کی جان پر بن جائے، تو ساری برادری بطور احتجاج کائیں کائیں کرکے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے۔

اسی طرح ڈراما نگاری، صحافت (طیبہ بیگم، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ثروت جہاں)، ترجمہ نگاری (صابرہ زیدی)، سفرنامے (عطیہ بیگم فیضی، لالی چودھری)، خودنوشت نگاری (صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی، ادا جعفری) وغیرہ میں بھی خواتین نے اپنی تحریروں سے اردو ادب کے سرمایے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور آج بھی کر رہی ہیں۔ ان خواتین کے ناموں کی طویل فہرست کے چند اہم نام پروفیسر فاطمہ بیگم، ڈاکٹر آمنہ تحسین، ڈاکٹر اقبال النسا، ڈاکٹر گل رخ ذہین، ام ہانی اشرف، نگار سلطانہ، ڈاکٹر مسرت جہاں، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون ہیں۔ ڈراما نگار خواتین (عابدہ احمد، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی) میں ایک اہم نام استاذ الاساتذہ پروفیسر نور العین علی کا ہے جنھوں نے اپنے ڈراموں میں معاشرے کے مسائل کو نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر نور العین علی کو ڈرامے 'کینسر' پر انعام سے نوازا کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں ایک اور بات کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ عابدہ احمد نے ایک ڈراما گروپ 'ہم سب' کے نام سے تشکیل دیا تھا۔

وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی اردو ادب کی تاریخ میں خواتین کی شمولیت کا ذکر یہیں ختم نہیں ہوتا ہے۔ بچے معاشرے کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ادب اطفال کے تحت ان کی ذہن سازی کی جاتی ہے۔ لوک گیت کسی بھی ملک کی تہذیب و تمدن اور سیاست کے عکاس ہوتے ہیں۔ لوک گیتوں کے ذریعے اردو میں خواتین (ڈاکٹر بسم اللہ بیگم، ڈاکٹر میمونہ دلوی) نے ہندوستان کے تہذیب و تمدن اور سیاست کو محفوظ کر کے اردو ادب میں قابل قدر اضافے کیے۔ ادب اطفال (محمدی بیگم، خواجہ لیلیٰ بانو، سلطانہ آصف فیضی، عصمت چغتائی، نور جہاں نور)، تحقیق و تنقید (پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر زینت ساجدہ، پروفیسر صغرا مہدی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر میمونہ دلوی، ڈاکٹر زہرہ موڈک، ڈاکٹر شرف النہار، رفیعہ سلیم، ڈاکٹر ظل ہما)، بچوں کی تدریس (مسز ذکیہ خطیب، مسز فاطمہ انیس) جیسی اردو ادب کی مختلف جہتوں میں بھی صنف نازک نے اپنے جوہر دکھائے اور اس طرح ادبی کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی تحریروں کے ذریعے روشن کرنے کی کوشش کی۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، شیخ عبداللہ، حالی، عبدالحلیم شرر وغیرہ مصلحین نے قوم کو اندھیرے غار سے نکالنے کے لیے کئی طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کیا، اپنی تحریروں کی مدد سے خواتین میں سر اٹھا کر جینے کی خواہش پیدا کی، انھیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے راستے دکھائے۔ خواتین انھیں راستوں پر نہ صرف قدم بڑھاتی جا رہی ہیں بلکہ اپنی شناخت قائم کر کے اردو ادب میں قابل قدر اضافے کرتی جا رہی ہیں۔

کسی بھی زبان کا رشتہ تاریخ سے بھی بنتا ہے اور سیاسیات سے بھی۔ معاشیات سے بھی جڑتا ہے اور سائنس سے بھی، نفسیات سے بھی پہنچتا ہے اور سماجیات رمعاشرت سے بھی۔ خواتین نے اپنے زور قلم سے اردو ادب کا حق پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کی اور آج بھی اس راہ پر پیہم رواں ہیں۔ مختصراً یہ کہ خواتین نے محض عشقیہ اور رومانی ناول، افسانے اور شاعری کو اپنا موضوع سخن نہیں بنایا بلکہ انھوں نے زندگی اور معاشرے کو دیکھا، سمجھا، غور کیا اور پھر قرطاس پر اتارا۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کی خواتین ہی کے مسائل نہیں ملتے بلکہ معاشرے کے اہم ستون یعنی مردوں کی اصلاح کا پہلو بھی چھپا ہوتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے بصیرت کی ضرورت ہے کیونکہ اچھا اور صحت مند معاشرہ مرد و زن... دونوں سے بنتا ہے۔

(مقالے کی طوالت کی کے خوف سے کئی اہم ناموں کا ذکر نہیں ہو سکا)

حواشی:

1 رشید النسا: اصلاح النسا: اشاعت اول 1894، ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 2007، ص 162

2 رشید النسا: اصلاح النسا: رشندری، رشیدہ اور رقیہ کا خواب: زاہدہ حنا: اشاعت اول 1894، ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 2007، ص 231

3 اردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی: دہلی کی مضمون نگار خواتین: پبلشر اردو اکادمی، دہلی: سن اشاعت 2006، ص 95

4 اردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی: دہلی کی افسانہ نگار خواتین: پبلشر اردو اکادمی، دہلی: سن اشاعت 2006، ص 161

5 ششماہی فن اور شخصیت، بمبئی: غزل نمبر: مدیر: صابر دت: بیاد تاگل بر افشانیم مرتبہ قرۃ العین حیدر: مارچ 1978، ص 470

6 اطہر پرویز: ادب کا مطالعہ: اسرار کریمی پریس، الہ آباد: ستمبر 71، ص 37

7 اطہر پرویز: ادب کا مطالعہ: اسرار کریمی پریس، الہ آباد: ستمبر 71، ص 41

8 پرنسپل رشیدہ قاضی: پلیٹ سے پیٹ تک: پرواز: ماڈرن پبلشنگ ہاؤز، نئی دہلی 1988، ص 68

9 قلم کے گناہ: حقانی القاسمی: واجدہ تبسم: افکار و اذکار مرتبہ مسرور صغرا: کلاسک آرٹ پریس 2014، ص 48

10 پرنسپل رشیدہ قاضی: کوّے: پرواز: ماڈرن پبلشنگ ہاؤز، نئی دہلی 1988، ص 91-92

■

Dr. Muizza (Kazi) Dalvi
Former Head & Associate Prof., Dept of Urdu
University of Mumbai, Kalina
Mumbai - 400098 (MS)
Mob.:9892808007

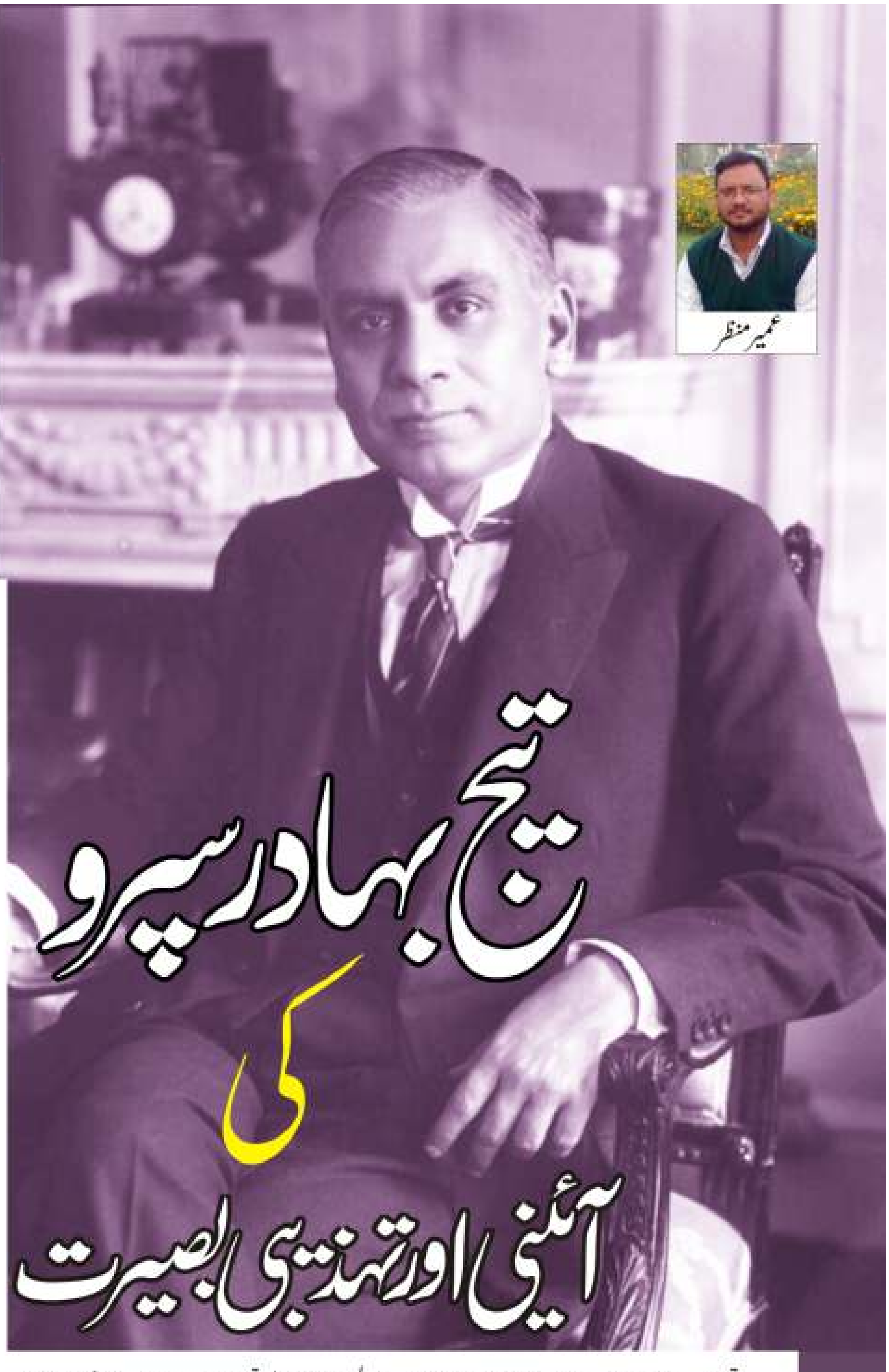

تیج بہادر سپرو کی آئینی اور تہذیبی بصیرت

عمیر منظر

سپرو جیسی شخصیات کا سب سے نمایاں امتیاز یہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ہندستان اور اس کی رنگار رنگ تہذیب و ثقافت کو اپنے پیش نظر رکھا۔ اپنے افکار و نظریات اور عملی جدوجہد سے ہندستان کی اُس تہذیبی اور ثقافتی رنگا رنگی کو مزید نمایاں کیا اور اسے ایک تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے تعبیر کیا۔

تیج بہادر سپرو (پ: 8 دسمبر 1875، و: 20 جنوری 1949) کا شمار ان ممتاز ہندستانی شخصیات میں کیا جاتا ہے، جو نہ صرف ہندستانی تہذیب کا ایک روشن چہرہ تھے، بلکہ انھوں نے اپنے افکار وخیالات سے برطانوی عہد کے ہندستان میں بہت سی قانونی اور آئینی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ انھوں نے ہندستانی تہذیب وثقافت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے روشن پہلوؤں کو اپنی زندگی میں برتا ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی اسی کے مبلغ وشارح بھی رہے۔ اردو کو صرف وہ ایک زبان نہیں بلکہ اسے ہندستانی تہذیب کا اہم جز سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے اسی لیے تیج بہادر سپرو کے بارے میں لکھا تھا کہ:

''اگر کسی کو ہندستانی تہذیب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ سر تیج بہادر سپرو کو دیکھے۔''

(ہماری قومی زبان، تیج بہادر سپرو، ص ۱۰، انجمن ترقی اردو ہند 1941)

تیج بہادر سپرو کے انتقال پر تقریباً سات دہائیاں گزرنے والی ہیں، لیکن ان کی تحریریں اور وہ راستے جو انھوں نے زندگی بھر اختیار کیے آج بھی روشن اور قابل تقلید ہیں۔

سپرو جیسی شخصیات کا سب سے نمایاں امتیاز یہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ہندستان اور اس کی رنگار رنگ تہذیب وثقافت کو اپنے پیش نظر رکھا۔ اپنے افکار ونظریات اور عملی جدوجہد سے ہندستان کی اُس تہذیبی اور ثقافتی رنگا رنگی کو مزید نمایاں کیا اور اسے ایک تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے تعبیر کیا۔ اس کام کو انھوں نے پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ کیا۔ برطانوی ہندستان میں وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے، مگر ہر جگہ ہندستان اور ہندستانیت کے ترجمان بنے رہے۔ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کے علمی وسیاسی کارناموں کو اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ جہاں ایک طرف وہ اردو کے بے لوث خادم اور اس تہذیب کے شارح وترجمان رہے، وہیں دیگر زبانوں کی پرزور وکالت بھی کرتے رہے۔ انگریزیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے، مگر علمی سطح پر انگریزی زبان کے قدر دان اور اس کی علمی حیثیت کو بلند تصور کرتے رہے۔ ان کی سرگرم زندگی سے اس کی مختلف مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

تیج بہادر سپرو 8 دسمبر 1875 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ سپرو کی تعلیم وتربیت ان کے دادا پنڈت رادھا کشن کے زیر سایہ ہوئی، جو دلی کالج میں استاد تھے اور آگے چل کر اتر پردیش میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بجنور میں تعیناتی کے دوران ہی سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ایس کے بوس کے بقول 'یہیں سے اس گھرانے نے اسلامی تہذیب کو قریب سے دیکھا۔' واضح رہے کہ سپرو ایک کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو وہاں سے ہجرت کر کے علی گڑھ میں آباد ہو گیا تھا۔ ایس کے بوس نے لکھا ہے کہ:

''سپرو کے دادا سرسید احمد خاں کے حبیب لبیب تھے۔ 1857 کے انقلاب کے دوران وہ سرسید احمد خاں کے ساتھ بجنور میں تعینات تھے۔ علی گڑھ میں اپنے دادا کے ساتھ سپرو اکثر سرسید کے یہاں آتے جاتے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات بہت سے مسلم قائدین اور دانشوروں سے ہوئی اور یہیں سے سپرو صاحب فارسی اور اردو ادب کی

طرف متوجہ ہوئے۔ سپرو سر سید احمد خاں کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے بیٹے محمود کے مداحین میں تھے۔ جسٹس محمود الٰہ آباد ہائی کورٹ کے پہلے ہندستانی جج جس وقت بنائے گئے اس وقت سپرو وہاں پر وکالت کی پریکٹس کر رہے تھے۔ اور یہیں سے وہ ایک دوسرے سے مزید قریب ہوئے۔ ان رابطوں کے توسط سے اندر زندگی بھر کے لیے سیکولر اقدار اور تہذیبی رواداری کا مزاج بن گیا۔" (ص 7)

دوران تعلیم آگرہ میں آگرہ کالج کے پروفیسر اینڈریوز سے قربت ہوئی، جنھوں نے سپرو کے لبرل خیالات کو فروغ دینے میں تقویت بخشی۔ 1891 میں آگرہ میں تعلیم کے دوران پنڈت ایودھیا ناتھ نے اردو میں تقریر کی تھی، جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ 1911 میں پنڈت بشن نارائن در کانگریس کے صدر بنے، ان سے سپرو کی ذہنی ہم آہنگی تھی اور جن کے اثرات ان کی شخصیت اور خیالات پر مرتسم ہوئے۔ اس کے علاوہ جیمس مل، اسپینسر اور ہکسلے جیسے بڑے مغربی فلاسفر کے خیالات سے سپرو کافی متاثر ہوئے۔ اپنے عہد کی اہم شخصیات اور ان کے افکار و خیالات سے ہم آہنگی اور اشتراک نے سپرو کو وہ نظر عطا کی جس نے ہندستان کی سرگرم سیاسی اور تہذیبی زندگی میں ان مٹ نقوش قائم کیے۔ ایک مدت بعد آج جب ہم ان کے افکار و خیال پر غور کرتے ہیں تو باور کرنا پڑتا ہے کہ ایسے روشن ضمیر اور کشادہ ظرف انسان ہی کسی تہذیبی تنوع کو برقرار رکھنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سپرو نے ایک سرگرم سیاسی زندگی گزاری اور یہ زمانہ برطانوی عہد کے اس ہندستان کا تھا جہاں لب کشائی آسان نہ تھی مگر سپرو نے اس مہم کو اپنی آئینی مہارت اور تہذیبی لگن سے اس کامیابی کے ساتھ سر کیا کہ برطانوی سامراج بھی منہ دیکھتا رہ جاتا۔ سیاسی اتھل پتھل کے زمانے میں سپرو کی فکری بالغ نظری نے خود کو متحدہ ہندستان کی تعمیر و ترقی کے ترجمان کے طور پر پیش کیا۔

سرتیج بہادر سپرو 1913 میں ریاست متحدہ کے ودھان پریشد میں ممبر کی حیثیت سے نامزد کیے گئے اور یہیں سے انھیں اپنی آئینی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے کچھ مشورے اور تجاویز پاس کرانے کی کوشش کی اور حکومت برطانیہ کی پالیسیوں پر جرأت و ہمت کے ساتھ بحث و تنقید کی۔ نامزد ممبر ہونے کے باوجود ودھان پریشد میں ان کی سرگرم گفتگو، تجاویز اور مشورے سے یہ خیال گزرتا تھا کہ یہ آزاد رکن ہیں۔ انھوں نے ودھان پریشد کے محدود اراکین (منتخب) کی تعداد بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ ایک بحث کے دوران انھوں نے کہا تھا کہ ودھان پریشد کا لبرل آئین، امنگوں اور خواہشوں کے شرمندۂ تعبیر ہوئے بغیر صرف گفتگو کی حد تک آزادی دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔

انھوں نے تعلیم یافتہ ہندستان کی بنیاد رکھنے کا کام برطانوی ہندستان کے عہد میں ہی کر دیا تھا اور 1913 کے بجٹ اجلاس میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ چھ ہزار مزید پرائمری اسکول قائم کیے جائیں اور تعلیم کے بجٹ کو ایک لاکھ تک کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا تھا پولس بجٹ میں کمی لائی جائے اور تعلیم کے بجٹ میں اس کا اضافی پیسہ لگایا جائے۔ سپرو نے اسی اجلاس میں تعلیم نسواں کے لیے الگ سے اسکول کے قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان تجاویز سے سپرو کی سنجیدہ فکر اور ملک کے لیے ان کے بے لوث جذبے کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دراصل سپرو کی نگاہ دوررس آئین و انتظام اور تعلیم و تہذیب، سب پر تھی۔ وہ ہندستان کی سماجی اور قومی زندگی پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور اسی لیے انھوں نے ودھان پریشد میں گرام پنچایتوں کو مضبوط کرانے اور ان کو چھوٹے چھوٹے معاملات کے تصفیے کے اختیارات دیے جانے سے متعلق تجویز کی پرزور حمایت کی تھی لیکن یہ اس وجہ سے ممکن نہ تھا کہ اس سے عام ہندستانیوں تک کچھ اختیارات منتقل ہو سکتے تھے، انگریز جس کے روادار نہ تھے۔ آزاد ہندستان میں بھی یہ بہت دنوں تک ممکن نہ ہو سکا لیکن 1993 میں 73 ویں آئینی ترمیمی بل (پنچایتی راج ایکٹ) کے ذریعے حکومت ہند نے سپرو کے اس خواب کی تکمیل کی۔

1915 میں سپرو نے 'انڈین لیجسلیٹیو کونسل' کی حلف لی اور بہت جلد وہ کونسل کے قدآور قائدین میں شمار کیے جانے لگے۔ یہاں انھوں نے ایک ایسے قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا جس سے آئندہ پندرہ برسوں میں سب کو مفت اور لازمی بنیادی تعلیم کا حق مل سکے۔ انگریزوں کے زمانۂ اقتدار میں یہ چیز تو ممکن نہ تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے پوری قوت اور قانونی دلائل کی روشنی میں اپنی رائے پیش کی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد عرصے تک یہ تجویز عمل آوری کے لیے منتظر رہی اور بالآخر 2003 میں 86 ویں آئینی ترمیمی بل کے ذریعے آرٹیکل 21-A کو شامل کر کے یہ حق ہندستانی بچوں کو دیا گیا۔ سروشکچھا ابھیان کے تحت مڈ ڈے میل کا جو پروگرام شروع کیا گیا ہے یہ سپرو کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ انھوں نے ایک تعلیم یافتہ ہندستان کا خواب دیکھا تھا اور اس کے لیے وہ جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا بھی اور آج اس سمت جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے انھی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کہا جا سکتا ہے۔

سپرو کی ان کوششوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں قانون و آئین کی جو فہم حاصل تھی اس کو انھوں نے ذاتی مفاد یا عہدہ و منصب کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ ملک سے محبت کرنے والے ایک عظیم دانشور کے طور پر ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو قربان کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ زمانہ ہندستان کی محکومی کا تھا۔ انگریز حکمرانوں سے بظاہر کسی خیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی مگر انھوں نے انتظام و انصرام کے لیے جو آئین وضع کیا تھا اس کو سامنے رکھ کر یہ مشورے نہ صرف بہت اہم کہے جا سکتے ہیں بلکہ آزاد ہندستان کے تناظر میں ان کی معنویت دوچند ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہم نے آزاد ہندستان کا آئین وضع کرنے میں اس فکر اور ذہنی رویے سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ ان کی آئینی بصیرت اور ہمت ہی تھی کہ انھوں نے لیجسلیٹیو کونسل میں پہلی بار فوج میں بھارتیوں کے لیے بالکل برابری کا درجہ، عہدہ اور مواقع کا مطالبہ کیا اور کہا کہ فوج میں جو مرتبے یوروپین کو حاصل ہیں وہی ہندستانی فوجیوں کو بھی ملنے چاہیے۔ یہ ہمارا خصوصی اور پیدائشی حق ہے، جس سے ہم دستبردار نہیں ہو سکتے۔ گاندھی جی کے ساتھ خلافت موومنٹ کا انھوں نے نہ صرف ساتھ دیا بلکہ اس کے توسط سے آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کی سرگرم شمولیت کو یقینی بنانے کی کوشش کی، جس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں تھی۔ اسی تناظر میں سپرو کے بنائے ہوئے آئین کو بھی دیکھنا چاہیے جو دراصل 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919' کے تنقیدی جائزے اور اصلاحات پر مبنی ہے۔ انگریز حکمرانوں نے ہندستان کے آئین کی داغ بیل 1919 میں ڈالی تھی اور اس میں دو باتیں خاص تھیں۔

الف: ریاستوں میں دوہری سرکار (Diarchy in Provinces) اور مرکز میں دوایوانی پارلیمنٹ (Bicameral Central Legislature)

ب: مرکزی سرکار کے بجٹ کی دو حصوں میں تقسیم (Votable, Non-Votable)

ج: ایک ہائی کمشنر جو لندن میں رہ کر ہندستان کی نمائندگی کرے گا۔

سپرو نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے سرکار اور آئین کے ڈھانچے میں تبدیلی کا مطالبہ کیا اور دوہری سرکار کی مخالفت کی۔ بجٹ میں Votable اور Non-Votable کی تقسیم کو غلط ٹھہرایا اور کہا کہ اراکین پارلیمان کو ووٹ کا حق پورے بجٹ پر ملنا چاہیے نہ کہ اس کے کسی ایک حصے پر۔ واضح رہے کہ برطانوی حکومت اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے Non-Votable بجٹ کو جاری رکھنا

چاہتی تھی، جو ظاہر ہے ہندستانیوں کے مفادات کے خلاف تھا۔ نہ دلیل، نہ اپیل، نہ وکیل جیسی صورت حال سے دوچار اور بے بس ہندستانیوں کے لیے رالٹ ایکٹ (Rowlett Act-1919) جیسے کالے قوانین کے درپردہ پولس راج کو فروغ دینا چاہتی تھی۔ جلیاں والا باغ کا حادثہ اسی Non-Votable بجٹ کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے پولس کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ پولیس کسی بھی سرکار کے سامنے جواب دہ نہیں تھی بلکہ براہ راست گورنر کے سامنے ہی وہ جواب دہ تھی۔ اس کے باوجود پورے بجٹ پر ووٹ کرنے کا اختیار ہندستانیوں کو انگریزوں کے جانے کے بعد ہی مل سکا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کی ان کمیوں کو اجاگر کرنے کے نتیجے میں ہی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 میں سپرو کے چند مطالبے کو شامل کرکے ہندستانیوں کو خوش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی اور اسی کے تحت دوہری سرکار کے انتظام کو ختم کیا گیا۔ اس تناظر میں سپرو کی آئینی بصیرت اور مہارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہندستان، سپرو کی فکر اور عملی جدوجہد کا کلیدی محور قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مختلف اسٹیج اور مواقع سے تعلیم، ذریعہ تعلیم اور اس کے دیگر عوامل پر بہت واضح اور دوٹوک انداز میں گفتگو کی۔ جہاں انھوں نے تعلیم پر بات کی وہیں انھوں نے یونیورسٹیوں کے کردار اور ان کی شناخت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی ہر یونیورسٹی اپنے وسائل وذرائع کا بہتر استعمال کرکے اپنی امتیازی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرے تاکہ کسی ایک مضمون کے حوالے سے وہ

تعلیم یافتہ ہندستان، سپرو کی فکر اور عملی جدوجہد کا کلیدی محور قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مختلف اسٹیج اور مواقع سے تعلیم، ذریعہ تعلیم اور اس کے دیگر عوامل پر بہت واضح اور دوٹوک انداز میں گفتگو کی۔

پہچانی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم ایسی ہو کہ اس کے بعد کسی پیشے سے منسلک ہوا جاسکے۔ ایسی تعلیم نہ ہو جو سرگرم سماجی اور معاشی زندگی سے الگ کردے۔ 30 نومبر 1935 کو پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ:

''بھارت پڑھے لکھے بھکاریوں کا ملک بن رہا ہے۔'' مغربی ممالک کے اپنے تجربوں کی روشنی میں کہا کہ ''تعلیم کو روزگار سے منسلک ہونا چاہیے تاکہ طلبا کو اعلی تعلیم کا فائدہ مل سکے''۔ ان کا خیال تھا کہ ''پیشہ ورانہ، صنعتی یا پھر ایسی کوئی اور تعلیم دی جانی چاہیے جس سے انھیں نوکری ملنے میں آسانی ہو''۔ ممکن ہے ان سطور سے کسی کو یہ اندیشہ ہو کہ تیج بہادر سپرو تعلیم کے ثقافتی مظہر کے مخالف تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ثقافتی رویوں اور مظاہر کے نہ صرف حامی تھے بلکہ اس کی جیتی جاگتی مثال تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے ذریعہ تعلیم کے بارے میں کہا:

ہمارے بچوں کی بہت بڑی تعداد کی تعلیم میں یہ ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے کہ انھیں ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور خصوصاً ایسے مضامین کی تعلیم جن کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اپنی زبان چھوڑ کر کسی اور زبان میں پڑھائے جائیں... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں انگریزی کا رواج بالکل ترک کردینا چاہیے بلکہ اگر قومیت کے بے جا فخر یا تنگ نظرانہ قومیت کی بدولت کبھی ایسا وقت آیا کہ ہمارے بچے انگریزی ادب کی روحانی مسرتوں اور بلند خیالی سے محروم کردیے گئے تو مجھ سے زیادہ شاید ہی کسی کو افسوس ہوگا کیونکہ انگریزی ادب کی بدولت ہمیں بہت سے نئے خیالات اور نئے معیار میسر آئے ہیں... بعض مضامین یقینی ایسے ہیں کہ ان کی تعلیم ابھی ایک خاصے عرصے تک انگریزی زبان ہی میں ہونی چاہیے، جب تک کہ ہماری زبان کی پہلی مہم بہت کچھ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ میرا احتجاج انگریزی زبان کے استعمال یا انگریزی زبان کے مطالعہ کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس غفلت کے خلاف ہے جس کی بدولت ہماری زبانیں پیچھے پڑ گئی ہیں۔''

(حوالہ سابق ص: 2,5,6)

سپرو کی یہ کشادہ فکر راتوں رات کسی فکری تبدیلی کے سبب نہیں تھی بلکہ یہ چیزیں ان کی تربیت اور پرورش کا حصہ تھیں۔ انھوں نے بہت سے ہندستانی رہ نماؤں اور دانشوروں کو قریب سے دیکھا اور استفادہ کیا تھا جو اپنی روشن خیالی اور فکری کشادگی کے سبب ہندستانی معاشرے کے لیے ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سپرو نے اس تربیت سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس پر تاعمر کاربند رہے۔

اردو زبان سے سپرو کا تعلق محض زبان کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی تنوع اور ہندستانی ثقافت کی بہتر نمائندگی کے سبب تھا۔ وہ اردو کو صرف ایک زبان تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک تہذیبی رویہ بھی قرار دیتے ہیں۔

سپرو کے بقول:

''اردو زبان ہندو مسلمانوں کا ایک ایسا مشترکہ و مقدس ترکہ ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔ اس لیے مسلمان اگر یہ دعوی کریں کہ یہ ان کی زبان ہے تو یہ دعوی ہرگز قابل قبول نہیں۔ یہ ایک مشترکہ ترکہ ہے جو صدیوں سے ہمارے حصے میں آیا ہے۔ یہ ہماری تہذیب کا خزانہ ہے۔ بحیثیت ہندو ہونے کے مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ میری مادری زبان اردو ہے۔'' (ایضاً ص 72)

اردو زبان سے سپرو کا تعلق محض زبان کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی تنوع اور ہندستانی ثقافت کی بہتر نمائندگی کے سبب تھا وہ اردو کو صرف ایک زبان تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک تہذیبی رویہ بھی قرار دیتے ہیں۔

یہی وہ تہذیبی اور ثقافتی رویے تھے جس نے انھیں مجبور کیا ہوگا کہ وہ انجمن ترقی اردو کی صدارت کو زینت بخشیں اور اس کثیر ثقافتی اور تہذیبی ملک کو مزید ثروت مند بنائیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی اس میں سپرو صاحب کے کارناموں اور اردو زبان اور تہذیب سے ان کی گہری اور سرگرم دلچسپی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکے گا۔

ہندستان دراصل وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی ایک نمایاں ترین مثال ہے اور اس ملک کی بنیاد اسی پر ہے۔ تیج بہادر سپرو کو یاد کرنے اور ان پر کچھ لکھنے کا مطلب ہی ہے کہ ہم ہندستان اور اس کے تہذیبی تشخص پر غور وفکر کررہے ہیں۔ ان کے زمانے میں بھی اس کی ضرورت تھی اور آج بھی۔ کیونکہ اس کے بغیر ممکن ہے کہ ہم سب کچھ ہوں مگر آدھے اور ادھورے۔ کسی شناخت اور ثقافتی مظہر کے بغیر۔ ایک لٹے پٹے اور بے سروسامان قافلے کی طرح، جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو

کتابیات

1 آدھونک بھارت کے نرماتا: تیج بہادر سپرو، ایس کے بوس، پبلی کیشن ڈویژن بھارت سرکار 1985

2 ہماری قومی زبان، تیج بہادر سپرو، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی 1941

■

Dr. Omair Manzar
504/122, Tagore Marg
Near Shabab Market
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.: 8004050865

تحقیق میں اخلاقیاتی ملحوظات

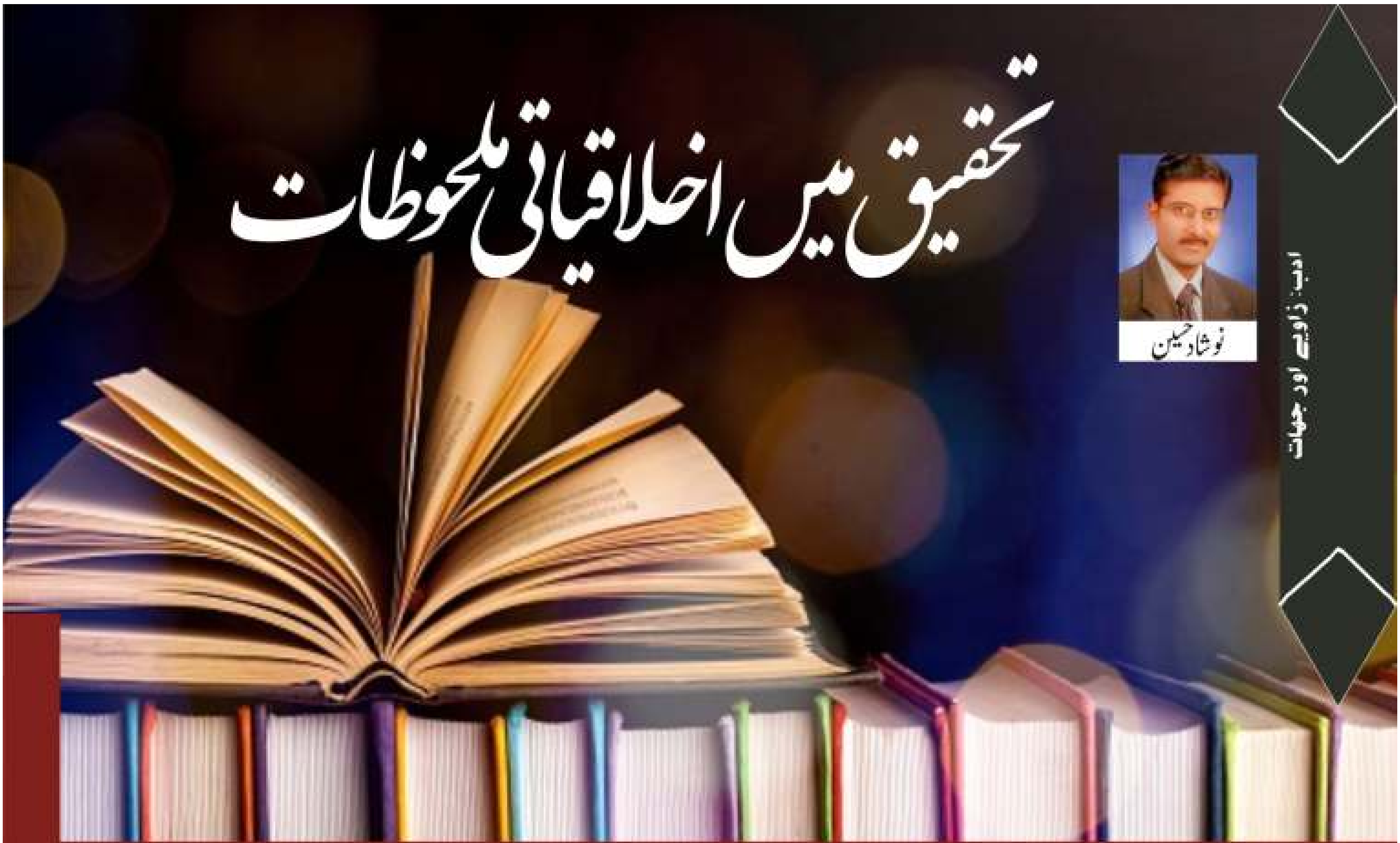

نوشاد حسین

'تحقیق میں اخلاقیات' ذہن میں آتے ہی اس سے وابستہ مسائل اور مدعے ہمارے تخیل میں آنے لگتے ہیں۔ جہاں تحقیق میں انسانوں (یا حیوانات) کی وابستگی ہوتی ہے وہاں لازمی طور پر ان سے وابستہ مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ سماج کے ایک باشعور فرد کی حیثیت سے نادانستہ طور پر بھی ہم اخلاقیات کا پامال ہونا گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ انسان کا یہ اخلاقی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کو ضرر پہنچائے بغیر اپنے مقاصد کا حصول کرے۔ تحقیقی عمل میں بھی محققین سے یہی امر مطلوب ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی محققین کے اخلاقی شش و پنج کا شکار ہونے کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ اکثر ہم اپنے پیشہ ورانہ معاملات اور امور کی انجام دہی کے دوران چند اخلاقی مخمصے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس کے سبب ہمارے امور کے معیار پر سوالیہ نشان لگنے کا خدشہ رہتا ہے۔ ان مدعوں اور مسائل سے بروقت نجات حاصل کرنے کے لیے مختلف قومی اور بین الاقوامی اداروں اور تنظیموں بشمول تعلیمی اداروں خصوصاً مالی امداد رساں اداروں نے اخلاقیات کے رہنما اصول (ضابطہ اخلاق) وضع کیے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں قومی کاؤنسل برائے تعلیم اساتذہ (NCTE) کے ذریعے تیار کردہ ''پیشہ ورانہ اخلاقیات کے ضوابط برائے اسکولی اساتذہ''، Indian Audit and Accounts Department (IAAD) کے اخلاقیات، برطانوی تنظیم برائے تعلیمی تحقیق (BERA)، متحدہ امریکہ کے قومی ادارے برائے صحت (NIH)، محکمہ خوراک و ادویات (FDA) کے ذریعے تیار کردہ متعلقہ شعبہ جات کے اخلاقیات، جامعات کے پروفیسر کی امریکی تنظیم (AAUP)، امریکی نفسیاتی تنظیم (APA) کے ذریعے تیار کردہ ماہر نفسیات کے لیے اخلاقیاتی اصول اور ضابطہ اخلاق، وغیرہ۔

'تحقیق میں اخلاقیات' کی تفہیم سے قبل اخلاقیات کا ادراک ضروری ہے۔ اخلاقیات سے مراد اصول و ضوابط کے نظام سے ہے جس پر کسی قوم یا سماج یا ملک کے باشندے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہ اصول و ضوابط تمام افراد، اداروں، ملک اور سماج کی فلاح و بہبود کے لیے ہوتے ہیں اور عمل کو سہل، منظم و نفع بخش بناتے ہیں۔ اخلاقیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ یہ اصول و ضوابط کا ایسا مجموعہ ہے جس کا تعلق شعبہ جات میں پیدا ہونے والے اخلاقی سوالات، مسائل اور ان کے حل سے ہوتا ہے۔ اخلاقیات ایک ایسا ضابطہ اخلاق ہے جو خود کے مقابلے دیگر افراد کی عزت و احترام، وقار، تحفظ اور فلاح و بہبود پر مبنی ہوتا ہے۔ 'تحقیق میں اخلاقیات' سے مراد تحقیقی امور (مثلاً پی ایچ ڈی، ریسرچ پروجیکٹ، ایم فل، تحقیقی مقالے، وغیرہ) میں اخلاقی اصول و ضوابط اور اقدار کے اطلاق سے ہے۔ یہ محققین کے لیے رہنما اصول ہوتے ہیں۔ جو تحقیقی سرگرمیوں میں پیدا ہونے والے اخلاقی مسائل کی نشاندہی اور ان کے سیاق و سباق میں اخلاقی معیارات کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ان اصول و ضوابط یا اقدار کی فہرست ہوتے ہیں جن کے تحت محققین اور تحقیقی ادارے عمل پیرا ہوتے ہیں تاکہ تحقیقی امور کے معیار میں اصلاح کی جا سکے۔ دیگر الفاظ میں تحقیقی اخلاقیات اخلاقی رہنما اصولوں کا وہ مجموعہ ہے جو تحقیقی امور کو سہل و منظم بناتے ہیں اور اس میں درپیش مسائل اور سوالات کا منصفانہ حل فراہم کرتے ہیں کہ کس طرح تحقیق کی جائے، معلومات کس طرح حاصل کی جائیں، نتائج کس طرح اخذ کیے جائیں اور ان کی نشر و اشاعت کیسے کی جائے۔ تحقیق کی اخلاقیات میں بنیادی اخلاقی اصولوں مثلاً فریقین کا احترام، وسائل کا بہترین استعمال، تحقیقی نتائج کی نشر و اشاعت اور غیر اخلاقی برتاؤ کے تعین قدر کے ضوابط کا اطلاق شامل ہوتا ہے۔ مزید اس کے دائرۂ کار میں شرکا کا تحفظ، ان کی فلاح، بہبود، ذاتی حقائق کی راز پوشی اور دانشورانہ املاک کا احترام بھی جزو لاینفک کی حیثیت کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ ماہرین کے ذریعے کچھ اہم تحقیقی اخلاقیات کا تعین کیا گیا ہے۔ تحقیقی عمل میں جسے ملحوظ رکھنا محققین کی ذمے داری ہوتی ہے۔

تحقیقی عمل میں تحقیق کے تینوں فریقین کا مختلف تناظر، مفاد، اغراض و مقاصداور تأثرات شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اپنے تناظر، مفاد، اغراض و مقاصد اور تأثرات کی بنیاد پر تحقیقی عمل اور اس کے نتائج کو متاثر کر سکتے ہیں۔اس لیے اس عمل سے اگر ہم حقیقت کی عکاسی کرنا چاہتے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو ہمیں تحقیق کی مذکورہ بالا اخلاقیات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

چونکہ تحقیقی امور سے ملازمت کا حصول اور پیشہ ورانہ ترقی وابستہ ہوتی ہے اس لیے موجودہ دور میں طلبا کی ایک کثیر تعداد پی ایچ ڈی کی جانب راغب ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی تحقیقی اخلاقیات میں انحطاط اور بحران کا مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہے جس کے سبب تحقیق کے معیار میں بھی انحطاط دیکھنے میں آ رہا ہے۔ اس لیے تحقیق کے معیار میں خاطر خواہ اصلاح کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اور اسی غرض سے تحقیقی اخلاقیات پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں UGC کی جانب سے سال 2020 سے پی ایچ ڈی کے خواہش مند طلبا (ریسرچ اسکالر) کو تمام شعبہ جات میں 'پی ایچ ڈی کورس ورک' کے تحت 'تحقیقی اور اشاعتی اخلاقیات' (Research and Publication Ethics) نامی ایک لازمی پرچے کا مطالعہ لازمی قرار دیا گیا ہے، جس کا مقصد مستقبل کے محققین میں تحقیق و اشاعت کی اخلاقیات اور غیر مطلوبہ طرز عمل سے آگہی پیدا کرنا ہے تاکہ ہندوستان میں تحقیق کے معیار کو بلند کیا جا سکے۔

تحقیقی اخلاقیات تحقیقی امور کو منظم، مستند، معتمد اور قابل عمل بناتی ہیں۔ عمومی طور پر یہ تحقیق کے مختلف اغراض و مقاصد اور خصوصی طور پر 'علم کی تشکیل و توسیع' جیسے اہم و بنیادی مقصد کی تکمیل میں مدد کرتی ہیں۔ یہ تحقیق کے اشتراکی امور کے لیے درکار اقدار جیسے عزت و وقار کا احترام، باہمی اعانت و تحفظ، شفافیت اور ایمانداری، جوابدہی اور ذمے داری، یقین و اعتماد، فرائض کی ادائیگی کے ساتھ حقوق کی وصولی، وغیرہ کا فروغ کرتی ہیں نیز یہ تحقیق کے تمام فریقین کا استحصال سے تحفظ بھی کرتی ہیں۔ تحقیق میں مطلوبہ عمومی و بنیادی اخلاقیات پر عمل آوری ضروری ہوتی ہے مثلاً: ایمانداری، اخلاص، معروضیت، رازپوشی، احتیاط، شفافیت، جوابدہی، دانشورانہ املاک کا احترام، ادبی سرقے سے گریز، اشاعت کی اخلاقیات کی پابندی، قوانین کی پابندی، شرکا کا تحفظ و ذاتیات کا احترام، معطیات کا تحفظ، وعدے کی پاسداری، سماجی ذمے داری، اتالیق کی ذمے داری، رفقائے کار کا احترام، منصفانہ اور غیر متعصبانہ سلوک، غیر جانبدارانہ رویہ، تحقیقی استعداد کا فروغ، وغیرہ۔ یہ اخلاقیات متعین کرنے والے ممالک، یا محکمے، یا شعبہ جات کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ درج بالا اخلاقیات میں سے اپنی ترجیحات کے مطابق کن اخلاقیات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں یا وسیع دائروں میں ان اخلاقیات کی کس طرح درجہ بندی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر BERA نے محققین کے لیے سنہ 2018 میں رہنما اصول کے پانچ وسیع دائرے تجویز کیے ہیں۔ (1) شرکا کے تئیں محققین کی ذمے داریاں (2) مالی امداد رساں ایجنسی کے تئیں محققین کی ذمے داریاں (3) محققین تعلیم کے معاشرے کے تئیں محققین کی ذمہ داریاں (4) نشر و اشاعت سے متعلق محققین کی ذمے داریاں اور (5) فریقین کی ترقی و فلاح و بہبود سے متعلق محققین کی ذمے داریاں۔

تحقیق میں اخلاقیاتی ملحوظات:

تحقیق میں مختلف افراد، گروہ اور ادارے شامل ہوتے ہیں۔ محقق کو تحقیق کے تمام دائروں اور زاویوں میں اور ان سے متعلق تمام فریقین کے تئیں مخصوص اخلاقیات کو ملحوظ رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ تحقیق کی اخلاقیات کے دائرے میں عام طور پر درج ذیل فریقین شامل ہوتے ہیں:

(1) شرکا، (2) تحقیق کار، (3) مالی امداد رساں (4) محققین کا معاشرہ اور (5) تحقیق کی نشر و اشاعت۔ تحقیق میں شرکا کا تعین تحقیق کی نوعیت اور اس کے اغراض و مقاصد پر منحصر ہے۔ ایک ڈاکٹر کے لیے اس کا مریض، ایک وکیل کے لیے اس کا موکل، ایک تاجر کے لیے اس کا گراہک، ایک معلم کے لیے طلبا اور درج بالا تمام حلقوں کے متعلقہ ادارے و فریقین عام طور پر ان کے شرکا ہوتے ہیں۔ تعلیم کے شعبے میں تحقیق کے شرکا یا موضوع عام طور پر طلبا، ان کے والدین یا سرپرست، اساتذہ، تعلیمی ادارے، تعلیمی انتظامیہ، کوئی عظیم شخصیت یا مصنف یا کوئی مخصوص سماجی گروہ ہو سکتے ہیں جنھیں محقق اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے۔ وہ اپنی تحقیق میں ان سے متعلق کسی مظہر، حالت یا مسئلے پر مشتمل معلومات حاصل کرتا ہے۔ فریقین کی فہرست میں دوسرا اہم کردار خود محقق ہوتا ہے۔ ایسا کوئی بھی فرد جو کسی خاص مقصد کے لیے معلومات جمع کرتا ہے؛ منظم، سائنسی اور قابل قبول طریقہ کار کو اختیار کرتے ہوئے تحقیق کے نتیجے تک رسائی کرتا ہے، خواہ وہ کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو، تحقیق کار کہلاتا ہے۔ فریقین کی فہرست میں تیسرا اہم کردار اس ادارے کا ہے جس کے تحت تحقیقی امر انجام دیا جاتا ہے مثلاً کوئی کالج، یونیورسٹی یا کوئی ایجنسی کا ہے جو کہ تحقیق کے لیے مالی اعانت فراہم کرتی ہے۔ یہ رقم اس ایجنسی کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے فراہم کی جاتی ہے۔ اس لیے تحقیق کی روداد نویسی میں اختیار کیے گئے اسلوب پر اس ادارے یا ایجنسی کے فلسفے کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ تحقیق کے ان تین اہم زاویوں کے علاوہ چوتھا وسیع دائرہ محققین کے معاشرے کا ہوتا ہے، جس کے تحت ریسرچ پروجیکٹ و تحقیقی ادارے، ان کے محققین کی ٹیم، ریسرچ سپروائزر، ریسرچ اسکالر، اتالیق، وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ تحقیقی اخلاقیات کی ملحوظات میں پانچواں دائرہ تحقیق کی نشر و اشاعت کا ہوتا ہے، جس کے تحت تحقیق کے نتائج کو بغیر کسی تفریق اور تعصب کے معروضی طریقے سے پیش کرنا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر محققین یا مصنفین کے ذریعے انجام دیے گئے امور کا احترام کرتے ہوئے باقاعدہ طریقے سے ان کا حوالہ پیش کرنا بھی مطلوب ہوتا ہے۔ مختلف شعبہ جات کی تحقیقات کے لیے حوالہ پیش کرنے کے مختلف طرز بین الاقوامی سطح پر رائج ہیں لیکن شعبۂ تعلیم میں امریکی نفسیاتی تنظیم کا طرز حوالہ (APA Referencing Style) نسبتاً زیادہ مقبول ہے۔

تحقیقی عمل میں تحقیق کے تینوں فریقین کا مختلف تناظر، مفاد، اغراض و مقاصد اور تأثرات شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اپنے تناظر، مفاد، اغراض و مقاصد اور تأثرات کی بنیاد پر تحقیقی عمل اور اس کے نتائج کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس عمل سے اگر ہم حقیقت کی عکاسی کرنا چاہتے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو ہمیں تحقیق کی مذکورہ بالا اخلاقیات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تحقیق کی اخلاقیات اور ضابطۂ عمل کی وضاحت درج ذیل نکات کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔

(1) شرکا سے متعلق اخلاقی ملحوظات: تحقیق کے عمل میں شرکا سے متعلق اخلاقی ملحوظات درج ذیل ہیں۔

i معطیات معلومات کو جمع کرنے میں: کوئی شریک موضوع یا مدعی یہ سوال کر سکتا ہے کہ میں تحقیق کار کو معلومات کیوں فراہم کروں؟ کسی تحقیق کار کو کیا حق ہے کہ وہ میرا دروازہ کھٹکھٹائے؟ یا مجھے سوال نامہ بھیجے؟ یا میری ذاتی زندگی سے متعلق معلومات کیوں فراہم کروں؟ یا میں اپنا قیمتی وقت اور توانائی کیوں برباد کروں؟ خواہ تحقیق کار نے

پہلے سے اجازت لے لی ہو،لیکن کیا یہ اخلاقیات ہے کہ تحقیق کار معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی سے درخواست کرے، کسی کو پریشان کرے یا کسی پر دباؤ بنائے؟ کسی موضوع یا شریک یا مدعی کے ذریعے اگر مندرجہ بالا سوالات کیے جاتے ہیں تو یہ غلط ہے، کیونکہ اگر تمام شرکا ایسا سوچنے لگیں گے تو دنیا کی ترقی ساکت ہو جائے گی۔ تحقیق اس لیے کی جاتی ہے کہ حالات میں بہتری لائی جاسکے اور ملک وسماج کی ترقی کی جاسکے۔ حالات میں تبدیلی اور ترقی لانے کے لیے حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ مطالعے کے لیے معلومات کی ضرورت ہے اور یہ معلومات نظام میں موجود افراد ہی فراہم کرسکتے ہیں۔ چونکہ تحقیق کار ایک باشعور شخص ہوتا ہے جو کہ مسئلے کو سمجھ کر اسے حل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے معلومات حاصل کرنے کا حق ہے۔لیکن تحقیق کار کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ شرکا (جواب دہندہ) سے اجازت حاصل کرے،اسے اپنی تحقیق کی ضرورت اورافادیت سے روشناس کرائے اورخوش اسلوبی کے ساتھ اس کی رضامندی حاصل کرے۔اگر تحقیق کار اپنی تحقیق کی ضرورت اور افادیت سے جواب دہندہ کو آگاہ نہیں کرتا ہے، اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی آمادگی کو نظر انداز کرتا ہے تو یہ تحقیق کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کی نفی ہے اور شریک یا مدعی کے وقت کی بربادی ہے اور ایسے میں حاصل شدہ معلومات کے معروضی، معتبر اور درست ہونے پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

ii. رضامندی حاصل کرنے میں (Seeking Consent): کسی بھی شعبے میں موضوع، مدعی یا شریک کی بغیر اجازت کے معلومات حاصل کرنا غیر اخلاقی امر تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ طبی سائنس اور سماجی سائنس کی تحقیقات میں یہ امر لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ ماقبل اجازت حاصل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مدعی یا شریک کو یہ علم ہوجاتا ہے کہ تحقیق کار کو کس طرح کی معلومات مطلوب ہیں، معلومات کس مقصد کے لیے حاصل کی جارہی ہیں، مطالعے میں اسے کس مقصد سے شامل کیا گیا ہے، اور یہ مطالعہ اس کی زندگی کے کس پہلو کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر کرنے والا ہے، وغیرہ۔ یہ بھی ذہن نشین کرنے کی بات ہے کہ جواب دہندہ سے اجازت اس کی منشا کے مطابق اور بغیر کسی دباؤ کے حاصل کرنا چاہیے۔

iii. محرک فراہم کرنے میں: اکثر ایک سوال کیا جاتا ہے کہ جواب دہندہ کو معلومات فراہم کرنے کے بدلے کوئی مادّی شے پیش کی جائے یا نہیں؟ بعض اوقات کچھ محقق جواب دہندہ کو مطالعے میں حصہ لینے کے بدلے کچھ مادّی اشیا پیش کرتے ہیں۔ان کے خیال میں 'اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جواب دہندہ اس بنا پر وقت اور معلومات دینے کے لیے آسانی سے آمادہ ہوجاتا ہے۔ ماہرین کی رائے میں تحقیق کار کا یہ عمل تحقیق کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کی نفی ہے۔ شریک یا مدعی کی آمادگی حاصل کرنے کے لیے اسے مطالعے کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کرانا چاہیے اور اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ یہ مطالعہ اسے یا اس کے سماج کی آئندہ زندگی کو کس طرح نفع پہنچا سکتا ہے؟

اگرتحقیق کار اپنی تحقیق کی ضرورت اور افادیت سے جواب دہندہ کو آگاہ نہیں کرتا ہے، اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی آمادگی کو نظر انداز کرتا ہے تو یہ تحقیق کی پیشہ ورانہ اخلاقیات کی نفی ہے اور شریک یا مدّعی کے وقت کی بربادی ہے اور ایسے میں حاصل شدہ معلومات کے معروضی، معتبر اور درست ہونے پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

iv. حسّاس اور ذاتی معلومات حاصل کرنے میں: سماجی علوم کی تحقیقات کے تحت کچھ ایسی معلومات ہوتی ہیں جو بہت ہی حسّاس اور مخفی نوعیت کی ہوتی ہیں۔اس طرح کی معلومات اخذ کرنے سے جواب دہندہ متذبذب، مشتعل یا پریشان ہوسکتا ہے۔اکثر لوگوں کے لیے ان کے جنسی برتاؤ، نشہ آور چیزوں کے استعمال اور چوری کی عادت یا اسی قسم کے دیگر جرائم وگناہ کے بارے میں سوالات پوچھنا انتہائی ناگوار ہوتا ہے۔کچھ لوگ ازدواجی زندگی، آمدنی اور عمر سے متعلق سوالات کو بھی ذاتی زندگی میں مداخلت مانتے ہیں۔اس لیے جواب دہندہ سے اس طرح کے سوالات پوچھنے میں تحقیق کار کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔تحقیق کار ہمیشہ اس کشمکش وپیچ میں رہتا ہے کہ اسے اس طرح کے سوالات پوچھنے چاہئیں یا نہیں؟ ماہرین کی رائے میں اس طرح کے سوالات پوچھنا کہیں سے بھی اخلاقیات کی نفی نہیں ہے شرط یہ ہے کہ تحقیق کے لیے اس طرح کی معلومات ناگزیر ہوں۔ ایسی صورت میں محقق جواب دہندہ کو بالکل واضح کردے کہ اسے کس طرح کی معلومات مطلوب ہیں؟ پھر اسے غور وفکر کرنے کا مناسب وقت دینا چاہیے کہ آیا وہ اس طرح کی معلومات فراہم کرکے مطالعے میں شریک ہونا چاہتا ہے یا نہیں؟ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ جواب دہندہ کو یہ یقین دلانا چاہیے کہ اس کے ذریعے فراہم کی گئی معلومات کو پوشیدہ رکھا جائے گا اور کسی سے بھی اس کا تبادلہ نہیں کیا جائے گا۔

v. راز داری قائم رکھنے میں: جواب دہندہ کے ذریعے فراہم کی گئی معلومات کو مخفی رکھنا تحقیقی مقاصد سے بالاتر اور محقق کی اولین اخلاقی ذمے داری ہے اوران معلومات کا دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کسی سے تبادلہ قطعی طور پر غیر اخلاقی ہے۔اکثر تحقیق کار کو اپنے مسئلے کا تناظر پیش کرنے کے لیے نمونے کی نشاندہی اور انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ایسی صورت میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ نمونے کی انفرادی اکائی کی معلومات بالکل پوشیدہ رہے۔یہ ظاہر کرنا غیر اخلاقی ہے کہ کس جواب دہندہ نے کون سی معلومات فراہم کی ہے؟ ایسی تحقیقات جس میں محقق کو موضوع یا مدّعی یا شریک کے پاس بار بار جانا ضروری ہوتا ہے،ایسی صورت میں ان سے تعلقات صرف معلومات حاصل کرنے تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔اگر ساتھ ساتھ کسی دیگر فرد سے بھی معلومات حاصل کی جارہی ہے تو پہلے فرد سے یہ بات پوشیدہ رکھنا چاہیے۔

(2) محقق سے متعلق اخلاقی ملحوظات: تحقیقی عمل میں معلم یا محقق سے متعلق اخلاقی ملحوظات درج ذیل ہیں۔

i. جانب داری سے گریز: تحقیق میں محقق کی جانب داری غیر اخلاقی امر ہے۔یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ جانبداری موضوعیت (Subjectivity) سے مختلف ہے۔ موضوعیت کا تعلق تحقیقی عمل میں تحقیق کار کے تعلیمی پس منظر، تربیت، قابلیت اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے ہے جبکہ جانب داری تحقیق کار کے ذریعے حاصل مطالعہ کے نتائج میں جوڑتوڑ (ہیرپھیر) کرنے اورسچائی کو غلط طریقے سے پیش کرنے کی ایک دانستہ کوشش ہے۔اس طرح کی جانب داری تحقیقی عمل میں قطعی طور پر غیر اخلاقی تصور کی جاتی ہے۔

ii. غیر موزوں تحقیقی طریقہ کار کا استعمال: تحقیقی مطالعے میں مسئلے کی نوعیت کے اعتبار سے موزوں تحقیقی طریقہ کار کا استعمال کرنا محقق کی ذمے داری ہے۔صرف اس بنا پر کسی تحقیقی طریقہ کار کا استعمال کرنا کہ کسی مخصوص طریقہ کار میں محقق کو مہارت حاصل ہے یا فلاں طریقہ کار سہل ہے، غیر اخلاقی امر ہے۔اس کے علاوہ نمونے کے انتخاب کی غیر موزوں تکنیک کا استعمال، غیر معقول آلے کا استعمال،متعصب نمونے یا معطیات کا انتخاب کرنا،غیر موزوں شماریاتی تکنیک کا اطلاق اور غلط نتائج اخذ کرنا بھی تحقیقی اخلاقیات کی خلاف ورزی کے زمرے میں شامل ہے۔

iii. غلط روداد نویسی: طریقہ کار کا درست استعمال کرنے کے باوجود تحقیق کی رپورٹنگ اس انداز سے کرنا کہ جس کا مقصد کسی دیگر شخص، ایجنسی یا خود محقق کے مقاصد اور مفاد کی تکمیل ہو غیرا خلاقی عمل ہے۔ اس کے تحت کسی مذہب، نسل، قوم، ذات، جنس، وغیرہ سے متعلق تعصب یا ان کے جذبات کو مشتعل کرنے والی بات یا نتائج بھی اس زمرے میں شامل کیے جاتے ہیں۔

(3) تحقیقی ادارے اور مالی امداد رساں ایجنسی سے متعلق اخلاقی ملحوظات: تحقیق کے لیے اگر کسی ادارے، ایجنسی یا شخص سے رقم حاصل کی گئی ہے تو اس کے تئیں بھی محقق کی کچھ اخلاقی ذمے داریاں ہوتی ہیں۔ رقم ہمیشہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے فراہم کی جاتی ہے۔ رقم کسی نئے پروجیکٹ کے لیے، کسی پروجیکٹ کا تعین قدر کرنے کے لیے، کسی حکمت عملی کی کامیابی کا مطالعہ کرنے کے لیے یا کسی طریقہ تدریس کی موثریت دریافت کرنے کے لیے فراہم کی جاسکتی ہے۔ اکثر تحقیقی ادارے اور رقم فراہم کرنے والی ایجنسی خود کے وضع کردہ طریقہ کار پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت دیتی ہیں، ان کا پابند ایک محقق کو ہونا چاہیے۔ محقق کی یہ اخلاقی ذمے داری ہے کہ وہ تحقیقی اداروں اور ایجنسیوں کے اصول وضوابط کے عین مطابق عمل کرے اور غیر جانب دارانہ طریقے سے حقیقت پر مبنی اپنا تجزیہ اور نتیجہ پیش کرے۔

(4) محققین کے معاشرے سے متعلق اخلاقی ملحوظات: محققین کے معاشرے کے دائرے میں محقق خاص، معاون محقق، ریسرچ اسکالر، محقق کے نگراں، ادارے کا تحقیقی عملہ، حکومتی اور غیر حکومتی ادارے، مالی امداد رساں ایجنسی، وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ ان تمام فریقین (متعلقین) کی اخلاقی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ادارے کی سالمیت کا خیال رکھیں، اس کی شبیہ کو خراب ہونے سے بچائیں، اس کے لیے اعلیٰ معیارات متعین کریں اور رائج عمل میں اصلاح کریں تاکہ یہ تمام امور علم میں اضافے کا باعث بن سکیں۔

(5) تحقیق کی نشر و اشاعت سے متعلق اخلاقی ملحوظات: محققین کا یہ اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کے نتائج اور مضمرات کو معروضی، واضح اور سہل طریقے سے پیش کریں۔ نتائج میں کسی بھی قسم کے ردوبدل سے گریز کرنا چاہیے اور ان کی نشر و اشاعت میں کسی فرد واحد، یا قوم وملت، یا مذہب کو بدنام کرنے کی منشا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر محقق اپنی تحقیق کے کسی بھی مرحلے میں اپنے کسی رفیق سے اعانت حاصل کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے تعاون کے تناسب سے معاون محقق کے طور پر شامل کرے۔ اعانت کا تناسب کم ہونے یا ادارے سے اعانت کی صورت میں اس کا اظہار تشکر تو لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ محقق خاص کے تعین کے معیار رفقا کا منصب یا رتبہ نہیں بلکہ تعاون کا تناسب ہونا چاہیے۔ تحقیقی رپورٹ امداد رساں ایجنسی کے اور ناشر کے اصول وضوابط اور فارمیٹ (ساخت یا ڈھانچہ) کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ اگر شرکا کے ساتھ نتائج کا تبادلہ کرنا ضروری ہو تو رازداری کا خیال رکھنا چاہیے۔

(6) فریقین کے تحفظ، ترقی اور فلاح و بہبود سے متعلق اخلاقی ملحوظات: محقق کی تحقیق کے کسی بھی مرحلے میں فریقین میں سے کسی کو بھی کوئی ضرر نہیں پہنچنا چاہیے۔ ان کے طبعی، ذہنی اور جذباتی فلاح بہبود اور تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فوائد پہنچانے اور خطرات کو کم از کم کرنے کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ خصوصاً محقق جب شریک کے ساتھ کوئی تجربہ کرتا ہے تو اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ شریک کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اگر تحقیق اس نوعیت کی ہے جس میں کچھ ممکنہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو ایسے وقت میں تحقیق کار کو چاہیے کہ وہ ممکنہ خطرے کی شدت کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ خطرہ روزمرہ زندگی میں ہونے والے معمولی نقصانات سے زیادہ نہ ہو۔ اگر معلومات حاصل کرنے کے مرحلے میں جواب دہندہ کو کوئی جسمانی، ذہنی یا جذباتی ضرر پہنچتا ہے تو تحقیق کار کو چاہیے کہ وہ اس کی تلافی ضرور کرے۔ اس کے ساتھ تحقیقی اداروں، مالی امداد رساں ایجنسیوں اور منتظمین کو چاہیے کہ وہ تحقیق کے تمام فریقین کو متعلقہ تحقیقی امور بشمول تحفظی اقدامات کی تربیت کے مواقع فراہم کریں۔ نیز انھیں یہ بھی متعین کرنا چاہیے کہ تحقیقی عمل کے کسی بھی مرحلے میں کوئی بدعنوانی یا فریقین کا استحصال نہ ہو، اور اگر اس کی خبر ملتی ہے تو مناسب قانونی کارروائی کا بھی اہتمام کیا جانا چاہیے۔

تحقیق میں اخلاقیات تحقیقی عمل کو شفاف، معروضی، اور منظم بنا کر مقاصد کی تکمیل میں مدد کرتی ہیں۔ کسی بھی تحقیقی عمل کو موثر اور کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لیے سماج، تحقیق کے مختلف فریقین، تحقیقی اداروں اور ایجنسیوں کا تعاون، اشتراک اور ہم آہنگی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اعانت اس وقت ممکن ہے جب تحقیقی معاشرہ اپنے شعبے کی اخلاقیات پر عمل پیرا ہو، کیونکہ اخلاقیات تحقیقی عمل کی کامیابی کے لیے ضروری اقدار جیسے؛ باہمی تعاون، اشتراک، احترام، تحفظ، انصاف، وغیرہ کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ تحقیقی اخلاقیات کے اصول، جیسے تصنیف، کاپی رائٹ اور پیٹنٹ کی پالیسیاں، ڈیٹا شیئرنگ کی پالیسیاں، اور رازداری کے قواعد، تعاون کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے دانشورانہ املاک کا تحفظ، وغیرہ تحقیقی عمل میں عدل وانصاف اور مساوات کو فروغ دیتے ہیں۔ تحقیقی عمل اور رپورٹنگ کے دوران اخلاقی ہدایات پر عمل ہونا تحقیق کی صداقت کی ضمانت ہے۔ محقق کو لازمی طور پر ریگولیٹری کمیٹیوں کی طرف سے جاری کردہ اخلاقی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے تاکہ مطالعے کے تمام فریقین خصوصاً شرکا، بڑے پیمانے پر عوام اور خود محقق کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔ اخلاقی ہدایات پر عمل کرنا اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تحقیق مستند ہے اور غلطیوں اور سرقہ سے پاک ہے۔ اس کے علاوہ، تحقیقی اخلاقیات محققین کے معاشرے کے درمیان ذمے داری کا احساس پیدا کرتی ہیں بدعملی، بدعنوانی یا استحصال کی صورت میں ذمے داری اور فیصلہ سازی کے تعین کو آسان بناتی ہیں اور منصفانہ طرز رسائی کو یقینی بناتی ہیں۔ اخلاقی اصول اور ہدایات بالعموم سماج سے وابستہ تمام شعبہ جات کا اور بالخصوص تحقیق کا ایک لازمی جزو ہے۔ لہٰذا، یہ ضروری ہے کہ محققین ان اخلاقی اصول وضوابط سے آگاہ ہوں اور قبل از تحقیق، دوران تحقیق اور مابعد تحقیق انھیں ملحوظ رکھیں۔

”تحقیق میں اخلاقیات تحقیقی عمل کو شفاف، معروضی، اور منظم بنا کر مقاصد کی تکمیل میں مدد کرتی ہیں۔ کسی بھی تحقیقی عمل کو مؤثر اور کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لیے سماج، تحقیق کے مختلف فریقین، تحقیقی اداروں اور ایجنسیوں کا تعاون، اشتراک اور ہم آہنگی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اعانت اس وقت ممکن ہے جب تحقیقی معاشرہ اپنے شعبے کی اخلاقیات پر عمل پیرا ہو، کیونکہ اخلاقیات تحقیقی عمل کی کامیابی کے لیے ضروری اقدار جیسے؛ باہمی تعاون، اشتراک، احترام، تحفظ، انصاف، وغیرہ کو فروغ دیتی ہے۔“

Dr. Naushad Husain
Assistant Professor
Department of Education and Training
Maulana Azad National Urdu University,
Hyderabad-500032 (Telangana)
Mob.: 7000211347

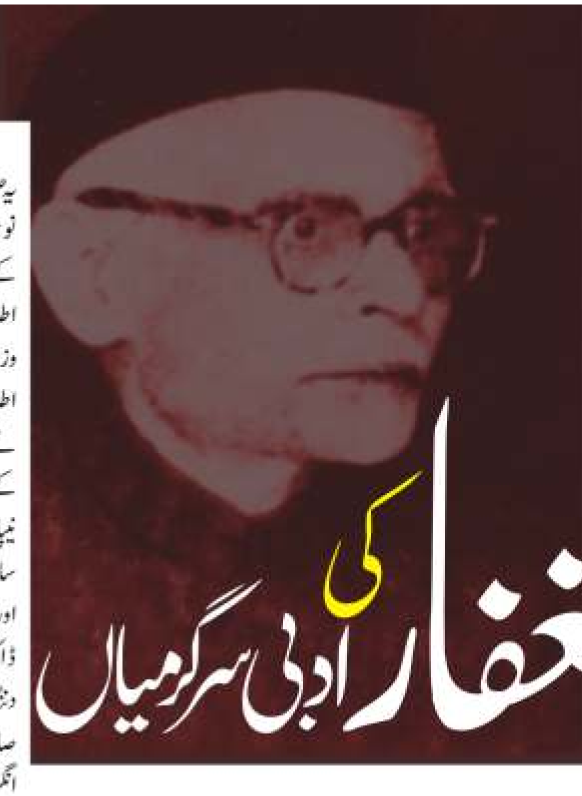

قاضی عبدالغفار کی ادبی سرگرمیاں

جہانگیر احمد خاں

کسی بڑے فنکار کی بڑائی کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ ہر نئے عہد میں اس کے سرمایۂ فکر اور مہارت فن کا احتساب ہوتا ہے، نئے سرے سے اس کے تخلیقی جوہر کو پرکھا جاتا ہے، شعور و وجدان کی نئی میزانوں پر اس کے افکار و تصورات کو تولا جاتا ہے، عصری زندگی، تہذیب اور فن کے نئے تقاضوں کی تحریک و تناظر میں اس کی روشن طبع اور جودت فکر کے شاہکاروں کو پرکھا جاتا ہے، چنانچہ قاضی عبدالغفار اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

''کتنا مشکل ہوتا ہے کسی بڑی شخصیت کا صحیح اندازہ کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اس اندیشے کو دل سے نکالنا کہ کہیں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے جب ان اوراق کو لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو اس تردد کو دل سے نہ نکال سکا اس تردد کا اثر میری تحریر میں موجود ہے۔''

(آثار ابوالکلام آزاد (مقدمہ) قاضی عبدالغفار، ص 3)

قاضی عبدالغفار اپنی شخصیت تعلیم، ادبی شعور اور کارکردگی کے اعتبار سے ایک قابل قدر اور لائق احترام ادیب، مترجم، صحافی اور مصنف تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی اب سے 80/ برس پیشتر شروع کی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے قلم کی روشنائی تادم آخر خشک نہیں ہوئی، وہ برابر لکھتے سوچتے اور کسی نہ کسی دائرے میں ادبی کام کرتے رہے، ان کے بعض کام تو ان کی غیر معمولی فکری صلاحیتوں کا مظہر ہیں جن کی طرف توجہ دینے اور جن کی ادبی اہمیت کے تعین کی شدید ضرورت ہے۔

قاضی عبدالغفار ایک ایسی عہد ساز شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے اردو صحافت اور ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ کوئی ادبی مؤرخ اس نام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ قاضی صاحب مراد آباد کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ گھرانا بھی ایسا کہ ان کے دادا حامد علی صاحب کو 1857 کی بغاوت میں سولی پر لٹکا دیا گیا تھا اور دو دن کی جستجو کے بعد ان کی نعش جہاں ملی وہیں اسے دفنا دیا گیا اور وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔

قاضی صاحب اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ مراد آباد میں ان کے پڑوس میں ایک لالہ بھی رہا کرتے تھے، وہ رات میں پرسہ دینے کے لیے جب پہنچے تو قاضی صاحب کی دادی نے ان سے کہا کہ ابھی تک تو نعش نہیں ملی ہے۔ اس پر لالہ جی اور ان کی دادی ایک لالٹین ہاتھ میں لے کر اس جگہ پہنچے جہاں سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد نعش دستیاب ہوئی اور مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اسے وہیں دفنا دیا جائے۔ قاضی صاحب کے والد نے ان کے دادا کی سنت سے انحراف کیا اور وہ خان بہادر ابرار احمد کے نام سے مشہور ہوئے جن کی پہنچ انگریز حکام تک تھی، اسی لیے قاضی صاحب نے بی اے کا امتحان دیے بغیر علی گڑھ کو خیر آباد کہا۔ اس وقت ایم اے او کالج میں ان کے ساتھیوں کو جن میں تصدق احمد خاں شیروانی، عبدالرحمٰن صدیقی اور شعیب کے علاوہ سعید الرحمٰن قدوائی کو بڑا تعجب ہوا مگر ان کے والد نے گورنر سے کہہ کر ان کو آبپاشی کے محکمے میں ملازم رکھوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ گورنر سے کوئی ہندوستانی ملنے جاتا تو اسے اپنے جوتے اتار کر ننگے پیر جانا پڑتا تھا اور یہی صورت قاضی صاحب کے ساتھ پیش آئی، حالانکہ یہ 'فل سوٹ' زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اس واقعہ سے ان کو بڑا صدمہ ہوا لیکن بادل ناخواستہ انھیں سرکاری نوکری قبول کرنی پڑی۔ زندگی میں یہ صرف دوبار سرکاری ملازمت سے منسلک رہے ایک مرتبہ نوجوانی میں اور دوسری مرتبہ 1946 میں سر مرزا اسماعیل کے اصرار و ایما پر نظام حیدرآباد کی ریاست کے ناظم اطلاعات کی حیثیت سے، لیکن جب سر مرزا اسماعیل کو وزارت عظمیٰ چھوڑنی پڑی تو قاضی صاحب بھی نظامت اطلاعات سے مستعفی ہو گئے، مگر ابتدائی ملازمت کے چھوڑنے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ وہ یوپی کے اس علاقے پر تعینات کیے گئے تھے، جس کی سرحد نیپال سے ملتی ہے۔ ایک دفعہ یہ دورے پر گئے اور اپنا سامان ڈاک بنگلے میں رکھ کر دفتر کے معائنے کو چلے گئے اور جب واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سامان ڈاک بنگلے کے صحن میں پڑا ہوا ہے اور ایک انگریز مادر زاد ننگا ان کے کمرے میں براجمان ہے۔ اس پر قاضی صاحب کو بڑا طیش آیا اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس انگریز افسر کی چھڑی سے اتنی پٹائی کی کہ وہ آگے آگے بھاگ رہا تھا اور قاضی صاحب چھڑی لیے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ جب وہ ادھ مرا ہو کر بھاگ نہیں سکا تو ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا، تب قاضی صاحب نے اسے چھوڑ دیا اور واپس ڈاک بنگلے آکر اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مراد آباد چلے آئے۔

قاضی صاحب کی اخبار نویسی کی ابتدا 16 سال کی عمر میں ہوئی، جب وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ مراد آباد سے ابن علی صاحب کی ادارت میں اخبار 'نیر عالم' نکلتا تھا جس میں ان کا تحریر کردہ ایک خبر نامہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے تو یہ متعدد اخباروں میں لکھتے رہے۔ اصل اخبار نویسی کی ابتدا 1913 میں ہوئی تھی، جب مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے 'ہمدرد' نکالا۔ 'ہمدرد' کے معیار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے ادیب 'ہمدرد' میں چھپنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ پریم چند کا ایک افسانہ 1913 میں 'ہمدرد' میں شائع ہوا تھا، جس کا انھیں معاوضہ بھی ملا تھا۔ 'ہمدرد' میں ان کے شرکاء کار میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ مولانا شرر اور جالب دہلوی قابل ذکر ہیں۔ 1914 میں مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا تو قاضی صاحب نے مولانا محمد علی کے اشارے پر کلکتہ سے 'جمہور' نکالا جو بقول قاضی صاحب کے 'جمہور' میرا سب سے کامیاب اخبار تھا جس کی اشاعت 13 ہزار تک پہنچ چکی تھی۔'' یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا آزاد بھی نظر بند کر دیے گئے تھے۔ 1914 میں قاضی صاحب کو بھی چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا اور اس کے بعد انھیں کلکتہ سے چلے جانے کا حکم ملا اور وہ مراد آباد چلے آئے، مگر پھر انھیں نظر بند کر کے نینی تال بھجوا دیا گیا، جس

پر قاضی صاحب نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ ’’ میں اپنے دادا کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔‘‘ 1918 میں انھوں نے ’صباح‘ نکالا لیکن چھ مہینے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔

1921 میں قاضی صاحب خلافت وفد کے معتمد کی حیثیت سے لندن کے لیے روانہ ہوئے جہاں سے 1922 میں واپس ہوئے۔ اس وفد میں سر آغا خان کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی (خلافت تحریک کے صدر)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مشیر حسین قدوائی اور سید حسن امام تھے۔ قاضی صاحب نے اس وقت کی روداد ’نقش فرنگ‘ کے نام سے حکیم اجمل خاں کے ایما پر تحریر کی، جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب اس کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

’نقش فرنگ‘ میری پہلی تصنیف تھی، اس سے پہلے جو کچھ لکھا تھا وہ یا تو اخباری مضامین تھے جو کبھی کبھار ادبی رسالوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری زندگی کے ہنگاموں میں تصنیف و تالیف کے مشاغل کی تمام راہیں بند تھیں۔‘‘

1921 کے بعد قاضی صاحب کئی بار یورپ اور مشرق وسطی کے دوروں پر گئے اور دو سال تک پیرس میں تجارت بھی کی لیکن 1926 میں یورپ سے واپس چلے آئے اور حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد طبیہ کالج کے معتمد کی حیثیت سے کام کیا۔ 1928 سے 1930 تک مراد آباد میونسپلٹی کے چیئر مین رہے۔ اسی زمانے میں قاضی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استحکام میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ 1929 میں جامعہ پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جامعہ کے اساتذہ کو آٹھ مہینے سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ حکیم اجمل خاں اس کی وجہ سے بڑے متفکر تھے۔ ایک دن انھوں نے قاضی صاحب کو بلا کر ایک ہیرے کی انگوٹھی دی اور کہا کہ اسے بمبئی لے جاؤ اور وہاں فروخت کر کے، جو رقم ہاتھ آئے اس سے اساتذہ کو تنخواہیں تقسیم کر دو۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ اس انگوٹھی کو دہلی میں فروخت نہ کرنا۔ اس زمانے میں اس انگوٹھی کی قیمت بیس ہزار روپے آئی اور اس رقم سے جامعہ کے اساتذہ کی تنخواہیں ادا کی گئیں اور جو رقم بچ رہی اسے جامعہ کے مد میں محفوظ کر دیا گیا۔

’نقش فرنگ‘ کے بعد ان کی دوسری تصنیف ’لیلیٰ کے خطوط‘ ہے۔ جو 1927 میں 27 دن میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا شمار ادب لطیف کے شاہکاروں میں ہوتا ہے پہلے یہ خطوط قسط وار ’نیرنگ خیال‘ میں شائع ہوتے رہے، لیکن 1933 میں یہ کتابی شکل میں مع تمہید و اضافہ کے شائع ہوئے۔ طوائف کا موضوع اردو ادب میں نیا نہیں ہے لیکن قاضی صاحب نے ان خطوط میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اردو ادب کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ’مجنوں کی ڈائری‘ لکھی، جو قاضی صاحب کی انشا پردازی کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ قاضی صاحب کی ایک اور تالیف ’اس نے کہا‘ ہے، جو خلیل جبران کی کتاب کا ترجمہ ہے اس میں پیغمبر کے فلسفیانہ افکار و اقوال کو بڑے ادیبانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ’تین پیسے کی چھوکری‘ ایک مختصر انشائیہ ہے، جس کی زبان دودھوں دھلی ہوئی ہے۔

قاضی صاحب کی سب سے معرکۃ الآرا تصنیف ’آثار جمال الدین افغانی‘ ہے، چونکہ جمال الدین افغانی دو سال تک حیدر آباد میں محب حسن کے پاس قیام پذیر تھے، جو اس زمانے میں اصلاحی تحریک اور خاص طور پر طبقہ نسواں میں اصلاح کے بڑے مؤید تھے۔ قاضی صاحب کی یہ کتاب برسوں کی تحقیق اور کاوش کا ثمرہ ہے۔ اس کتاب کا مواد انھوں نے لندن اور پیرس کے کتب خانوں سے جمع کیا تھا۔ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو ہند نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا، جواب ناپید ہے۔ اس کتاب کا مواد جمع کرنے کے لیے قاضی صاحب کو بہت سی مشکلات سے دو چار ہونا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور جہاں سے مواد ملا اسے جمع کیا اس لیے وہ تحریر فرماتے ہیں:

’’ چونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائی تیار کرنا اور تحقیق کرنا دونوں مماثل ہیں۔‘‘

اس کے بعد انھوں نے ’حیات اجمل‘ لکھی، جو حکیم اجمل خاں کی مستند سوانح عمری ہے۔ اس طرح سے انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک کتاب ’آثار ابوالکلام آزاد‘ تحریر فرمائی، جو اردو میں سیرت نگاری کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں 1927 میں علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔

1934 کے اوائل میں انھوں نے حیدر آباد سے ’پیام‘ کے نام سے ایک روز نامہ جاری کیا، جو حیدر آباد کے شاہی ماحول میں صور اسرافیل پھونکنے کے مماثل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پولیس کا ایک انسپکٹر بھی اخبار کے ایڈیٹر کی خبر لے لیا کرتا تھا۔ قاضی صاحب کے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا لیکن انھوں نے اس وقت کے کوتوال بلدیہ کو لکھ کر بھجوا دیا کہ:

’’ میرے اخبار کے خلاف آپ کو جو شکایت ہے، اس کو عدالت میں پیش کر دیجیے میں وہاں اپنی جواب دہی کر لوں گا۔ پولیس کے محکمے میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا میرے پیشے کی توہین ہے۔‘‘

اس کے بعد پولیس والوں کی ہمت نہیں ہوئی کہ ’پیام‘ تو کیا دوسرے اخبار والوں پر بھی ہاتھ ڈالیے۔ یہ تھا حیدر آباد کا پہلا مرحلہ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ان کی آخری ٹکر بھانت بھانت کے نوکر شاہی عناصر سے ہوئی، لیکن وہ ہر ایک کی پول کھولتے رہے۔ 1946 میں ان کی آخری ٹکر کتب خانے آصفیہ کے مہتمم سے ہوئی، جو اپنی یورپین ڈگری کے زور پر کتب خانہ میں من مانی چلانا چاہتے تھے۔ قاضی صاحب نے اس کے خلاف ’علم کی رسد بندی، کتب خانہ آصفیہ‘ کے عنوان سے جو چودہ اداریے سپرد قلم کیے، وہ حیدر آباد کی صحافتی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ اس طرح سے ماچریڈی پلی میں بھی پولیس کے وحشیانہ مظالم کو طشت از بام کیا اور اس کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا۔ قاضی صاحب کی صحافتی زندگی کا یہ پہلو صرف ادارتی کالموں تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ ان کی دلچسپیاں گوناگوں اور تنوع بہ تنوع تھیں ان کا ’سر راہ‘ کا کالم آج بھی بہت سے ذہنوں میں تازہ ہے۔ اس کالم میں زبان کی چاشنی اور تحریر کے ایک خاص مزاحیہ انداز بیان کے ساتھ کچھ معلوماتی باتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے اس کالم میں انگلستان سے مسٹر ایمری کی قیادت میں جو پارلیمانی وفد ہندوستان آیا تھا اس کا جو خاکہ اڑایا ہے، وہ بس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ’پیام‘ میں شائع ہونے والے چربے ’نقد و نظر‘، ’تبصرے‘، ’ع غ کا کالم‘، ’ہر روز کچھ سوچ‘ یہ ایسے فیچر تھے، جس کو آج بھی پڑھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔ بہرحال پیام کا ہر کالم بے مثال ہوا کرتا تھا۔

قاضی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نوجوان نسل کو تیار کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین ’بزم محب‘ کامریڈ ایسوی ایشن انجمن صحیفہ نگاراں وغیرہ تنظیموں کو سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا۔ حیدر آباد میں ہر ترقی پسند تحریک کو قاضی صاحب کی سرپرستی حاصل ہوا کرتی تھی۔ علم کی دولت اور سماجی شعور کی پختگی سے حیدر آباد کے عوام کو ہم آہنگ کرنے میں قاضی صاحب نے وہ فرض انجام دیا ہے کہ مستقبل کا مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں انھوں نے سیاسی اور سماجی تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کرنے میں جو اپنا فرض انجام دیا تھا، وہ آج تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے، یہی وہ باتیں ہیں جو ان کی روشن خیالی کی گواہی دیتی ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز تھا۔

■

Dr Jahangir Ahmed Khan
Milan Vihar Colony Opp
Axis Bank Civil Line
Rampur-244901 (UP)
Mob:9837764885
Email.: jahangir4885@gmail.com

جوہی بیگم

کرشن چندر بحیثیت ریڈیائی ڈرامانگار

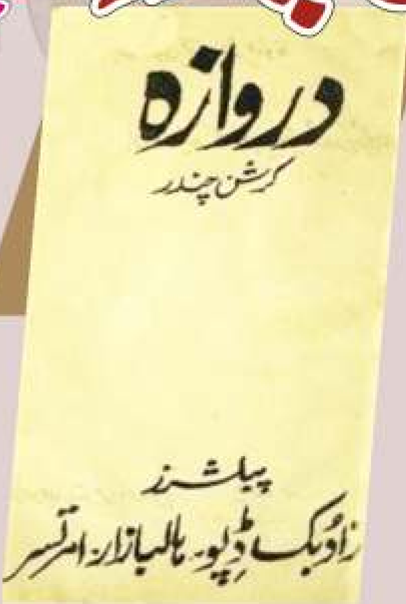
دروازہ

کرشن چندر

پبلشرز

نیا ادارہ بک ڈپو۔ بالبازار۔ امرتسر

ترقی پسند تحریک ایک ایسی ہمہ گیر ادبی تحریک رہی ہے جس نے ادب کے ہر شعبے کو سیراب کیا ہے۔ شاعری ہو کہ ناول نگاری، افسانے ہوں کہ ڈرامے، مزاح ہو کہ تنقید، اس تحریک نے تمام اصناف ادب پر اپنے دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس تحریک نے ادب برائے زندگی کے نظریے کے تحت ادب کا رشتہ زندگی کے حقائق سے استوار کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور زندگی کے بنیادی مسائل بھوک، افلاس، سماجی پستی، ذہنی اور جسمانی غلامی، طبقاتی تصادم، جنسی اور نفسیاتی مسائل کو ادب کے دامن میں جگہ دے کر اسے وسعت بخشی۔ بالخصوص فکشن کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو فکشن یعنی افسانہ، ناول اور ڈرامے اسی کے زیر اثر پروان چڑھے اور رفعت و بلندی سے ہمکنار ہوئے۔ اگر ہم اردو ڈراموں کی بات کریں تو اس تحریک نے ایک سے بڑھ کر ایک جواہر پارے عطا کیے۔ 1936 سے 1947 تک کے زمانے کو اردو ریڈیائی ڈراموں کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ترقی پسند تحریک کے آغاز اور ملک کی آزادی و تقسیم ہند کے واقعات کے نتیجے میں ملک و معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے زیراثر ریڈیائی ڈراموں کی زبان، زمان و مکان اور کردار وغیرہ میں بھی واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ ریڈیائی ڈرامے اب معاشرتی اور طبقاتی زندگی کے ترجمان نظر آنے لگتے ہیں۔ یعنی اس دوران لکھے جانے والے بیشتر ریڈیائی ڈرامے سماج کے گوناگوں مسائل سے اپنا رشتہ استوار کرتے نظر آتے ہیں۔ جاگیردارانہ اور آمرانہ طرز معاشرت، صنف نازک کی زبوں حالی، زمیندارانہ جبر و استبداد، عدم مساوات، طبقاتی کشمکش، اخلاقی و سماجی اقدار کا زوال اس عہد کے ڈراموں کے اہم موضوعات بنتے ہیں۔ اس دوران کئی اہم ترقی پسند ادبا ریڈیائی ڈرامانویسی کی طرف مائل ہوئے، جن میں کرشن چندر کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی، مرزا ادیب، عصمت چغتائی، اوپیندر ناتھ اشک، ڈاکٹر محمد حسن، کرتار سنگھ دگل کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراما نگاروں میں کرشن چندر کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کرشن چندر ان ریڈیائی ڈراما نگاروں میں سے ہیں جن کا ریڈیو سے براہ راست تعلق رہا ہے۔ 1939 میں ان کا تقرر آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بطور اسسٹنٹ ہوا۔ 1940 میں انھیں دہلی منتقل کر دیا گیا جہاں تقریباً ایک برس وہ ڈراما سیکشن کے انچارج کے عہدے پر فائز رہے۔ بعدازاں ان کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا۔ 1942 میں ریڈیو کی ملازمت سے مستعفی ہو کر وہ پونا چلے گئے۔ جہاں شالیمار پکچرز میں اسکرپٹ رائٹر کی ملازمت اختیار کی اور فلم 'من کی جیت' کی اسکرپٹ اور مکالمے تحریر کیے۔ نیشنل تھیٹر کے اشتراک سے 1945 میں اپنے شاہکار ڈراما 'سرائے کے باہر' کی کہانی پر فلم بنائی۔ یہ فلم عوام سے پسندیدگی کی سند نہ حاصل کرسکی لہٰذا کاروباری نقطۂ نظر سے ناکام رہی۔ اس حوصلہ شکن خسارے کو بھی کرشن چندر نے نہایت خندہ روئی سے برداشت کیا، اور ماڈرن تھیٹر کے نام سے ایک فلم کمپنی قائم کی اور 'دل کی آواز' عنوان سے ایک فلم بنائی جس کے ہدایت کار کے فرائض بھی انھوں نے خود انجام دیے یہ فلم بھی معاشی اعتبار سے سود مند ثابت نہ ہوسکی۔

'دروازہ' کرشن چندر کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جو 6 ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس میں 'قاہرہ کی ایک شام'، 'دروازہ'،

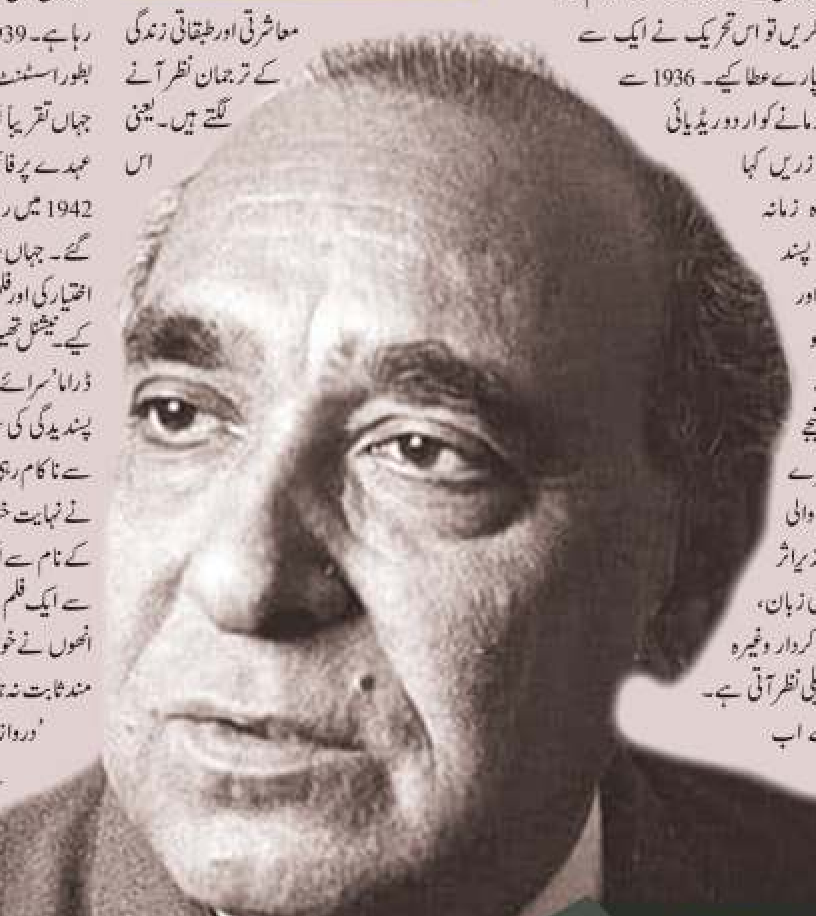

'حجامت'، 'بیکاری'، 'نیل کنٹھ' اور 'سرائے کے باہر' شامل ہیں۔ یہ مجموعہ آزادی سے قبل میاں محمد حنیف نے اردو اکادمی لاہور سے شائع کیا۔ اور دوسری بار آزادی کے بعد آزاد بک ڈپو، ہال بازار امرتسر سے شائع ہوا۔ مذکورہ ڈراموں کے علاوہ بھی کرشن چندر نے متعدد کامیاب ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے ہیں جو ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کیے جاتے رہے ہیں۔ 'ہائیڈروجن بم کے بعد'، 'کتے کی موت'، 'مس بیلا باٹلی والا'، 'کتاب کا کفن'، 'ایک نا فسطائی کی ڈائری'، 'ہمارا مدرس'، 'شکست کے بعد'، 'مچھلی والی'، 'عشق کے بعد' اور 'دروازے کھول دو' کرشن چندر کے مقبول و معروف ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں کے علاوہ کرشن چندر کے کچھ ڈرامے ایسے بھی ہیں جو ان کے افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ مثلاً 'بدصورت راجکماری' (مجموعہ گھونگھٹ میں گوری جلے)، 'ہم سب غلیظ ہیں' (مجموعہ نغمے کی موت)، 'نقش فریادی' (مجموعہ مسکرانے والیاں)، 'ایک روپیہ ایک پھول' (مجموعہ ایک روپیہ ایک پھول) 'منگلک' (مجموعہ نظارے)، 'جھاڑو' (مجموعہ مزاحیہ افسانے) وغیرہ۔

'دروازہ' میں شامل ڈراموں میں 'حجامت' کے علاوہ باقی سب ڈرامے طبع زاد ہیں۔ 'حجامت' روسی فکشن نگار اینڈریو کی ایک ڈرامائی تخلیق سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کو 15 ستمبر 1929 کو لاہور سے نشر کیا گیا۔ اس مجموعے کا پہلا ڈراما 'قاہرہ کی ایک شام' پہلی مرتبہ لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ اس کے بعد یکم مارچ 1941 کو دہلی سے نشر ہوا۔ یہ ڈراما 6 مناظر پر مشتمل ہے۔ حسینہ، پری، مدراسی ویٹر، دیوانہ، ریواز، سپاہی، دوکاندار اور نوکر وغیرہ اس کے اہم کردار ہیں۔ حسینہ اس کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے علاوہ دو اور اہم کردار دیوانہ اور ہندوستانی فوج کے میجر کا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ توجہ کا مستحق دیوانہ کا کردار ہے۔ یہ ایک بھکارن حسینہ کی کہانی ہے جسے ریواز رہا کروا کر اس کی پرورش کرتا ہے، اور اسے رقاصہ بنا دیتا ہے۔ وہ اس پر بہت ظلم ڈھاتا ہے جس کے سبب حسینہ خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوتی ہے۔ میجر جو کہ فرشتہ صفت انسان ہے اسے خودکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ حسینہ سے محبت کرتا ہے لیکن اسے اپنانے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ بحیثیت مجموعی ان کرداروں میں ریواز کا کردار کشمکش اور تذبذب کے سبب سب سے زیادہ متحرک نظر آتا ہے۔ اس کی تغیر پذیر شخصیت اسے اس ڈرامے کا سب سے فعال کردار بنا دیتی ہے۔

'قاہرہ کی ایک شام' سماجی حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے اس کے دلکش اور لطیف مکالمے اور رومان پرور فضا کے سبب اس کا شمار کرشن چندر کے کامیاب ڈراموں میں ہوتا ہے۔ یہ ڈراما کرشن چندر کی فنکارانہ مہارت اور ریڈیو ڈراموں کے لوازم سے ان کی واقفیت کی دلیل ہے۔

'دروازہ' اس مجموعے کا دوسرا ڈراما ہے جو پہلے ریڈیو پر نشر کیا گیا اور بعد ازاں 17 اگست 1940 کو پہلی مرتبہ دہلی میں اسٹیج بھی ہوا۔ عصری زندگی کے مسائل پر مبنی یہ ایک ایکٹ کا ڈراما ہے جس کے اہم کرداروں میں ماں، شانتا، کانتا، مکان مالک، ونود اور اجنبی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کانتا اور شانتا ایک اندھی ماں کی دو بیٹیاں ہیں جو زبوں حالی کا شکار ہیں۔ اپنی غربت کے سبب مکان کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر ہیں، اور پچھلے تین مہینے سے کرایا نہیں ادا کر پائی ہیں۔ ونود ان کا منھ بولا بھائی ہے۔ راکھی کے دن دونوں بہنیں ونود کو راکھی باندھنے کے لیے منتظر رہتی ہیں، لیکن وہ نہیں آتا۔ بالآخر وہ اداس ہو کر سونے چلی جاتی ہیں۔ اتفاق سے اسی رات مکان مالک مکان کے کرائے کا تقاضا کرتا ہے، اور نہ ملنے کی صورت میں انھیں متنبہ کرتا ہے، کہ اگر تین دن کے اندر کرایہ ادا نہ کیا تو مکان خالی کروالے گا۔ اس مسئلے کا حل تلاش کرتے ہوئے کانتا کے قدم بہک جاتے ہیں، اور وہ جسم فروشی کا فیصلہ کرتی ہے۔ شانتا اسے اس فعل بد سے باز رکھنے کے لیے سمجھاتی ہے۔ اس موضوع پر دونوں بہنوں میں بحث مباحثہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی آوازیں سن کر ایک اجنبی ان کے دروازے پر رکتا ہے اور دستک دیتا ہے۔ وہ ان دونوں بہنوں سے بحث کی وجہ دریافت کرتا ہے تو وہ کہتی ہیں کہ ان کا منھ بولا بھائی ان سے راکھی بندھوانے نہیں آیا۔ وہ ان سے راکھی بندھواتا ہے اور ایک پاؤنڈ تحفے میں دیتا ہے۔ ان کی گفتگو کے دوران یہ راز افشاں ہوتا ہے وہ اجنبی درحقیقت ان کا گمشدہ بھائی ہے۔

'بیکاری' بھی ایک ایکٹ کا ڈراما ہے جو اولاً اکتوبر 1937 میں لاہور سے نشر ہوا۔ بھیالال، مسعود، اظہر، شیام سندر اور سپاہی وغیرہ اس ڈرامے کے اہم کردار ہیں۔ یہ ڈراما بے روزگاری کے مسئلے پر مبنی ہے۔ چنانچہ اس کے زیادہ تر کردار ایسے نوجوان ہیں جو بے روزگار ہیں اور ہمیشہ خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہوٹل کھولنا، اخبار نکالنا اور پیسوں کی ضرورت پڑنے پر کسی جاہل دولت مند شخص کی بیٹی سے شادی کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ رشوت ستانی، طبقاتی کشمکش جیسے مسائل کو بھی اس ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔

'نیل کنٹھ' کرشن چندر نے یہ ڈراما 1940 میں تحریر کیا۔ 24 فروری 1941 کو دہلی سے نشر کیا گیا۔ کرشن چندر کا یہ ڈراما ہندو میتھالوجی پر مبنی ہے، جس کے توسط سے انھوں نے اپنے عہد کی سماجی زبوں حالی، مہاجنی تہذیب کے جبر، اور مذہبی اجارہ داروں کی ابلہ فریبیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ بھگوان شیو شنکر، دیوی پاروتی، پجاری، بدمعاش جیب کترا اور ساہوکار اس کے اہم کردار ہیں۔ بھگوان شیو شنکر اس دنیا میں آتے ہیں۔ عوام کی زبوں حالی، ساہوکاروں کی لوٹ کھسوٹ، مذہب کو ڈھال بنا کر بھولے بھالے لوگوں کا استحصال دیکھ کر بھگوان شیو شنکر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں انسانوں کی منافقانہ روش کی پیشکش کے ذریعے کرشن چندر نے تضاد کی فضا پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین کو اس میں ایپک تھیٹر کی مماثلت نظر آتی ہے۔

(ملاحظہ ہو ڈاکٹر ظہور الدین: حقیقت نگاری اور اردو ڈراما بحوالہ ڈاکٹر شہناز صبیح: اردو ڈراما آزادی کے بعد ص 13)

جب کہ پروفیسر زاہدہ زیدی لکھتی ہیں:

''میرے خیال میں اس ڈرامے میں کرشن چندر کا فنی رویہ بریخت کے ایپک تھیٹر سے بہت مختلف ہے۔ اور ''نیک عورت'' سے اس کی مماثلت بس برائے نام ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے فنی تصور میں کچھ جدت ضرور ہے۔ اور یہاں ڈراما نگار نے اپنے سماجی وژن کی ڈرامائی تجسیم کے لیے ایک موزوں پیکر تلاش کرلیا ہے۔''

(اردو ڈراما آزادی کے بعد از پروفیسر زاہدہ زیدی (رموز فکر وفن) بحوالہ ڈاکٹر شہناز صبیح: اردو ڈراما آزادی کے بعد ص 16)

'سرائے کے باہر' پہلی مرتبہ ماہنامہ ایشیا پونا میں ستمبر 1943 میں شائع ہوا۔ بعد ازاں لاہور ریڈیو اسٹیشن کے علاوہ ملک بھر میں متعدد ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتا رہا۔ اپنے فنی رکھ رکھاؤ اور موضوع کی سنجیدگی کی مناسبت سے اس ڈرامے کا شمار کرشن چندر کے شاہکار ڈراموں میں ہوتا ہے۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی:

''ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں کرشن چندر نے کچھ ریڈیائی ڈرامے لکھے تھے جن کا مجموعہ دروازے کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ کا سب سے کامیاب ڈراما 'سرائے کے باہر' ہے۔''

(خلیل الرحمن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص 217)

منی (ایک نوجوان بھکارن)، اندھا بھکاری (منی کا باپ)، بھکارن (منی کی ماں) جانی لنگڑا (ایک عیار بھیک منگا)، بی بی (سرائے کی ملازمہ) اور شاعر (لوگوں کو اپنی شاعری سنا کر پیسہ مانگنے والا ایک نوجوان) اس کے اہم کردار ہیں۔ ہندوستان کی غیر مساویانہ طبقاتی تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ تصادم کی حقیقی تصویر پیش کرنے والا یہ ڈراما اردو کے چند اہم ترین حقیقت پسند ڈراموں

> **کرشن چندر کے ڈراموں کے مذکورہ فنی اور موضوعاتی تجزیے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرشن چندر نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے ریڈیائی ڈرامے کو بام عروج پر پہنچایا اور اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی، ساتھ ہی ساتھ زندگی کے مختلف النوع مسائل جیسے سماجی نابرابری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، حقوق نسواں کی خلاف ورزی، جہالت اور فرسودگی، ضعیف الاعتقادی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے زوال کی حقیقی عکاسی کرکے ملک و معاشرے کی اصلاح کا قابل قدر فریضہ بھی انجام دیا۔**

میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں کرشن چندر کی سماجی حقیقت نگاری اور منظر نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ڈراما ترگنیف کے ڈراما 'رئیسوں کا اڈا' کے مماثل نظر آتا ہے۔ وہیں دوسری طرف سماجی حقیقت نگاری اور حقیقت پسندی کرشن چندر کو ابسن (A dolls house and the Ghost) کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔ غربت وافلاس کس طرح انسان کی زندگی کو مصائب کا مجموعہ بناتی ہے اور اس کو کس طرح آلام کے بھنور میں غلطاں رکھتی ہے، اس کی جاندار عکاسی اس ڈرامے میں کی گئی ہے۔

بظاہر اس کا پلاٹ ایک پہاڑی قصبے کی سرائے کے اردگرد گھومتا نظر آتا ہے لیکن بین السطور یہ عالمگیر سطح پر ہونے والے طبقاتی جبر و تصادم کی حقیقی عکاسی کا حامل ہے۔ سرمایہ دارانہ جبر و استحصال اس ڈرامے کا مرکزی موضوع ہے۔ منی اپنی اور اپنے والدین کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے جسم فروشی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ سرائے کے اندر اس پر ڈھائے جانے والے مظالم صرف منی کی کہانی نہیں کہتے بلکہ اس کے ذریعے کرشن چندر اس ناقص معاشرتی نظام کے تضادات کو پیش کرتے ہیں جس کی لگام زمینداروں، سرمایہ داروں، امرا اور روسا کے ہاتھ میں ہے۔ منی کا کردار درحقیقت سرمایہ دارانہ اور معاشرتی جبر و استبداد کے شکار، زخم خوردہ، فلاکت زدہ طبقے کی علامت ہے اور اس کی عصمت سے کھیلنے والے وحشی چند افراد نہ ہوکر استحصال کرنے والے طبقے کے نمائندہ ہیں۔ جانی لنگڑا اور شاعر کے کردار معاشرے کی دوغلی ذہنیت کے غماز ہیں۔ شاعر انقلاب کا خواہاں ہے لیکن محض تصوراتی سطح پر۔ جانی لنگڑا تخریب پسند ہے لیکن فقط ذہنی طور سے۔ یعنی یہ دونوں کردار بے عملی، کاہلی اور بے حسی کا شکار ہیں۔ منی کا کردار اس ڈرامے کا سب سے فعال، متحرک اور ارتقا پذیر کردار ہے۔ ذہنی کشمکش میں مبتلا یہ کردار ہر لمحہ خیر و شر کے تصادم سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ ایک طرف زندگی کے بنیادی مطالبات کی حصولیابی کے لیے وہ جسم فروشی جیسے کریہہ فعل پر آمادہ نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف اس کی فطری معصومیت اور حالات کی ناچاقی اسے بے قصور ثابت کرتی ہے۔ اس ڈرامے کا اختتام عینیت پسندی پر نہ ہوکر حقیقی طور پر ہوتا ہے۔ ترقی پسند ڈراما نویس ہونے کے ناتے کرشن چندر نے اس ڈرامے کو مثالیت پسندی کے ملمع سے آزاد رکھا ہے۔ وہ چاہتے تو شاعر یا جانی لنگڑا کو منی کا رفیق حیات بنا سکتے تھے لیکن اس کے برعکس انھوں نے منی کو تنہا ہی رکھا، جو کہ عین فطری ہے۔ منی جیسی غریب بھکارن کے نصیب میں کسی کے گھر کی زینت بننا کہاں؟ اپنی انھی خصوصیات کے سبب کرشن چندر کا یہ ڈراما اردو کے چند اہم ترین حقیقت پسندانہ ریڈیائی ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مجموعے 'دروازہ' میں شامل ڈراموں کے علاوہ کرشن چندر کے متعدد ریڈیائی ڈرامے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے آج بھی ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ڈرامے اسٹیج کے لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند تبدیلیوں کے ساتھ اسٹیج بھی کیے جاتے رہے ہیں۔ ڈراما 'مس بیلا باٹلی والا' میں کرشن چندر نے بمبئی کی زندگی کی حقیقی عکاسی کی ہے۔ اس میں انھوں نے بمبئی کی مصنوعی اور کھوکھلی زندگی کو پیش کیا ہے۔ 'کتے کی موت' میں سماجی حقیقت نگاری کو طنزیہ مکالموں کے ذریعے مزاحیہ پیکر عطا کرکے نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ 'ہائیڈروجن بم کے بعد' ایک ایسا ڈراما ہے جس میں صنعتی نظام کے تحت سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ، انسانی قدروں کے زوال کی کہانی کو نشتریت آمیز مکالموں کے ذریعے جانوروں کی زبانی پیش کیا گیا ہے۔

'ہمارا مدرسہ' اور 'مچھلی والی' کرشن چندر کے یک بابی ڈرامے ہیں۔ 'ہمارا مدرسہ' کا موضوع تقسیم ہند کے بعد طلبا کے ذہن و دل پر ثبت ہونے والے اثرات ہیں۔ اگرچہ اس کا موضوع سنجیدہ ہے لیکن اس میں کرشن چندر نے مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے۔ 'مچھلی والی' ڈراما تکنیک کے نقطۂ نظر سے خالص ریڈیائی ڈراما کے معیار پر پورا اترتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں حرکت و عمل کے بجائے مکالمے سے پیدا ہونے والے صوتی آہنگ پر توجہ دی گئی ہے۔ 'عشق کے بعد' ایک ایسا ڈراما ہے جس میں عہد حاضر کے عصری مسائل اور معاشرتی زندگی کو قدیم روایتی عاشق ومعشوق رومیو۔جولیٹ، قیس ولیلیٰ، ہیر۔رانجھا کے قالب میں اتار کر کرشن چندر نے ماضی اور حال کا نہ صرف دلچسپ موازنہ پیش کیا ہے بلکہ وقت و حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فلسفے، فکر وخیال، جذبات واحساسات اور ضروریات زندگی کے متغیر تقاضوں کو بھی نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ 'شکست کے بعد' آٹھ مناظر پر مبنی دلچسپ ڈراما ہے۔ یہ ڈراما جون اسٹین باک (John Stean Bak) کے مشہور ناول 'مون از ڈاؤن' (Moon is Down) سے ماخوذ ہے، چونکہ مون از ڈاؤن کا موضوع دوسری جنگ عظیم ہے لہٰذا اس ڈرامے کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر نے سیموئیل بکیٹ (Samuel Bekett) کے نوبل انعام یافتہ ڈراما 'ویٹنگ فار گوڈوٹ' (Waiting for Godot) کا ترجمہ 'انتظار کے قیدی' کے عنوان سے کیا۔ سیموئیل بکیٹ کا یہ ڈراما ایبسرڈ تھیٹر کی کا اولین اور بہترین نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ 'انتظار کا قیدی' تاثر کے لحاظ سے 'ویٹنگ فار گوڈوٹ' کے بالمقابل کمزور نظر آتا ہے تاہم اس کے کامیاب ترجمہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

کرشن چندر اپنے اسلوب اور عشقیہ موضوعات کی پیش کش میں ایک رومان پسند ادیب نظر آتے ہیں، اور جب ان کی یہی رومانیت پختگی کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو حقیقت نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے ڈرامے روایتی ڈراموں سے ہوتے ہوئے میلو ڈراما، ایبسرڈ تھیٹر کی تکنیک تک کا سفر طے کرتے ہیں۔ ان کے بعض ڈراموں میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، ڈکشن، قصہ پن اور موسیقی وغیرہ کا التزام ہوتا ہے، تو بعض سمبل ازم اور بعض ایکسپریشن ازم کے عمدہ نمونے ہیں۔ کرشن چندر کے ڈراموں کے مذکورہ فنی اور موضوعاتی تجزیے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرشن چندر نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے ریڈیائی ڈرامے کو بام عروج پر پہنچایا اور اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی، ساتھ ہی ساتھ زندگی کے مختلف النوع مسائل جیسے سماجی نابرابری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، حقوق نسواں کی خلاف ورزی، جہالت اور فرسودگی، ضعیف الاعتقادی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے زوال کی حقیقی عکاسی کرکے ملک ومعاشرے کی اصلاح کا قابل قدر فریضہ بھی انجام دیا۔

■

Dr. Joohi Begum
59C/67C, South Malaka
Allahabad.211003
Ph.:7985982665

بیسویں صدی کا افسانوی ادب اور ہندوستانی سماج

ارشد اقبال

بیسویں صدی کے ابتدائی چالیس پینتالیس سال کی یہ مختصر ترین انداز میں مختلف تحریکوں کی تاریخ ہے، جس سے ہمیں ملک کے معاشی، سیاسی، تعلیمی اور سماجی حالات وکیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

جس دور کی یہ سماجی، سیاسی اور معاشی کہانی بیان کی گئی ہے، اس میں مختصر افسانہ نگاری کے واضح میلانات سامنے آتے ہیں۔ ایک رومانیت وتخیل پرستی کا، جس کی نمائندگی سجاد حیدر اور نیاز فتح پوری وغیرہ کر رہے تھے۔ دوسرا حقیقت نگاری اور اصلاح پسندی کا، جس کے امام پریم چند تھے۔

پریم چند کے ذریعے مختصر افسانہ میں عام آدمی کے دکھ درد، رہن سہن، سماجی تعلقات معاشی کشمکش، مذہبی اور سماجی رسم و رواج، واقعات اور حقائق کے پردے میں قاری کی رسائی ہوئی اس کے علاوہ سماج کی فلاح و بہبود کے نقوش، منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے پیرائے میں عوام تک پہنچ کر مقبولیت حاصل کر سکے۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا دور دراصل ہندوستان میں قومی بیداری کا دور تھا۔ اس لیے ان کے افسانوں میں ساری کیفیات، زمانے کے حالات اور تحریکوں کے مقاصد نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے بعد اردو افسانے کو سب سے زیادہ متاثر کرنے میں افسانوں کا مجموعہ 'انگارے' کا ہاتھ رہا ہے۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کی کہانیاں شامل تھیں۔ متذکرہ مجموعے کے بعد اردو افسانے میں بیسوی صدی کے پیچیدہ مسائل اور شہری زندگی کی تمام نفسیاتی گتھیاں راہ پانے لگیں۔ مغربی ادب سے متاثر ہوکر افسانے کی تکنیک میں بہت سے تجربے ہوئے، اس میں ذہنی عناصر کی بالادستی پریم چند کے بعد کی پیداوار ہے۔ بعض افسانہ طرازوں نے فرائڈ کا اثر قبول کیا اور جنسی مسائل کو اپنے فن پاروں کا محور بنایا۔

'انگارے' میں شامل افسانے فنی اعتبار سے خام ضرور ہیں لیکن ان افسانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان افسانہ نگاروں نے سماج کے اہم اور پیچیدہ مسائل کو فن کی حدود میں لانے کی پہل کی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے تعلق سے پروفیسر قمر رئیس نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''ایک طرف اردو افسانہ کی پرسکون دنیا میں ایک دھماکہ تھی تو دوسری طرف ان حلقوں اور طبقوں میں غیظ و غضب کی آگ دہک اٹھی جن کے مفاد اور روایتی وقار کو اس سے ضرب پہنچی تھی۔ اس مجموعہ کی کہانیوں میں جو گستاخانہ بیباکی، برہمی، تلخی اور سرکشی تھی، وہ ایک نئی نسل، نئی طرز فکر اور نئے تصورفن کی آمد کا اعلان تھا۔''

پریم چند اور 'انگارے' کے بعد ترقی پسند ادب کی تحریک نے بھی اردو افسانے کو بہت متاثر کیا۔ 1936 میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں ایک اہم سماجی ضرورت نے باقاعدہ ادبی تحریک کی شکل اختیار کی جو یوروپ اور انگلستان کے انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع کی گئی تھی اور یہی تحریک ادب میں سیاسی جذبوں کی بانی کہی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کے بعد افسانوں میں نئے معاشی اور سیاسی مسائل پیش کیے گئے۔

پریم چند کے افسانوں کا مخزن دیہات میں بس رہے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی سیرت، سچائی، ایمانداری، بے ایمانی، غربت، کاشتکار، زمیندار، پولیس اور دوسرے سرکاری عملے کا عتاب اور کبھی قحط سے سامنا۔ اس کے علاوہ ہندو سماج کے رسم و رواج، عادات واطوار، عقائد اسلاف

ایک طرف اردو افسانہ کی پر سکون دنیا میں ایک دھماکہ تھی تو دوسری طرف ان حلقوں اور طبقوں میں غیظ و غضب کی آگ دھک اٹھی جن کے مفاد اور روایتی وقار کو اس سے ضرب پہنچی تھی. اس مجموعہ کی کہانیوں میں جو گستاخانہ بیباکی، برھمی، تلخی اور سرکشی تھی، وہ ایک نئی نسل، نئی طرز فکر اور نئے تصور فن کی آمد کا اعلان تھا.

کے کارنامے اور سماج کے اصلاحی نظریے یہ سب ان کے افسانوں میں عام طور پر موجود ہیں۔

پریم چند کے اثرات سے اردو میں اصلاحی افسانوں کی جو روایت پروان چڑھ رہی تھی اس سے سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی خاص طور پر متاثر ہوئے۔

متذکرہ فن کاروں نے اصلاحی نقطۂ نظر کو وسعت دی اور افسانے میں حقیقت نگاری کا عنصر بھی شامل کیا۔ علی عباس حسینی نے ہندو مسلم فرقہ واریت کے خلاف کئی کامیاب افسانے لکھے انھوں نے دیہی زندگی کے مسائل کو بھی اپنا خاص موضوع بنایا۔

سہیل عظیم آبادی نے بہار کے دیہاتوں میں بس رہی بے چین و بے بس زندگی کو پیش کیا۔ وہاں کے کسانوں کی دکھ بھری زندگی، سیلاب اور زلزلے کی تباہی اور معاشی استحصال، ان کے ابتدائی افسانوں کا محور ہیں۔

سدرشن کے افسانوں کا محور دیہی زندگی بھی ہے اور شہری افراد کی حالت کا نقشہ بھی۔ وہ عام طور پر غریب اور امیر کی زندگی کا موازنہ کرتے ہیں۔ اعظم کریوی کے افسانوں میں معاشرت کے طریقے، پنچایتوں اور بازاروں

کی گفتگو کے مناظر، آپسی تعلقات اوران کا اثر، زمینداروں اور رعایا کے تعلقات، حکام اور ان کے عام لوگوں سے برتاؤ جیسے دلچسپ موضوع ہیں۔

حیات اللہ انصاری کسی ایک ماحول میں خودکو محدود نہیں رکھتے، انھوں نے افسانے کوفکری نقطۂ نظر دیا ہے۔ ان کے افسانوں پر سیاسی نظریوں، رویوں اور گاندھی جی کے فلسفے کا اثر پایا جاتا ہے۔ کرشن چندر کو اپنے دلچسپ بیان کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں میں خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ سماج کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی بھی ہے۔ ان کے یہاں سرمایہ دار اور ساہوکار کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے لیکن اکثر وہ کہانی بیان کرتے وقت کہیں کہیں بھٹک بھی جاتے ہیں، جس کی وجہ سے غیر ضروری اذکار وخیالات افسانے میں خود بخود آنے شروع ہوجاتے ہیں لیکن اس سے ان کے افسانوں کی اہمیت پر کوئی اثرنہیں پڑتا۔

راجندر سنگھ بیدی کے یہاں جذباتیت ہے۔ حالانکہ ان کی جذباتیت میں گہرائی اور سکون ہے۔ انھوں نے سماجی اور مذہبی زندگی کا مشاہدہ بڑی گہرائی سے کیا۔ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور روزمرہ کا ماحول ملتا ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کے مادّی پہلو سے کہیں زیادہ نفسیاتی تجزیے پر زور دیا ہے۔

سعادت حسن منٹو پر روسی ادیبوں کا بڑا اثر رہا ہے۔ منٹو نے چیخوف، گوگول، ترگنیف اور گورکی کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ بالخصوص سماج کے اُس طبقے کو اپنے افسانوں کا مرکز بنایا جسے طوائف کہتے ہیں۔ منٹو نے سماج کے ٹھیکیداروں پر جتنے پتھر برسائے ہیں، شاید وہ جرأت کسی دوسرے افسانہ نگار میں نہیں تھی۔ عصمت چغتائی نے خواتین کے مسائل کو اپنے افسانوں کا مرکز بنایا، گھریلو زندگی اور اس زندگی کے مسائل کو نمایاں جگہ دی۔ اخترحسین رائے پوری کی نظر بیماروں، کمزوروں، بے کسوں فقیروں اور ہراس زدہ چہروں پر جاتی ہے، جنھیں سماج کا ناسور تصور کیا جاتا ہے۔ اختر انصاری سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب بھی دنیا میں ظلم و بربریت، بے انصافی، خود غرضی اور مکاری موجود ہے۔ اس لیے انسانیت کا جسم انگنت بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اُوپندر ناتھ اشک کے افسانوں میں نچلے اور درمیانی طبقے کی معاشی زندگی، جنسی عدم مساوات، تشنگی اور بے بسی کی بہت اچھی عکاسی ملتی ہے۔

اختر اورینوی نے بعض الجھے ہوئے مسائل کو اپنا موضوع بنایا، نچلے طبقے کی معاشی مشکلات، انسانی اقدار اور بھوک کا تصادم، قرض وسود، جھگڑا فساد اور مقدمے بازی، خاندانی منافرت، زمین دار اور کاشتکار، رکشہ کھینچنے والے اور مزدوروں کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی دیہی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ قاسمی نے بین الاقوامی مسائل پر بھی قلم اٹھایا اور قومی مسائل پر بھی۔ دیوندر ستیارتھی کے کامیاب افسانوں میں بنگال کی معاشی تباہی کا دردناک المیہ ہے۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا موضوع سیاسی ہے۔ مہندر ناتھ کے یہاں نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں کا عکس ملتا ہے۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں اودھ کے متوسط طبقے کی زندگی اور خواتین کے مسائل بڑی خوبی سے آئے ہیں۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی نے بعض اہم مسائل پر افسانے تخلیق کیے ہیں۔

متذکرہ تمام قلم کے شہ سوار آزادی سے قبل مقبول عام ہو چکے تھے۔ ان کے افسانوں میں ٹھہراؤ اور نظریوں کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور کی افسانہ نگاری میں چند رجحانات بڑے واضح اور نمایاں ہیں۔ مثلاً ادیب واقعات پر تو پوری توجہ مرکوز کرتے ہی ہیں، علاوہ ازیں کرداروں کو اپنے مشاہدات وتجربات کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری بیدی، منٹو، اختر انصاری اور عصمت کے بہت سے افسانوں میں کرداروں کی کشش، واقعات کی دل نشینی سے کہیں زیادہ نمایاں ہیں۔

انسان کے عمل اور ردعمل کے نفسیاتی محرکات کا سراغ لگانے والے افسانہ نگاروں نے زندگی کے معاشی پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں بڑا اہم مقام دیا ہے، مظلوم کی حمایت کو اپنا مقصد سمجھا ہے۔ ان کے کرداروں میں مزدور اور کسان کے علاوہ کلرک طوائف، عورت اور مظلوم ہیں ظالموں کی صف میں سامراجی حاکم، ساہوکار، ڈھونگ رچانے والے مذہبی رہنما اور کٹھ پتلی بنے سیاسی لیڈر بھی۔

اردو افسانہ نگاروں تک کارل مارکس کے معاشی نظریات اور فرائڈ کے جنسی خیالات مغربی افسانوں کے ذریعے بھی پہنچے اور انھوں نے اس انداز کو قبول کرلیا۔ بعض نے سوچ سمجھ کر اپنے مشاہدات اور مطالعات کی بنیاد پر انھیں اپنے افسانوں میں جگہ دی تو بعض نے اس کی اندھی تقلید میں ان نظریات کو ہی اپنے لیے بہتر سمجھا۔ اس طرح اُس دور کی افسانہ نگاری کارل مارکس یا فرائڈ سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔

اُس دور سے پہلے فن کی ہمہ گیری نظر نہیں آتی جو اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ بیباک انداز بیان، حق اور مظلوم کی حمایت میں کہیں کہیں بے دردی اور بے رحمی کا انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔ بیان میں نئے نئے تجربے کے علاوہ بعض ایسے ہیں جن میں مغرب کی جدت اور مشرق کی روایت ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ احمد علی، حسن عسکری، کرشن چندر، عصمت اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے اسی جدت اور روایت کی حسین آمیزش کا نمونہ ہیں۔ علی احمد کے افسانے 'ہماری گلی' اور 'میرا کمرہ' کرشن چندر کا 'دوفرلانگ لمبی سڑک' منٹو کا 'نیا قانون' راجندر سنگھ بیدی کا 'گرم کوٹ' عصمت کا 'دوزخی' اور حیات اللہ انصاری کا 'آخری کوشش' میں موضوع اور فن کے تمام عناصر یکجا نظر آتے ہیں جو اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اسی زمانے میں بعض افسانے ایسے بھی تخلیق ہوئے، جن میں اعتدال وتوازن کا فقدان ہے مثلاً 'جنس' کوافسانے کا موضوع بناتے وقت احتیاط و توازن کی کمی کی وجہ سے بہت سے افسانوں میں لذت کا غلبہ اور عریانیت واضح ہوگئی ہے۔ اسی طرح بعض افسانے صرف اس خیال کے تحت لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والا یک دم اچھل پڑے یا تلملا جائے، خواہ کسی کے جذبات ہی کیوں نہ مجروح ہوں۔

اُس دور میں ایسے فنکار بھی ابھر کر سامنے آئے جن کے فن میں ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ ملتا ہے۔ اعتدال و توازن اور موضوع میں وسعت پائی جاتی ہے۔ یہ فنکار زندگی، فن اور شخصیت کے امتزاج کے عکاس ہیں۔ ان کے فن پاروں میں زندگی کی معمولی سی تبدیلی کی تصویر ملتی ہے اور انسان کے دل کے چھوٹے بڑے راز کی غمازی نمایاں ہے۔ غلام عباس، ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، بلونت سنگھ، شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، تبسم سلیم، صحالہ عابد حسین، مہندر ناتھ، آغا بابر وغیرہ ایسے ہی افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

آج افسانہ نگاروں کی تمام تر توجہ اسی ماحول اور موضوع پر افسانے لکھنے کی جانب مرکوز نظر آتی ہے، جن سے وہ مکمل طور پر واقف ہیں۔ وہ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو بھی تبدیل کرتے جاتے ہیں مگر ان تبدیلیوں سے قاری کو کوئی دھچکا نہیں لگتا کیونکہ افسانہ نگار فرد کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں سے غافل نظر نہیں آتا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انھیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے جن سے فرد، بحیثیت سماج کی، ایک اکائی کے دوچار ہے۔

احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری اور دیوندر ستیارتھی کے افسانوں کا قاری پنجاب، بہار، اترپردیش، ہندوستان کے مختلف علاقوں کے بے شمار مسائل جان لیتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، علی احمد، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کے افسانے پڑھ کر ممبئی، دہلی، لاہور اور کشمیر کی سیر ہوجاتی ہے۔ ان سبھی جگہوں کی اپنی الگ تہذیب ہے، اپنے مسائل ہیں۔ ان جگہوں پر

مختلف مذاہب، مختلف طبقات اور مختلف پیشوں میں مہارت رکھنے والے عوام ہیں۔ان کی تصاویر بیدی، عصمت اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں ملتی ہیں۔

مقامی مسائل کے علاوہ ہماری زندگی کو سیاست نے بھی بہت متاثر کیا ہے۔ نہ صرف ملکی سیاست بلکہ بین الاقوامی سیاست نے بھی بہت سی الجھنیں پیدا کی ہیں۔ اس کشمکش کی عکاسی کرشن چندر کے بہت سے افسانوں سے ہوتی ہے، جن میں کسان، رشوت، فصل، روزگار کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں، سیٹھ، کلرک، جنگ، سامراج، فاشزم اور بین الاقوامی معاشی کشمکش بھی کچھ بکھرے ہوئے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں طوائف کی زندگی کے علاوہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ جیل خانے، سیاسی جلسوں پر برستی گولیاں، ایک نئے قانون کی تلاش انقلاب کے نعرے، مزدور اور کسان کی بے بسی فلمی کمپنیاں اور ان کے چمکیلے ماحول کے پیچھے گناہوں کی سیاہی جیسے موضوعات بھی ملتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے پنجاب کے دیہاتوں کے رومانی منظر کو ہی نہیں پیش کرتے بلکہ خلافت تحریک، فوجی بھرتی اور انقلاب زندہ باد کے نعروں کی گونج میں سیاسی اور معاشی کشمکش کی آئینہ داری بھی ملتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو افسانے میں اس روش یعنی سماج کے ماحول کی عکاسی کو کچھ لوگوں نے ادب کے لیے مضر سمجھا، زندگی سے بھرپور ادب، وقت اور حالات کی دھڑکنوں سے بھرپور ادب کو ادبیت کا بھٹکنا تصور کیا۔ اس ضمن میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''ادب کا براہ راست یا بالواسطہ یہ کام نہیں ہے کہ یہ دنیا کی کثیر سے کثیر انسانی آبادی کو پیٹ بھر کھانا ملنے میں مدد کرے اس کام کے لیے انسان کے پاس دوسرے ذرائع موجود ہیں اور وہ ان ذریعوں سے مصرف لیتا اور لے سکتا ہے۔ ادب اور سیاسیات و معاشیات کے میدان متحد نہیں ہیں۔''

دراصل یہ اعتراض کہ ادب میں سیاست کا غلبہ، ادب کے لیے صحت مند نہیں ہے۔ یہ دو وجوہ سے پیدا ہوا کہ اس زمانے میں بہت سے افسانے اس انداز سے لکھے گئے کہ وہ افسانے کے بجائے سیاسی نعرہ بن گئے جن کی وجہ سے ان کی ادبی حیثیت مجروح ہوگئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ بیشتر ادیب عملی سیاست سے وابستہ تھے، جس کی وجہ سے یہ بات قدرتی تھی کہ ان ادیبوں کے سیاسی خیالات، ان کے افسانوں میں براہ راست جگہ پانے لگے۔

اب یہاں مختصر طور پر ان افسانہ نگاروں کا تذکرہ کرنا ہوگا، جن پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور ترقی پسند تحریک کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ حالانکہ ان فنکاروں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن یہاں چند ایسے افسانہ نگاروں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اپنے انداز، فن کی وسعت اور موضوعات کی ہمہ گیری کی وجہ سے بہت مشہور و مقبول ہوئے اور ترقی پسند ادب میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

پریم چند کو اردو میں جدید افسانہ نگاری کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاروں کو ایک سنجیدہ و سبک روگمر دیرپا بغاوت کی راہ دکھائی۔ انھوں نے انسانی فطرت کی پوشیدہ تہوں تک رسائی کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ماضی کی روایت کو زیادہ حسین اور بامعنی بنا کر انھوں نے فن کی بھی خدمت کی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر کے پریم چند نے بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں کو اندھیرے میں بھٹکنے سے بچالیا۔ ان کی وجہ سے ترقی پسند افسانے کو حقیقت نگاری کی وہ صلاحیت حاصل ہوئی جس کی وجہ سے اردو افسانہ ترقی پسند ادب کی سب سے نمایاں شاخ بن گیا۔

پریم چند نے مختصر افسانے کو زندگی کا ترجمان بنانے کی جو بنیاد ڈالی تھی، اس کا سب سے نمایاں اثر علی عباس حسینی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی اور سدرشن پر پڑا۔ علی عباس حسینی کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ ان کی کہانی میں انسانی معصومیت اور خلوص ہے۔ انھیں زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کا رجحان اصلاحی، انسان دوستی اور قوم پرستی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانے 'آم کا پھل'، 'کیا کیا جائے' اور 'بھوت' انقلابی حقیقت نگاری کے بہترین نمونے ہیں جبکہ افسانہ 'مسیحا' قحط بنگال سے متاثر ہو کر تخلیق کیا گیا ہے۔

اعظم کریوی کے افسانوں کا پس منظر بھی دیہات ہے۔ ان کے افسانوں میں سیاست بھی نظر آتی ہے اور دیہات کی رومان انگیز فضا اور وہاں کے باشندوں کی معصوم رومانی فطرت بھی۔

سدرشن نے بھی دیہی زندگی کے معاشرتی پہلو کو اپنا خاص موضوع بنایا، اس طرح ان کا مقصد دیہات کی معاشرتی زندگی کی مصوری ہے۔ دیہی معیشت، سیاست اور سرمایہ دارانہ نظام و مزدور کی بے بسی سہیل عظیم آبادی کے خاص موضوع ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے مشاہدے اور احساس کی شدت نمایاں ہے۔

متذکرہ فنکاروں نے زندگی کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا، سماج کے نشیب و فراز کو سمجھا اور اس کے تمام اجزا کو افسانوں میں پیش کر کے انھیں کو سماجی اور انفرادی مسائل کا آئینہ دار بنا دیا لیکن جن افسانہ نگاروں کو ترقی پسند تحریک نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جنھوں نے اس فن کے میدان میں اپنی جگہ تقریباً اسی وقت مستحکم کی، جب اس تحریک کی بنیاد پڑی، اُن میں اپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد علی، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری اور اختر اورینوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ حالانکہ ان میں کئی فنکار ایسے بھی تھے جو ترقی پسند تحریک شروع ہونے سے قبل ہی سرگرم عمل تھے مگر ان کی شہرت کا لگ بھگ وہی زمانہ ہے جو اس تحریک کا ہے۔ ان میں چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے شدت کے ساتھ اس تحریک سے خود کو وابستہ کرلیا تھا۔

1936 کے بعد اردو مختصر افسانہ نگاروں کی جو نئی پود پروان چڑھی، اس میں جو مقبولیت کرشن چندر کو حاصل ہوئی، وہ پریم چند کے بعد کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ کرشن چندر نے اپنا تخلیقی سفر رومانویت سے شروع کیا پھر اس میں زندگی کی تلخیاں شامل ہوگئیں۔ ان کے افسانوں کا ہیرو تباہ حال، مظلوم اور لٹا ہوا انسان ہے۔ ان کا نقطۂ نظر انسان سے ہمدردی، اس کی خامیوں پر طنز اور اس کے مسائل کی تشریح ہے۔ کرشن چندر کے مزدور عورتوں پر ایک درجن سے زیادہ افسانے تنوع کی عمدہ مثال ہیں۔ مثلاً جنت اور جہنم، سفید پھول، ٹوٹے ہوئے تارے اور 'اندھا چھتر پتی' اس قبیل کے شاندار افسانے کہے جاسکتے ہیں۔

کرشن چندر کی رومانویت اور انسان دوستی نے اُن کے طرز تحریر کو لطیف بنادیا، جس میں تختی یا کرختگی قطعی نہیں ہے۔ کرشن چندر کے تعلق سے بعض ناقدین نے ترقی پسند تحریک اور کرشن چندر کو ایک ہی سکے کے دو پہلو قرار دیا ہے۔ دو فرلانگ لمبی سڑک، ان داتا، کالو بھنگی، بھگت رام اور 'برہم پتر' ان کے شاہکار اور اردو افسانوں کے چند یادگار فن پارے ہیں۔ وہ نئی نئی تشبیہات سے بین الاقوامی سیاسی حالات، جنگ و امن اور حکومت کی پالیسی پر اس انداز سے افسانہ تخلیق کرتے ہیں کہ موضوع کی خشکی کا احساس نہیں ہوتا۔

اُپندر ناتھ اشک کے ابتدائی دور کے افسانوں میں اصلاحی انداز پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ پریم چند سے بہت متاثر ہوئے۔ 'ڈاچی' کے افسانوں سے انھوں نے سیاسی موضوعات کی ابتدا کی، اس کے بعد افسانوں میں انھوں نے نچلے، متوسط طبقے کی معاشرتی زندگی اور صنفی عدم مساوات کی بہت خوبصورت عکاسی کی ہے۔ وہ کہانی میں پلاٹ اور واقعات کی ترتیب کو بہت اہمیت دیتے ہیں نیز زندگی کے حقائق اور ان کی تفصیلات پر زور دیتے ہیں۔ عورتوں کی بے بسی اور ان کی سماجی نفسیات کا گہرا مطالعہ ہمیں ان کے افسانوں کو نیل، قفس، چٹان، چیتن کی ماں میں مل جاتا ہے۔

مزدور طبقے کے مصائب اور طبقاتی کشمکش پر لکھے ہوئے افسانوں میں خلوص اور درد نظر آتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ افسانے سے تبلیغ کا کام نہیں لیتے بلکہ اپنے کرداروں کے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ متوسط طبقے کی عام گھریلو زندگی کی الجھنوں، پریشانیوں اور آرزوؤں کا عمیق مطالعہ ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں تہذیبی قدروں کا عکس بھی ملتا ہے اور سماجی کمزوریوں کا تذکرہ بھی۔ انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں کی مثال ان کے افسانوں زین العابدین، لاجونتی، غلامی، کوکھ جلی اور 'گرہن میں ہے' میں کا مطالعہ کرکے، جن میں سماجی تضاد کی بے مثال حقیقت نگاری موجود ہے۔ حالانکہ بیدی کے افسانے زندگی کے تلخ حقائق پر مبنی ہوتے ہیں مگر ان میں تلخی یا بیزاری نہیں ملتی بلکہ ان میں انسانیت، محبت اور ہمدردی کی کرنیں بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں، جس کی مثال گرم کوٹ، دس منٹ، بارش میں، ہڈیاں اور 'پھول' سے دی جاسکتی ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو سماج کی بنیادی حقیقت کے انداز میں ابھارنا بیدی کا سب سے بڑا فن ہے۔ ان کے اس فن کی عکاسی ان کے افسانوں پان شاپ، چھمن، کشمکش وغیرہ میں نمایاں طور پر ملتی ہے۔

حیات اللہ انصاری ترقی پسند تحریک کے انتہائی اہم افسانہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ پریم چند کے بعد ان کی روایت کی توسیع حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں خطابت، انشا پردازی یا سنسنی خیزی سے کام نہیں لیتے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'انوکھی مصیبت' کے کچھ افسانے انگارے گروپ سے متاثر نظر آتے ہیں، جن میں بے لاگ حقیقت نگاری کے نمونے ملتے ہیں مگر ان کا افسانہ 'آخری کوشش' اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے، جس میں گہرائی، معنویت، ٹھہراؤ اور شعور ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں تفکر کا عنصر غالب ہے لیکن باوجود اس کے کہ ان کے افسانوں میں دلچسپی برقرار رہتی ہے دراصل ان کے فن پارے گہرے تجربے کی نشاندہی کرتے ہیں، اسی وجہ سے نفسیاتی مشاہدہ اور باریک بینی نے ان کے افسانوں کا معیار بلند رکھا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا موضوع پنجاب کی دیہی زندگی ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'چوپال' میں وہاں کی رومانی ہواؤں کا اثر ملتا ہے مگر ان کے دوسرے مجوعے 'بگولے' میں اُسی سرزمین کی زندگی کی تلخ حقیقتیں موجود ہیں۔ اس مجموعے کے شروع میں قاسمی نے اپنی ایک نظم تحریر کی ہے، جس کا پہلا شعر ہے۔

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس مگر
میں نے دیہات میں اجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

اور اِنہی اُجڑے ہوئے گھروں کے باسیوں کی داستانیں ان کے افسانوں کا مرکز ہیں غرض یہ کہ قاسمی کے افسانوں کا سفر رومان سے حقیقت کی جانب اور جذباتیت سے فکر کی طرف ہے۔ ان کا افسانہ ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد دوسری عالمی جنگ پر لکھے جانے والے افسانوں میں ایک کامیاب افسانہ ہے۔

اختر انصاری کا افسانوی مجموعے 'اندھی دنیا' کے افسانوں میں متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی محرومیاں اور اس کے نتیجے میں سماج سے برہمی ہے۔ ان افسانوں میں مضمون نگاری کے عناصر زیادہ ملتے ہیں اور تبلیغ کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے افسانے 'نازو' کے نام سے مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے، ان میں یہ عیوب تقریباً دور ہوگئے ہیں۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی ملتا ہے۔ موضوع اور مواد کے سلسلے میں بھی نظر انتخاب سے کام لیا گیا ہے۔ 'خونی' کے افسانے فکر و نظر اور تخیل کے نکھار کے ساتھ ساتھ اعتدال کے تابع نظر آتے ہیں۔

اختر اورینوی نے بعض پیچیدہ مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اور نچلے طبقے کی معاشی مشکلات، لڑائی جھگڑے اور مقدمے بازی، خاندانی منافرت، زمین دار اور کاشتکار، قلی اور نان بائی رکشہ کھینچنے والے اور بھٹی جھونکنے والے سبھی کا مطالعہ قریب سے کیا ہے۔ ان کے افسانے اندھی نگری، جینے کا سہارا، بیل گاڑی اور 'بوڑھی ماما' انھیں موضوعات کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کے ٹائپسٹ، یہ دنیا اور 'پس منظر' جیسے افسانوں میں انھوں نے سماج کی تلخ حقیقتوں کو جذباتی انداز میں لکھا ہے۔ ان کا مجموعہ 'کلیاں اور کانٹے' فنی اعتبار سے زیادہ گہرائی اور معنویت رکھتا ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے 'شکور دادا' انتہائی کامیاب افسانہ ہے لیکن افسانہ ''کلیاں اور کانٹے'' میں بہت سے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے زندگی کے بہت سے رخوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کے اس افسانے کو قابل قدر اور اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

احمد علی کے افسانے ان کے فنی ارتقا کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شروع کے افسانوں میں انھوں نے زندگی اور فن کے رشتے کو بہت اہم سمجھا ہے۔ مثلاً ان کے افسانے مہاوٹوں کی ایک رات، بادل نہیں آتے اور 'استاد شمو خاں' اس رشتے کو استحکام عطا کرتے ہیں۔ اس کے بعد 'ہماری گلی' اور 'میرا کمرہ' جیسے ان کے وہ افسانے ہیں جن میں زندگی کے حقائق کی نفسیاتی تاویلیں ہیں۔ 'قید خانے' کے افسانوں میں زندگی، نفسیاتی تخیل، فلسفیانہ فکر اور وسعت ان کا مطمح نظر ہے۔

خواجہ احمد عباس کے بعض افسانے مثلاً 'تین عورتیں' اور 'معمار' انقلابی اور انسانی تصوریت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ متوسط طبقے کی پریشانیاں، ایک صحافی کے بیانیہ انداز سے سامنے آتی ہیں۔ غریبوں کے مسائل پر لکھے گئے ان کے بیشتر افسانے کہیں کہیں کسی سیاسی نعرے کا جز بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سیاسی موضوعات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنے کرداروں کے ذہنوں میں گہرائی تک دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں میں زعفران کے پھول، ٹڈی، بارہ گھنٹے اور 'سردار جی' اردو کے قابل قدر افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے فن پاروں میں مارکسیت بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور وہ نظریات جن میں تحریک آزادی کی بھی آواز سنائی دیتی ہے۔ غیر ملکی سامراج سے دشمنی، سماجی اور اقتصادی مساوات، انسانیت کا واضح تصور اور ہندوستانی عوام کے بیچ آپسی تال میل نمایاں رہے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اِنہیں نظریات سے بھرے ہوئے ہیں۔

دیویندر ستیارتھی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں گھوم گھوم کر لوک گیت جمع کرنے میں گزار دیا، ان گیتوں کی بنیاد پر ایسے افسانے تخلیق کیے جو موضوع، ماحول اور خوبصورت بیان کے اعتبار سے اردو افسانہ طرازی میں ایک نیا تجربہ تھا۔ ان کے افسانوں کے تیسرے مجموعے 'اگلے طوفان نوح تک' میں قحط بنگال سے متعلق نئے دھان سے پہلے، دوراہا، پھر وہی کنج قفس اور 'قبروں کے بیچوں بیچ' جیسے افسانے بنگال کے دردانگیز المیہ سے متعلق اور بہت موثر ہیں۔ ان افسانوں میں دکھوں سے بھری دنیا میں بھی امید کی کرنیں نظر آتی ہیں۔

حواشی:

1 اردو افسانے کی نصف صدی: پروفیسر قمر رئیس (مشمولہ ہفت روزہ ہماری زبان) فروری 1975

2 اردو تنقید پر ایک نظر: کلیم الدین احمد 1969، 166

3 (بحوالہ) 'اردو افسانہ تعبیر وتنقید' پروفیسر اسلم جمشید پوری 2002 ص 124

4 (بحوالہ) اردو افسانہ تعبیر و تنقید: پروفیسر اسلم جمشید پوری 2002 ص 99

5 (بحوالہ) 'اردو افسانوی ادب' وہاب اشرفی 1987، ص 87 'خواجہ احمد عباس' راج نارائن راز 1989 ص 44

Dr. Arshad Iqbal
(Asst. Professor) M.M (PG.) CollegeKatghar
Dist. Moradabad- 244001 (UP)
Mob. No.: 09412828013

اقلیمہ حبیب

بلراج مین را کے افسانوں کی فکری وفنی جہتیں

بلراج مین را کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیق کے توسط سے جدید افسانے کو نئی فکر اور انوکھے طرز اسلوب سے مالا مال کیا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ ان کا بڑا کارنامہ رسالہ 'شعور' کی ادارت ہے، جس نے قلیل عرصے میں اپنی منفرد شناخت قائم کی تھی۔ وہیں منٹو کی تمام تحریروں کو 'دستاویز' کے نام سے یکجا کر کے بحیثیت مرتب بھی مشہور ہوئے۔

بلراج مین را کا افسانوی مجموعہ 'مقتل' محض 37 کہانیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ کہانیاں وہ گوہر نایاب ہیں جن پر اردو ادب کو ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔ دراصل انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے ان تجربات و احساسات کا انتخاب کیا جن سے واقعی ان کا گہرا رشتہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں شہری زندگی (بالخصوص دہلی)، وہاں کے رہن سہن، چوڑی اور چکنی سڑکیں، بڑی بڑی عمارتیں، ٹی ہاؤس، بس اسٹاپ، ہسپتال، ڈاکٹر، نرس اور بجلی کے کھمبوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ شمیم حنفی رقمطراز ہیں:

''... مین را کا ادراک شہری ہے۔ وہ ہمیں جس فرد کی آپ بیتی سناتا ہے یا جس کی ذاتی ڈائری کے ورق ہمارے سامنے لاتا ہے اس کے تمام تر تجربوں کا کلیدی حوالہ شہری تمدن ہے۔ پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ، ساحل کی ذلت، ریپ، بس اسٹاپ، واردات، وہ، شہر کی رات، غرض یہ کہ آپ ایک کے بعد ایک ورق الٹتے جایئے، اس تصویر کا کوئی نہ کوئی رخ سامنے آتا جائے گا۔''[1]

مین را کے افسانوں کے موضوعات شہر اور اسی شہر کے افراد ہیں۔ لیکن وہ افراد کے خارج سے زیادہ ان کے باطن کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ خود کو پانے کی جستجو، جبر کے خلاف احتجاج، کم تری کا احساس اور ان مانوس اجنبی کیفیات کا اظہار جو ہمارے ہیں لیکن جن سے ہم واقف نہیں ان جیسے مختلف احساسات وکیفیات مین را کے افسانے میں الگ الگ پیکر میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کبھی علامتی پیکر میں تو کبھی ٹوٹی پھوٹی منتشر شکل میں یا کبھی آدھی ادھوری کہانی بن کر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض کہانیاں اتنی مبہم ہوجاتی ہیں کہ قاری کی گرفت میں بآسانی نہیں آپاتیں۔

مین را کے بیشتر افسانے علامتی ہیں۔ وہ علامتی افسانہ لکھنے میں اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ اس ضمن میں کمپوزیشن سیریز، وہ، ایک مہمل کہانی، پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ، ریپ، مقتل اور ساحل کی ذات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے علامات کا انتخاب اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی ہی سے کرتے ہیں۔ ان کے علامتی افسانے تہہ در تہہ معنویت سے لبریز ہوتے ہیں اور کئی ابعاد رکھتے ہیں۔ ان کے علامتی افسانوں سے متعلق عہد ساز نقاد گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''مین را اپنی علامتوں کا انتخاب سامنے کی چیزوں سے کرتا ہے، اور پھر اپنے ذہنی تجسس کی سان پر چڑھا کر ان میں تہہ داری پیدا کرتا ہے۔ اس کے افسانے جدید انسان کے فکری سفر، اس کی ذہنی تنہائی اور اس کے تجارتی قدروں کے معاشرے سے کٹ کر علاحدہ رہ جانے اور استحصالی طاقتوں کے خلاف شدید احتجاج کی روداد پیش کرتے ہیں۔''[2]

بلراج مین را کا افسانہ 'وہ' شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا علامتی افسانہ ہے جس کی پوری کہانی ماچس کی تلاش پر موقوف ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جس کی آنکھ رات میں بے وقت کھل جاتی ہے اور وہ سگریٹ جلانے کی غرض سے ماچس تلاش کرنا شروع کرتا ہے۔ لیکن اسے کہیں ماچس نہیں ملتی۔ وہ پورے کمرے میں ماچس تلاش کرنے کے بعد دسمبر کی سرد رات میں باہر نکل جاتا ہے اور ماچس کی تلاش جاری رکھتا ہے لیکن ماچس نہیں ملتی۔ آوارگی کے الزام میں اسے پولیس اسٹیشن جانا پڑتا ہے۔ وہاں ماچس موجود ہوتی ہے لیکن اسے لے نہیں پاتا۔ پولیس اسٹیشن سے لوٹتے وقت اسے ایک ایسا شخص ملتا ہے جو اسی کی طرح ماچس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔ اور وہ پوچھتا ہے:

''آپ کے پاس ماچس ہے؟
ماچس؟
آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟
ماچس کے لیے تو میں.....
وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔
آگے، جدھر سے وہ خود آیا تھا۔
اس نے قدم بڑھایا۔
آگے، جدھر سے وہ آیا تھا۔''[3]

دراصل انھوں نے 'ماچس' کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ 'ماچس' وجود کو سمجھنے کی تڑپ، باطنی اضطراب یا زندگی کی معنویت کی تلاش کی علامت ہے۔ اور افسانے کا 'وہ' جدید دور کا ہر وہ فرد ہے جو اس نا مساعد حالات میں اپنے باطن سے یا اپنی زندگی کی معنویت سے غافل ہے، جو بس ایک مشینی زندگی گزار رہا ہے لیکن جب اس معنویت کا احساس دل میں ابھرتا ہے تو اسے پانے کی ایسی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان وقت، راستہ، مصیبت، تکلیف سب سے بے خبر ہو جاتا ہے اور کسی طرح بھی اسے پانے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

''آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟
میں وقت سے بے خبر تھا،
ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی!
ماچس کہاں ملے گی؟''[4]

بعض اوقات غفلت کی نیند سے بیدار ہونے کے باوجود معاشرے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی بے حسی انسان کے حوصلے کو پست کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'وہ' یہ جان کر بہت حیران ہوتا ہے کہ ماچس جیسی معمولی چیز کسی کے پاس بھی نہیں یا اگر ہے بھی تو اس کی معنویت سے بے خبر ہے۔ افسانے کے آخر میں دوسرے فرد کو بھی ماچس کی تلاش

میں بھٹکتے دیکھ کر اسے اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طرح کوئی اور بھی ہے جو اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

بلراج مین را احتجاج پسند افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانے ایک انقلاب پسند باغی کے افسانے ہیں۔انھوں نے صرف اپنی تخلیقات ہی نہیں بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''ان کی لغت میں سمجھوتہ کا لفظ نہیں ہے۔صرف یہی سبب ہے کہ اپنے قاری کے محدود حلقے کا علم رکھتے ہوئے بھی اظہار اور ہیئت کی سطح پر وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''5

مین را نے غیر معمولی تخلیقی صلاحیت رکھنے کے باوجود صرف 37/ افسانے تخلیق کیے۔یہ بھی ایک طرح سے ان کا احتجاجی رویہ ہی ہے۔جس میں ہمارے معاشرے کی مفاد پرستی، منافقت، شہرت و زر کی ہوس، دوسروں پر فوقیت لے جانے کی حسرت، ادبی گروہ بندی، علم کا فقدان اور بے عملی کا دخل ہے۔

مین را کا احتجاجی رویہ، ان کا غصہ اور جھنجھلاہٹ ان کے کئی افسانوں میں نظر آتا ہے۔آخری کمپوزیشن، بیزاری، کوئی روشنی، کوئی روشنی، ہوس کی اولاد اس کی عمدہ مثال ہیں۔قاضی جمال حسین مین را کی کہانی سے متعلق کہتے ہیں:

''.....مین را کی کہانیوں میں جو زہرہ گداز حدت اور تیزابیت تھی اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ کہانیاں کم ہی لکھتے۔ہڈیوں میں سرایت کر جانے والی یہ تیزابیت بہت دیر تک باقی بھی نہیں رکھی جا سکتی۔یہی شدت اور ارتکاز مین را کا امتیاز ہے جو محدود سرمایے کے باوجود معاصرین میں ان کے قد کو بہت نمایاں کر دیتا ہے۔''6

افسانہ 'آخری کمپوزیشن' میں ظلم و استبداد کے سامنے کبھی سر نہ خم کرنے والا باغیانہ رویہ نظر آتا ہے۔یہ کہانی تیسری دنیا کی انقلابی حرارتوں کا رزمیہ ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ لفظ کو پورے ایقان و اعتماد کے ساتھ استعمال کرنے کا حوصلہ بھی۔ایک ادیب کے لیے لفظ ہی سب سے بڑی قوت اور ہتھیار ہے، جس کا تحفظ ان کا پہلا فریضہ ہے۔ جسے افسانہ نگار نے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

مین را کا افسانہ 'کوئی روشنی، کوئی روشنی' انفرادیت کا حامل ہے۔یہ افسانہ جدید دور کے انسان کا المیہ ہے۔افسانے کا کردار 'گیان' جدید دور کے مشینی و صنعتی جبر کا شکار ہے۔دہشت اور کرب کی فضا میں سانس لیتا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو اس جاں سوز عہد میں 'خود' کو پانے کی جستجو میں سرگرداں ہے۔اور یہی اس کی تمام تر الجھنوں کا سبب ہے۔

گیان اسی جستجو میں اپنے شہر سے دور کسی گاؤں میں گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے اور آخر کار موت کے دامن میں ہمیشہ کے لیے پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔گیان کی طرح افسانہ 'بیزاری' کا جیت اور موہن معاشرے کے ستائے ہوئے کردار ہیں دونوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ زمانہ انہیں حقیر نظروں سے دیکھ رہا ہے۔یہی احساس بیگانگی یا اس کے پس پردہ اپنی زندگی میں ناکامی کا احساس انہیں خودکشی کے لیے مجبور کرتا ہے۔خودکشی، زندگی کے تئیں ایک منفی رویہ ہے۔لیکن اس کے پیچھے ان کا یہ ردعمل ان کی حساس طبیعت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ دنیا میں ذلت و رسوائی کی زندگی نہیں گزارنا چاہتے ہیں۔

مین را کے افسانوں میں 'سفر' کی بڑی اہمیت ہے۔انھوں نے اپنے بہت سارے افسانوں میں سفر کے وسیلے سے مختلف و متنوع افکار و خیالات اور ذہنی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔افسانہ 'بس اسٹاپ'، 'واردات'، 'شہر کی رات' اس کی عمدہ مثال ہیں۔

'بس اسٹاپ' ایک شخص (میں) کا بس کے لیے انتظار اور اس دوران اس کے ذہن میں ابھرنے والے مختلف خیالات کے اظہار پر مبنی ہے۔ایک شخص جون کی تپتی دوپہر میں بھولے بھٹکے ایک ایسے بس اسٹاپ پر پہنچ جاتا ہے جہاں دور دور تک سناٹا چھایا ہوتا ہے۔نہ کوئی دوسری سواری، نہ کوئی آدم زاد، نہ پینے کے لیے پانی، نہ سر چھپانے کے لیے کوئی سایہ۔وہ تھا، سڑک تھی، دھوپ تھی اور بجلی کا کھمبا تھا۔وہ بس اسٹاپ پر بس آنے کے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔اس بس کے لیے ایک گھنٹے کا انتظار اس کے لیے اتنا جان لیوا ہوتا ہے کہ اسے ہر ایک لمحہ کے گزرنے کا احساس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اب وہ پل بھر میں بکھر جائے گا۔ ''ہم نشچت سے تک بس کا انتظار بھی نہیں کر سکتے... ہماری زندگی کس قدر ناپائیدار ہے۔'' وہ بس کے انتظار میں اتنے جان لیوا تجربہ سے پہلی بار گزر رہا تھا۔اس انتظار کے دوران اس کا ذہن ماضی کی ان یادوں کی طرف مراجعت کرتا ہے جب وہ جوان تھا۔

مین را نے اس افسانے میں کردار کے شعور اور لاشعور کی کیفیات کو بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔بس اور بس اسٹاپ کو علامت بنا کر زندگی کے ایک اہم پہلو سے روشناس کرایا ہے۔یہ بس اسٹاپ وہ دنیا یا پناہ گاہ ہے جہاں ہم سب رہتے ہیں اور 'بس' زندگی کی خواہش ہے۔یہ دنیا بھی کبھی ایک جیسی نہیں رہتی ہے۔ہم بدلتے وقت اور حالات میں زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہیں۔ کبھی کبھی ہماری زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری کوئی خواہش زبان تک آتی بھی نہیں اور پوری ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے زندگی کی آخری سانس بھی کم پڑ جاتی ہے۔اس طرح مین را نے اس افسانے میں زندگی اور بدلتے زمانے کے حقائق کو بڑی کامیابی کے ساتھ علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔

زندگی اور کائنات دو ایسی کتابیں ہیں جن سے ہم ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔صرف دیکھنے اور محسوس کرنے کی وہ قوت ہونی چاہیے جن کے ذریعے ہم سبق حاصل کر سکتے ہیں۔یہ قوت کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہے لیکن ہر کسی کو اس قوت کا اندازہ نہیں ہوتا۔کسی کے لیے زندگی کا ہر قدم ایک نیا افسانہ بن جاتا ہے اور کسی کے سامنے پوری زندگی محض ایک کورا کاغذ۔مین را وہ فن کار ہیں جو اپنے مشاہدات و تجربات سے زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی حقیقت کو افسانے کے پیکر میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ افسانہ 'واردات' اور 'شہر کی رات' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ جن کے ذریعے شہر کی زندگی اور یہاں کے افراد کا مزاج اور ماحول پتہ چلتا ہے۔'شہر کی رات' جیسا کہ عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کے ذریعے شہر کی رات اور اس کی خاموشی کی عکاسی کی ہے۔افسانہ 'واردات' ایک عورت کے اس نئے اور انجانے تجربے کا بیان ہے جو اسے دوران سفر حاصل ہوتا ہے۔اس کے بغل میں ایک انجان آدمی غنودگی کے عالم میں بیٹھا ہوتا ہے اور اس کا سر اس عورت کے کاندھے سے مس ہوتا رہتا ہے۔اس طرح اس کے سر سے مس ہو جانا اس عورت کو عجیب کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔اس کہانی کا انجام عورت کے اس جملے سے ہوتا ہے''میرے کندھے پر اس کی نیند کا بوجھ میرا پہلا سکھ تھا۔''

مین را کے افسانے میں سفر کی طرح 'جنس' کی بھی بڑی اہمیت ہے۔انھوں نے جنسی مسائل کو کئی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔وہ جنسی مسائل کا اظہار بڑی بے باکی، شدومد اور جزئیات کے ساتھ کرتے ہیں۔'بھاگوتی' مین را کا پہلا افسانہ ہے۔جو بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا موضوع جنس نہیں ہے۔لیکن اس کا جنس سے تعلق ضرور ہے۔یہ ایک ایسی دردمند اور حساس عورت (بھاگوتی) کی کہانی ہے جو اسقاط حمل کا طریقہ بخوبی جانتی ہے اور یہی اس کا ذریعہ معاش ہے۔یہ ایک ایسا کام ہے جس کو ہمارا سماج پسند نہیں کرتا اور حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔لیکن کبھی کبھی یہی کام سماج میں رہنے والے انسان کو ذات سے بچاتا ہے۔ بھاگوتی کو اپنے کام سے کسی طرح کی شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا۔لیکن کبھی کبھی اس کام سے اس کا دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ایک دن جب خود اس کی بیٹی، جسے بھاگوتی نے یہ گر سکھایا تھا اور جو مستقبل میں اس کے سکھ اور آرام کی ایک کرن تھی، اس گناہ کی زد میں آجاتی ہے اور وہ بھی یہی راہ اپنانے جاتی ہے لیکن بھاگوتی اسے یہ گناہ کرنے سے روک لیتی ہے۔

مین را کا ایک منفرد افسانہ 'ہوس کی اولاد' ہے۔اس

افسانے میں تین کردار راہی، کرشن اور ہربنس ہیں۔ مرکزی کردار راہی ہے اور اسی کے خیالات پر اس افسانے کا وجود قائم ہے۔ راہی دوسروں سے الگ ایک باغی ذہن کا مالک ہے۔ جس کے اندر تصنع اور مکروفریب نہیں ہے۔ ہر آدمی کی طرح صرف باتیں نہیں بناتا بلکہ جو باتیں کرتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے اور اپنے خیالات پر استوار کی گئی دنیا میں رہتا ہے۔ راہی کی نظر میں ہمارا معاشرہ ایک بیمار معاشرہ ہے۔ جہاں ہر طرف مکروفریب اور خودغرضی کا بازار گرم ہے۔ وہ ایسے انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو جنسی آسودگی کے لیے شادی کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور باپ بنتے ہیں۔ اس کی نظر میں افزائش نسل ایک مقدس جذبہ ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

''مجھ میں ہوس ہے۔ اس ہوس کو مٹانے کے لیے میں شادی کا ڈھونگ رچاتا ہوں کیونکہ ہوس کی پیاس بجھانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں، اور اگر ہے بھی تو مجھ میں ہمت نہیں اور پھر میں باپ بن جاتا ہوں۔ کررہا تھا میں اپنی ہوس کا مداوا مگر بن گیا باپ۔ اب وہ بچہ میری اولاد ہے۔ نہیں صاحب، میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا..... اولاد، یعنی افزائش نسل بڑا مقدس جذبہ ہے جسے ہوس سے کوئی علاقہ نہیں۔''[7]

افسانے کا مرکزی کردار راہی زندگی کی خوشی ڈولی اور پریما سے حاصل کرلیتا ہے لیکن شادی تب ہی کرتا ہے جب افزائش نسل کا مقدس جذبہ اس کے دل ودماغ میں ابھرتا ہے۔ مین را نے اپنے اس افسانے میں افزائش نسل اور مباشرت کے مابین فرق کو خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اس طرح 'حسن کی حیات'، 'غم کا موسم'، 'جسم کے جنگل میں ہر لمحہ قیامت ہے مجھے' جنس سے متعلق افسانے ہیں لیکن معنوی سطح پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ بلراج مین را کبھی کبھی جنس کے اظہار میں جزئیات سے اتنا کام لیتے ہیں کہ اسے خامی تصور کیا جاسکتا ہے۔ جس کی مثال ان کا افسانہ ''جسم کے جنگل میں ہر لمحہ قیامت ہے مجھے'' ہے۔ لیکن اس خامی سے انہیں شاید اس لیے منسوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ 'ان کی لغت میں سمجھوتہ کا لفظ نہیں ہے'۔

مین را کے افسانے صرف موضوعات ہی نہیں بلکہ اسلوب اور زبان وبیان کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی الفاظ پر مکمل گرفت اور جملوں کا اختصار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ماہر نباض کی طرح لفظوں کے ہر نبض سے واقف ہیں اور صرف واقف ہی نہیں بلکہ اس کو برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ایسے بہت سارے خیالات، احساسات اور کیفیات ہوتے ہیں جسے ہم محسوس تو کرسکتے ہیں مگر لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے، بالخصوص باطنی کیفیات۔ مین را کے افسانے خارجی سے زیادہ باطنی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان باطنی دنیا کے اظہار کے لیے انہیں لفظوں کی دنیا کی خاک چھاننا نہیں پڑتا بلکہ ان کی کہانی کا Theme اپنا مناسب اور موزوں اسلوب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ 'کمپوزیشن سریز' کا جو موضوع ہے اسے کسی دوسرے اسلوب میں نہیں لکھا جاسکتا۔ اگر اسے دوسرے اسلوب میں لکھا جائے تو وہ کہانی کہانی ہی نہیں رہے گی۔ یا 'بھاگوتی' کی کہانی 'کمپوزیشن سریز' کے اسلوب میں نہیں لکھا جاسکتا۔ ان کا اسلوب موضوع کا تقاضا ہے۔ وہ کسی موضوع پر کسی اسلوب کو زبردستی ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔

مین را کے زیادہ تر افسانے تین یا چار صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان کے مختصر سے مختصر افسانے میں بھی اتنی تہہ داری اور گہری معنویت ہوتی ہے کہ جس کو کوئی دوسرا افسانہ نگار سو صفحات میں بھی بیان کرنے سے قاصر ہوگا۔ اس کی اصل وجہ ان کا شعری اسلوب ہے۔ ان کے جملے مصرعوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے منتشر اور بے ربط جملے اپنے اندر ایک جہان معنی لیے ہوتے ہیں۔ مہدی جعفر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''زبان کے لحاظ سے بلراج مین را بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ زبان جامع ہوتی ہے اور اس میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے تسلسل سے ملتے ہیں اور کہیں کہیں اتنے لمبے کہ پورے پیراگراف میں ایک جملہ نظر آتا ہے۔ الفاظ کی تکرار اور جملوں یا عبارت کا بار بار دہرانا فنی طور پر ان کے افسانوں کی تشکیل میں معاون ہیں۔''[8]

گویا لفظوں کی تکرار سے وہ اپنے افسانے میں شعری حسن وتاثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کے جملوں کے درمیان وقفے میں خاموش گفتگو کا حسن ہوتا ہے جو کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں کمپوزیشن ایک، کمپوزیشن پانچ، آخری کمپوزیشن، وہ، میرا نام میں ہے اور ساحل کی ذلت وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مین را کے افسانے میں پلاٹ یا واقعے کی وہ ترتیب نہیں ملتی جو روایتی افسانوں کا خاصہ ہے۔ ان کے افسانے بے ربط اور منتشر ہوتے ہیں۔ لیکن احساس وکیفیات کی سطح پر باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تضاد کے ذریعے افسانے کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ وہ روشنی اور تاریکی دونوں سے کام لیتے ہیں۔ محسوسات کے باریک سے باریک تضاد پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔

مین را حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ان ہی تجربوں اور افکار کو اپنے افسانے کا حصہ بنایا ہے جسے بہت قریب سے دیکھا اور اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے کے کردار، موضوع اور مقام حقیقی وارضی ہیں۔ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار بے نام ہوتے ہیں۔ اس نئی دنیا اور نئے تمدن میں اضطراب، تنہائی، اضمحلال، روحانی وجذباتی خلا جن کا مقدر ہے۔ وہ ایک انجانی شے کو پانے کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ جس کی تلاش میں وہ گلی گلی اور شہر شہر بھٹک رہے ہیں۔ ان کے باطن کی دنیا میں اور روح میں کہرام برپا ہے۔ اسی دنیا اور کہرام سے آگہی مین را کا مقصد ہے اور جس پر ان کے فن کی بنیاد ہے۔

مین را کے افسانوں کے کردار بھلے ہی بے نام ہیں اور افسانے 'میں' اور 'وہ' کے صیغے میں آتے ہیں۔ لیکن یہ بے نام کردار ہمارے اسی معاشرے کا ایک معمولی آدمی ہے، جو جدید دور کے فرد کی نمائندگی کرتا ہے۔ مین را نے اپنے افسانوں کے ذریعے انسانی وجود سے وابستہ نہایت لطیف اور پیچیدہ حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے۔ ان کے کردار زندگی کی رنگینیوں میں ڈوبے نظر نہیں آتے بلکہ زندگی کی بدصورت اور تلخ حقیقت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ کردار زندگی کے تئیں ہماری بصیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔

بلراج مین را کے افسانے فکر وفن کے اعتبار سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانے کے ذریعے قارئین کو ان گم گشتہ حقائق سے روشناس کرایا ہے جہاں دوسروں کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔ گرچہ ان کی تخلیقات اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کم ہیں لیکن انھوں نے اپنے مخصوص علامتی، استعاراتی اور امیجری انداز میں افسانے لکھ کر جدید اردو افسانے کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مختلف تکنیک اور مخصوص اسلوب اور زبان وبیان کے ذریعے عصر حاضر کے مختلف موضوعات ومسائل کو افسانوی پیکر میں ڈھالا ہے۔

حواشی

1 چھلاوا، شمیم حنفی، بحوالہ سرخ وسیاہ، بلراج مین را، ترتیب وتعارف، سرور الہدیٰ، ص509
2 گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، ص508
3 'وہ' بلراج مین را، منقل، ص52
4 'وہ' بلراج مین را، منقل، ص46
5 ابوالکلام قاسمی، منٹو کے بعد اردو افسانوں کی صورت حال، تحریک (سلور جبلی)، ص137
6 مین را کی کہانی، امکانات کا نیا افق، بحوالہ سرخ وسیاہ، ترتیب وتعارف سرور الہدیٰ، ص537
7 ہوس کی اولاد، بلراج مین را، منقل، ص210
8 مہدی جعفر، نئی افسانوی تقلیب، ص133

■

Aqlima Habib
Asst Prof. Dept. of Urdu
Aliah University
Action Area II, Plot No.- IIA/27, Newtown,
Kolkata- 700156 (West Bengal)

شاذیہ تمکین

زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے لپٹی روٹیاں

'روٹی' انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے، جس کے حضور بڑے بڑے دانشوروں کی دانش مندی، فلسفیوں کے فلسفے، عالموں کی علمیت، بزرگوں کی بزرگی، مذہبیوں کی مذہبیت، مادہ پرستوں کی مادیت اپنے اپنے دائروں میں گردش کرتے رہنے کے بعد لٹو کی طرح دھیمی رفتار میں لڑکھڑاتے، ڈھلکتے ڈھیر ہوجاتی ہے۔ان معدوم ہوتی ہوئی دائراتی گردشوں میں ایک 'روٹی' کا گول دائرہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چکر لگاتا نظر آتا ہے، جس کی رفتار کبھی کسی بھی دور میں دھیمی نہیں ہوتی، انسانی ذہن کے مرکزی نقطے کے اردگرد چکر لگاتی یہ 'روٹی' پوری جلالی حقیقت کے ساتھ ایستادہ اپنے روبرو منہدم ہوتی ہوئی ان اعلیٰ قدروں کا تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ زمانے بدلتے رہے، متغیر تحریکیں پُر جوش مراحل سے جمود اور جمود سے خاتمے تک کا سفر طے کرتی رہیں اور نئی تحریکوں نے ان کی جگہ لے لیں۔مگر 'روٹی' کی جلالی کیفیت میں حرف تک نہ آیا۔ ویسے تو اس کے وجود کی بقا کے لیے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہے، مگر ترقی پسند تحریک نے طبقاتی دائروں میں محبوس قدروں کے ماتھے پر چمکتی 'روٹی' کی تلخی عکس کو کھینچ کر ادب کی پیشانی پر چمکتی ہوئی بندی کی مانند مزین کر دیا جو آج تک مجبور و نادار طبقوں کا خواب اور مضبوط و بیدار طبقوں کی شان بنی اسی آب وتاب کے ساتھ اپنی سفیدی بکھیر رہی ہے، جس کا ثبوت بیسویں صدی کی الگ الگ دہائی میں لکھے جانے والے دو افسانوں میں مل سکتا ہے۔

1940 کے بعد ابھرنے والی ترقی پسند افسانہ نگار صدیقہ بیگم کا افسانہ 'پیپ بہتی ہوئی' جوان کے مجموعے 'پلکوں میں آنسو' (شائع شدہ 1948) میں شامل ہے۔ دوسرا، 1970 کے بعد اردو دنیا میں قدم رکھنے والی نکہت افلاک کا افسانہ 'تقسیم ایک روٹی کی' ہے، جو ان کے مجموعے 'پلکوں سے پلکوں تک' (شائع شدہ 1994) میں شامل ہے۔دونوں مجموعوں کے عناوین سے جھانکتی ہوئی بھیگے پلکوں کی مشابہاتی جھلکیاں دونوں افسانہ نگاروں کی تحریروں میں موجود روتی بلکتی تڑپتی آہ وزاریوں کے لیے جھٹپٹے کے دیے کی مانند روشنی دکھاتی نظر آرہی ہیں۔ان دو افسانوں کی درمیانی مسافت لگ بھگ چھتیس سے چالیس سال تک کی ہے، مگر دونوں افسانوں کا کینوس منفرد زندگیوں کے پلیٹ فارم میں گردش کرتی ہوئی 'روٹی' کی کڑوی سچائی سے منعکس نظر آتا ہے۔اتنا لمبا وقت گزرنے کے بعد بھی روٹی کی حیثیت یا اس کے وقار میں کوئی کمی نہیں آئی۔دونوں افسانوں میں 'روٹی' کو مرکز ومحور بنا کر نچلے و نادار طبقوں کی دو الگ الگ زندگیوں کو اس ایک گول دائرہ نما مکمل روٹی کے لیے جوجھتے اور جدوجہد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جہاں ایک طرف روٹی کے ایک ٹکڑے سے چوٹ کھانے والی نئی جوانی کی کسک سے چور شکست کی سسکتی آہیں محسوس کی جا سکتی ہیں تو دوسری طرف جوانی کی آمد سے بے خبر اپنے حصے کی تقسیم ہوتی ہوئی روٹی کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی شہزادی کے حساس شعور کا تانا بانا اپنے انتہائی عروج پر دیکھا جا سکتا ہے۔

دونوں لڑکیاں شباب کی نازک مگر خار دار جھاڑیوں میں پھنسی، ابھرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ایسی لڑکیوں کی زندگیوں میں جوانی کی ٹوٹتی اور رعشہ زدہ دستک امنگوں کا پیغام نہیں لاتی کہ جوانی کی آمد اور پھر مٹھی میں سے ریت کی طرح اس کی غیر محسوس رفت کی اٹھتی گرتی لذت کا انھیں احساس تک نہیں ہونے پاتا۔

افسانہ 'پیپ بہتی ہوئی' میں ریلوے پلیٹ فارم میں رینگ رہی ان زندگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو ایک روٹی کے لیے گورے فوجیوں سے بھری ٹرین کے اسپیشل ڈبوں کی منتظر رہتی ہیں، کیونکہ گوروں سے ہی انھیں روٹی مل سکتی تھی، کالے تو خود ہی روٹی کے محتاج تھے وہ کہاں سے ایسی بے وقعت زندگیوں کے بھوکے پیٹ کو روٹی کا لمس محسوس کرا سکتے تھے۔مگر گوروں سے ملی ہوئی اُس ایک روٹی کے عوض ان لڑکیوں کو کیا دینا پڑتا، یہ شکنت کے لیے بڑا ہی عجیب اور شرمناک تجربہ تھا۔اس دن بھی گاڑی آئی اور نکل گئی مگر شکنت کے ہاتھ ایک مکمل ڈبل روٹی کی سوغات کے بدلے مایوسیوں کی ناامید کرچیاں خون رنگتی نظر آئیں جو کچھ دیر بعد بھوکے پیٹ نما دوزخ کو بھی کریدنا شروع کر دیتیں۔ہاں مگر اس تنگ دھڑنگ گورے فوجی کے ہاتھوں گولی کی شکل میں پھینکے جانے والے ڈبل روٹی کے ٹکڑے نے اس کی کومل چھاتی میں گہرا ناسور کر دیا تھا۔ناسوری کسک نے سکون تو چھینا ہی اور ہاتھ میں پوری ڈبل روٹی بھی نہیں آئی:

''اگر وہ اس ٹکڑے کے بجائے پوری ڈبل روٹی اس کی چھاتی پر دے مارتا تو شاید اس کو اتنی تکلیف نہ ہوتی لیکن ٹکڑے کی کسمساہٹ ریت کے مہین ذرّوں کے مانند اس کے جسم میں محسوس ہو رہی تھی۔اُس نے آہستہ آہستہ اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ اُس کسک کو مٹا رہی ہو۔مگر چوٹ لگی ہو تب ہی تو، کہیں احساس کو ہاتھوں سے رول کر ختم کیا جا سکتا ہے۔اتنا رولنے کے بعد بھی تو وہ کسک ویسی کی ویسی ہی رہی۔'' (پلکوں میں آنسو،صدیقہ بیگم،ص20)

ٹرین تو چلی گئی، وہیں شکنت کو نرملا دکھائی دی جس کے ہاتھوں میں پوری ڈبل روٹی اور ایک جیلی کا ڈبہ بھی تھا۔تب شکنت من ہی من اسے لعنت بھیجتی رہی کہ چھنال! مگر پھر وہ مجبور نرملا کے بارے میں سوچتی ہے کہ اس بے قصور کی کیا غلطی ہے۔پھر اسے محسوس ہوا:

''جیسے وہ غبارہ پھولتا جا رہا ہے۔کون اس کو پھولنے سے روک سکتا ہے۔بچوں کا کھیل... کون منع کرے۔سرجو بھی تو غبارہ پھلاتا ہے اور اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک پورا نہ پھول جائے۔ایسی بھی کیا ضد آخر کو ایک حد سے گزر جانے کے بعد پھٹ ہی تو جاتا ہے،اور پھر وہی جھرّی دار جھولتی ہوئی ربر۔جسے دیکھ کر گھن آنے لگتی ہے۔''

(پلکوں میں آنسو،صدیقہ بیگم،ص22)

غبارے کی استعاراتی فضا میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی علامت بنے جسم کے ایک عضو کی متغیر شکل میں زندگی کی اٹھان کا کساؤ اور ڈھلان کی جھولتی ہوئی جھرّیوں کا بار پردہ اظہار افسانے کے وحدت تاثر میں اطمینان بخش اضافہ کرتا ہے۔نرملا جہاں شباب کے عروجی مرحلے میں کھڑی تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی وہیں شکنت جوانی کے ابتدائی مرحلے میں کھڑی پھولے ہوئے غباروں کی منتظر تھی کہ پھولے ہوئے غبارے اپنے اردگرد کی شہوانی نگاہوں کی توجہ بٹور لاتے ہیں،جس سے نادار ہاتھوں میں ڈبل روٹی کی گرفت محسوس کی جا سکتی ہے۔

وہ نرملا سے خوبصورت تھی تو کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ نرملا اس سے روز بازی لے جائے اور وہ کفِ افسوس کے ساتھ ساتھ بھوک سے چپکے پیٹ ملتی رہ جائے، چوبیس گھنٹے کا یہ وقفہ شکنت کے نفسیاتی زیر و بم کا ایسا لمحہ تھا جس

میں اسے کئی بار اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے لے جانے پڑے، آخری مرحلے میں بھی اس نے سینے سے ڈھلکتے ہوئے پلّو کو مضبوطی سے تھامے رکھا،مگر نرملا کے ہاتھوں میں گورے فوجی کی بوتل جسے وہ ننگے کے منہ سے لگائے بھر رہی تھی، دیکھ کر اس کا آنچل بھی بے قابو ہو گیا:

''اُس نے گورے سپاہی کو دیکھ کر اپنا آنچل ڈھلکا دیا اور پھر غور سے اپنے جسم کا جائزہ لیا... وہ جھینپ گئی۔کاش زمین پھٹ جاتی... اس نے نرملا سے بھی زیادہ اپنی چولی کو پھاڑ رکھا تھا۔ویسے بھی چولی کتنی ڈھیلی تھی۔''

(پلکوں میں آنسو،صدیقہ بیگم،ص28)

شکنت اور نرملا کی پھٹی چولیوں سے جھانک رہی حقیقت ایک دوسرے کے مخالف سمت میں کھڑی ایک کی احساس کمتری اور دوسرے کی احساس برتری کی علامت بنی ہوئی تھی۔اسی کمتری کے دباؤ میں زمین کی اور دھنستی جا رہی شکنت نے آواز سنی کہ اس کے بھائی سرجو کو ایک گورا مسافر مار رہا ہے،وہ بے سدھ ادھر بھاگی بھائی کو اپنے سینے سے لگایا،ساری کا پلو پھر سے ڈھلک چکا تھا، اور وہیں کھڑے گورے کی نیلی وحشی آنکھیں شکنت کی پھٹی چولی سے بھی لذت بٹور رہی تھیں،مگر شکنت کو کہاں ہوش تھا۔شکنت نے ایسے گورے کی روٹی کو نہیں تھولا جو مظلوموں پر صرف ظلم ڈھانا جانتے ہیں۔وہ بل کھاتی ناگن بن چکی تھی۔غصے میں بپھرا ہوا اس کا دماغ اس ایک لمحے میں بڑے بڑے فلسفے تو بگھار رہا تھا مگر اسے پھٹی ہوئی چولی کا ہوش نہیں تھا۔گاڑی نکل گئی۔بھائی سرجو کو دکھ تھا کہ آج بھی ان دونوں کے ہاتھ خالی ہیں۔اس کے پریشان ذہن نے شکنت سے یہ پوچھ ہی لیا کہ آج نرملا کی طرح اس کی بھی چولی پھٹی ہوئی تھی تو اسے ڈبل روٹی کیوں نہیں ملی۔شکنت کو اس سوال نے زیر کر دیا کہ جیسے اس کا راز فاش

> **اگر وہ اس ٹکڑے کے بجائے پوری ڈبل روٹی اس کی چھاتی پر دے مارتا تو شاید اس کو اتنی تکلیف نہ ہوتی لیکن ٹکڑے کی کسمساھٹ ریت کے مہین ذرّوں کے مانند اس کے جسم میں محسوس ہو رہی تھی. اُس نے آہستہ آہستہ اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ اُس کسک کو مٹا رہی ہو.مگر چوٹ لگی ہوتب ہی تو. کہیں احساس کو ہاتھوں سے رول کر ختم کیا جا سکتا ہے .اتنا رولنے کے بعد بھی تو وہ کسک ویسی کی ویسی ہی رہی.**

ہو گیا ہے مگر اندھیرے میں بھیانک چینے کے مانند اس نے اس سوال کے پیچھے پوشیدہ راز کو اس طرح فاش کیا:

''سرجو اپنی تمام طاقت سے غبارہ پھلا رہا تھا جو پھولتے پھولتے ایک بڑے فٹ بال کے برابر ہو گیا۔شکنت، ڈر گئی کہیں پھوٹ نہ جائے... اور سرجو کا ہاتھ اس غبارہ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا... کاش یہ بڑھ کر نرملا کی طرح چولی کو مسکا دے جو اب بھی بہت ڈھیلی تھی... اور پھر... ڈبل روٹی کے ٹکڑے کی چوٹ... نرم کسک جو ابھی تک بدستور محسوس ہو رہی تھی۔''

(پلکوں میں آنسو، صدیقہ بیگم، ص 30)

آج سے تقریباً 80 سال پہلے لکھا جانے والا یہ بے باک افسانہ کس قدر کڑوی حقیقت کا ترجمان نظر آرہا ہے۔ ایسی زندگیاں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، روٹی کی جستجو انھیں کبھی بڑا دانشور بنا دیتی ہے تو کبھی عظیم فلسفی۔ زمین پر رول رہی زندگی کی انھی سطح پر کھڑے ہو کر روٹی کے حصول کی کوشش میں قلب و ذہن کا ایسا تذبذب، شکنت کو اپنی سطح سے یکسر بلند کر دیتا ہے۔ افسانے کے خاتمے پر اپنی تہذیب کے ذریعے روٹی کے لیے دھتکارا جانے والا یہ مظلوم طبقہ تہذیب کے انتہائی عروج پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں روایتی اعلیٰ قدریں بالکل بونی دکھائی دے رہی ہیں۔

نکہت افلاک کا افسانہ 'تقسیم ایک روٹی کی' میں ایسی ہی زندگی کی کڑوی حقیقتوں سے جوجھ رہی شہزادی کی جد و جہد کو قلم بند کیا گیا ہے۔ جس کی زندگی روٹی سے شروع اور روٹی تک پہنچ کر حیات انسانی کی ایک بڑی سچائی سے آگاہی حاصل کر لیتی ہے۔ ہر سال کئی ٹکڑوں میں بٹتی ہوئی روٹی کے ورد نے اسے کسی اور درد کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا، جس کی ہلکی سی لذت نما کسک سے شکنت تڑپ تڑپ جاتی تھی۔ کیونکہ زمین پر گرتے ہی اس کے بہن بھائیوں نے روٹی کے لیے ایسی چھینا جھپٹی مچائی کہ اس کے حصے کی بھری پوری گول روٹی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور وہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بھی اٹھتی جوانی کی لذت سے بے خبر اس تقسیم ہوتی ہوئی روٹی کے ہر جانے والے ٹکڑوں کے ساتھ اپنی دفن ہونے والی امنگوں کو خاموشی کی چادر تانے محسوس کرتی رہی کہ:

''وہ بھی بھوکی تھی!

جنم جنم کی بھوکی!

پیٹ جو سب سے بڑا دوزخی ہے، جس کی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں تو بڑے بڑے سورما بھی ہارے ہیں...

پھر وہ تو ٹھہری ایک ننھی سی کمزور بچی!

اس کی بھوک ان سورماؤں کی بھوک سے بالکل مختلف تھی جس کو ٹھنڈا کرنے میں وہ نہ جانے کن کن مدارج سے گزری ہوگی۔''

(پلکوں سے پلکوں تک، نکہت افلاک، ص 52-51)

ہائے یہ بھوک، روٹی کی یہ للک، جس نے شہزادی کو کبھی اپنے دائرے سے باہر جھانکنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ شہزادی، شکنت کی نہیں بلکہ نرملا کی طرح سترہ اٹھارہ سال کی کڑیل جوان تھی، عمر کا یہ مرحلہ بڑا ہی پُرکشش ہوتا ہے۔ مگر معاشی ذلت اور روٹی کی تقسیم نے محسوس ہونے سے پہلے ہی ان پُرشباب لمحوں کا گلا مروڑ دیا تھا:

''ڈگر ڈگر کرتی گردن پر بیماروں جیسے چہرے کا پنجر، کھچی جیسی کلائیاں اور بانس جیسی پنڈلیاں، جذبات و طمانیت سے عاری چہرہ...

بھلا یہ بھی کوئی جوانی ہوئی!

جوانی تو وہ ہوتی ہے جس کا چرچا ارد گرد پھیلے، منگری چڑھ کر بولے لیکن...

شہزادی کی جوانی تو گھر آنگن کی دو گز اونچی دیواروں سے باہر جھانک کر بھی نہ دیکھ سکی۔''

(پلکوں سے پلکوں تک، نکہت افلاک، ص 53)

شکنت سے بھی کئی سال بڑی شہزادی، تقسیم ہوتی ہوئی روٹی کے مرکزی نقطے کے باہر نکل ہی نہیں پائی تو کیسے اس کی جوانی منگری چڑھ کر بولتی یا اس کے چرچے ارد گرد پھیلتے۔ اس کی ماں کی ممتا پر بھی معاشی بدحالی گھیرا ڈالے ہوئے تھی، ماں کو بھی کبھی شہزادی کی جوانی کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تب باپ کی آمدنی جتنی تھی آج بھی آٹھ بھائی بہنوں کی پیدائش کے بعد بھی جامد آمدنی نے روٹی کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں کیا بالآخر ہر سال اس کی روٹی کو ہی تقسیم ہونا پڑا جو شہزادی کے لیے دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس کا ایک حل قدرت نے نکالا کہ وبائی مرض میں مبتلا ہو کر اس کے تین چھوٹے بھائی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ روٹی کے لیے جوجھ رہی شہزادی کی نفسیات کو اس اندوہ ناک ماحول میں بھی اطمینان بخش طمانیت کھوج نکالنے میں دیر نہیں لگی، کیونکہ اس کے لیے تین بھائیوں کی جدائی، کوئی بڑے غم سے آشنا کرنے والی بات نہیں تھی کہ اس نے تو بھوک کو ہی دنیا کا سب سے بڑا غم اور روٹی کو سب سے بڑی خوشی تصور کر لیا تھا۔ اس لیے ان تین اموات سے اسے ایک طرح کا سکون ملا کہ ان تین جانوں کے صدقے آج اس کے حصے میں روٹی کا بڑا ٹکڑا آئے گا، مگر جوں ہی مرے ہوئے بیٹوں کی جدائی میں اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کے ساتھ غم کے اتھاہ سمندر میں مستغرق ماں کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ لرز گئی:

''ماں، تو نے اس بار بھی، اس راز کو پا تو نہیں لیا، جو میری بھوک کا فتنہ ہے، ماں میں حوا کی بیٹی ہوں، جو ماتھے کا تلک تو بن سکتی ہے لیکن کلنک نہیں بن سکتی۔'' اور حوا کی اس وفا شعار بیٹی نے دل ہی دل میں اپنے گناہ کی تلافی کی صورت میں پہلے سے زیادہ ہاتھ کھینچ کر روٹی کھانے کا عہد کر لیا۔'' (پلکوں سے پلکوں تک، نکہت افلاک، ص 57)

زندگی کے اس ایک لمحے نے روٹی کی ہوس میں چور بنی بیدار شہزادی کی سترہ اٹھارہ سالہ ریاضت پر پانی پھیر دیا، مگر اس حسرت بھری عمارت کے ملبے سے جھانک رہی حیات انسانی کی سب سے بڑی نورانی سچائی نے، روٹی کی طرف بے وقعت بڑھتے ہوئے ہاتھ کو کھینچ کر اس کے حصول کی تگ و دو کی راہ میں پیش آنے والی صعوبتوں کی سچائی سے ہمکنار کر دیا۔ اپنے حصے کی روٹی کے لیے قربانی کے اس جذبے نے خونی رشتوں میں جکڑے ہوئے بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا۔ اب اس نے اپنے لیے روٹی کے بارے میں سوچنا ہی بند کر دیا۔ بڑھ کر باپ کے بازو پکڑ لیے اور اونچی اونچی عمارتوں پر پتھر چننے کا کام کرنے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ یہی اس کے لیے جنت ہے، یہی وہ جزیرہ ہے جہاں کی وہ شہزادی ہے۔

> **دونوں افسانوں کے مرکز پر روٹی کے لیے جد و جہد موجود ہے جہاں ایک طرف یہی روٹی شکنت کو زندگی کی کڑوی حقیقت سے آشنا کرواتی ہے وہیں دوسری طرف روٹی کے حصول کے انتہائی عروج پر پہنچ کر شہزادی کو زندگی برتنے کا ہنر سکھاتی ہے۔**

آج سے تقریباً پینتالیس سے پچاس سال پہلے لکھے جانے والے اس افسانے کے ذریعے نکہت افلاک نے شہزادی کی طرح ایسی ہی کئی لڑکیوں کو زبان عطا کر دی ہے۔ اپنے لیے جینے کے بجائے اوروں کو سہولیات فراہم کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دینے کا عمل جو ازلی سکون مہیا کراتا ہے وہ بیان کا محتاج نہیں۔ یہاں روٹی کی تو تقسیم ہوتی ہے مگر شہزادی کا ذہن تقسیم ہوتے ہوتے یکسر سنبھل جاتا ہے، روٹی کے حصول کی راہ میں مزین اس ایک نقطے کی تلاش کر لیتا ہے جہاں ٹھہر کر بڑے بڑے فلسفی صدیوں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

دونوں افسانوں کے مرکز پر روٹی کے لیے جد و جہد موجود ہے جہاں ایک طرف یہی روٹی شکنت کو زندگی کی کڑوی حقیقت سے آشنا کرواتی ہے وہیں دوسری طرف روٹی کے حصول کے انتہائی عروج پر پہنچ کر شہزادی کو زندگی برتنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ اس طرح یہ دو افسانے موضوعاتی مرکز کی یکسانیت کے باوجود اپنے اپنے منفرد لب و لہجے کے سائبان تلے بے حیثیت روٹی کے پُراسرار بیان میں محصور، اپنے خالق کی تخلیقی عظمت کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

■

Shazia Tamkeen
Dhoom Nagar Degree College
Dham Nabgar
Bhadrak - 756117 (Odisha)
Mob.:8320380244

ماضی تا حال

سیوان میں ادبِ اطفال

ارشاد احمد

بچے مستقبل کے معمار ہیں۔ قوم وملت کے انمول خزینہ ہیں۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت جتنی اچھی ہوگی قوم کا مستقبل اتنا ہی تابناک ہوگا۔ اس لیے ہر زبان میں بچوں کے ادب پر خاص توجہ دی جاتی ہے تاکہ ان کی ذہنی و فکری ذہن سازی کا کام مثبت طریقے سے ہو سکے۔

امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے ادب اطفال کا آغاز ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ کافی دراز ہو چکا ہے اور ثمر دار درخت کا روپ لے چکا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر بچوں کے ادب پر کافی توجہ دی جارہی ہے۔ کئی فنکار ایسے ہیں جو صرف بچوں کے لیے ہی لکھتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں سے منسوب تحریروں، شعری مجموعوں، کہانیوں اور ناولوں کا وافر ذخیرہ وجود میں آچکا ہے۔ بچوں کے لیے معنون چند رسائل کی اشاعت بند ہوئی ہے تو چند دوسرے رسالے بڑی آب وتاب سے شائع ہورہے ہیں۔ یہ رسالے معماری اور معیاری ہیں۔ ان کی طباعت رنگین، صاف ستھری اور دلکش ہے۔ اس گرانی کے دور میں ان کی قیمت بھی مناسب ہے۔ آج یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں ادب اطفال اپنا ایک مسلمہ اور قابل رشک حیثیت ومقام رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر دن مفید، کارآمد اور دلچسپ اضافے ہورہے ہیں اور نئے نئے موضوعات، فکر مند خیالات، اصلاحی و معلوماتی کہانیوں اور مقابلہ جاتی تحریروں سے اردو میں ادب اطفال مالا مال ہورہا ہے۔ متعدد رسالوں کے ادب اطفال پر خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں اور ملک کے کئی مقامات پر سیمناروں کا بھی انعقاد عمل میں آیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل قریب میں ادب اطفال کا انسائیکلوپیڈیا بھی تیار ہوجائے گا۔

دوسرے صوبوں کی طرح بہار میں بھی بچوں کے ادب میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ چند قلم کار ایسے ہیں جو بڑی تن دہی، نیک دلی اور جانفشانی سے ادب اطفال کی مختلف اصناف میں تخلیقی کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ لیکن ملک گیر سطح پر جب ادب اطفال کے قلم کاروں کی فہرست سازی ہوتی ہے تو اس میں بہار کے کئی اہم نام شامل نہیں ہوتے ہیں۔ اس مضمون کی غرض و غایت یہی ہے کہ ادب اطفال کے میدان میں جو قلم کار سرگرم ہیں یا ان کی ادبی خدمات جو منظر عام پر آچکی ہیں ان سے قارئین کو متعارف کرایا جائے۔

سیوان ضلع اہل علم و ہنر کا مولد ومسکن رہا ہے۔ دبستان عظیم آباد کے قیام کے زمانے سے ہی یہاں شعرو ادب کی محفلیں سجنے لگی تھیں۔ ادبا، شعرا وعلما کی ایک بڑی جماعت سیوان اور مضافات میں جمع ہوگئی تھی۔ یہ قلم کار مختلف ادبی اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے تھے۔ سیوان ضلع کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں اردو لائبریریاں کثیر تعداد میں موجود تھیں جن سے شعرا وادبا نے خاطر خواہ کسب فیض کیا ہے۔ سیوان کے اطراف اور دور دراز گاؤں کی حالت بھی اچھی تھی جہاں ادبا، شعرا کی محفلیں بڑے کروفر کے ساتھ سجتی تھیں۔ سیوان میں ادب اطفال اور بچوں کے لیے درسی کتابوں کی نشر واشاعت کی اچھی روایت ملتی ہے۔ اس ضلعے میں 1897 میں پریس قائم ہونے کے بعد رسالوں کی اشاعت ہونے لگی۔ یکے بعد دیگرے متعدد پریس قائم ہوئے اور ان میں ادبی، نیم ادبی اور سیاسی تخلیقات شائع ہونے لگیں۔

مولوی نور الہدیٰ یکتا کا شمار سیوان کے قادر الکلام شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیشہ درس وتدریس تھا۔ آپ نے آزادی سے قبل 1946 میں اقبال پریس قائم کیا۔ مولوی یکتا پریس کا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ ڈاکٹر مفتاح الہدیٰ کے مطابق اقبال پریس میں رسیدات، عیدی کارڈ، گلدستۂ سخن، اشتہارات، شادی کارڈ، شجرہ، مشاعروں کی روداد اور اعلان نامے وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ اسی مطبع میں آپ نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی شائع کیں۔ آسان تاریخ ہند، آسان جغرافیہ، علم صحت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں یکتا نے بچوں کے لیے کچھ درسی کتابیں بذات خود مرتب کیں جو ان کے ذاتی مطبع سے شائع ہوئیں۔

(یکتا سیوانی: ڈاکٹر مفتاح الہدیٰ، ص 23)

(1) اردو زبان کا جدید آسان قاعدہ۔ حصہ اوّل (2) قواعد بغدادی۔ (3) پرائمری تاریخ ہند۔ (4) تاریخ ہند (5) پرائمری جغرافیہ (6) فرہنگ خیابان لالہ زار حصہ دوم (فارسی کی درسی کتاب) (7) شرح پارسی نو، حصہ اوّل (8) کلید بستان عجم

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ یکتا نے 'المفید' نامی بچوں کا ایک رسالہ 1922 میں جاری کیا۔ اس کی اشاعت دواخانہ رہنمائے صحت سیوان اور طباعت 'اصلاح' پریس کجھوہ، سیوان سے ہوتی تھی۔ 16 صفحات پر مشتمل رسالے کا سائز 14cmx23cm تھا اور سطروں کی تعداد 20 تھی۔ قیمت فی پرچہ دو آنے تھی۔ سالانہ چندہ مع محصول ڈاک لوکل آٹھ آنے اور مفصل بارہ آنے تھا۔ لیکن چند شماروں کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا۔ یکتا نے ایک قلمی رسالہ 'بچوں کی دنیا' مرتب کیا تھا جو ان کے ذہن، ذوق اور عمر کو دھیان میں رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔

علامہ جمیل مظہری نثر اور نظم دونوں اصناف پر کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کی شہرت ایک مستند ومعتبر شاعر کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے الگ سے کوئی یادگار مجموعہ تیار نہیں کیا۔ لیکن شاعری میں آپ نے بچوں کے لیے قطعات اور نظمیں لکھی ہیں۔ اپنے لڑکوں کے لیے جو قطعات کہے ہیں وہ ان کے عادات واطوار کے عین مطابق ہیں۔ 'عکس جمیل' میں ایک

نظم 'ایک طفل شریر و عجیب سے' ملتی ہے۔ اس نظم میں علامہ جمیل مظہری نے ایک شریر بچے کی حرکات وسکنات کا تذکرہ پرلطف انداز میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

دے خدا تم کو عمر اور اقبال
ہے یہ کیسی تلاش میرے لال
اس کو چھوتے ہو اس کو چھوتے ہو
اور پھر چھو کے چھوڑ دیتے ہو
اپنی بے چینی جستجو کا رخ
ایک لمحے میں موڑ دیتے ہو
کتنے بے تاب و مضطرب ہو تم
ملتفت ہو کہ مجتنب ہو تم
اپنی عادت سے بے نظیر ہو تم
ایک پہنچے ہوئے فقیر ہو تم
ٹوٹی چپل سے کھیلتے ہو تم
لال گیندوں سے التفات نہیں

علامہ جمیل مظہری نے اپنے نواسے میر ضیا سلمۂ کی ہجو اور پوتا میر فضل اللہ کی مدح میں مثنوی لکھی ہے۔ آپ نے اپنے نواسے حیدر اور نواسی منہاز کے لیے طویل لوریاں لکھی ہیں۔ یہ لوریاں نصیحت آمیز اشعار پر مشتمل ہیں۔ یہ کافی دلچسپ، موثر اور پرلطف ہیں۔ آپ کی ساری شعری تخلیقات جو بچوں سے منسوب ہیں اگر الگ کر کے مرتب کیا جائے تو ایک کتاب ہو سکتی ہے۔

میں مرد مسلمان میر ضیا　　تم اموئے شیطان میر ضیا
تمھارا یہ دست تعدی و جور　　ہمارا گریبان میر ضیا
ستالو ہے نانا کی قسمت یہی　　ستالو میری جان میر ضیا

دعا یہ ہے دے روز جہانسا تمھیں
ستائے تمھارا نواسہ تمھیں
تمھاری صراحی میں کر کے پیشاب
رکھے روز گرمی میں پیاسا تمھیں

احمد جمال پاشا کا آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ لیکن دوسری شادی کے بعد آپ نے ہجرت کی اور سیوان میں اقامت گزیں ہوئے۔ 1976 میں ان کی تقرری زیڈ اے اسلامیہ کالج (سیوان) میں اردو استاذ کی حیثیت سے ہو گئی۔ ظرافت نگاری اور انشائیہ نگاری کے شعبے میں آپ کے کارنامے نا قابل فراموش ہیں۔ بچوں کے لیے بھی آپ کی تخلیقات ہیں اور آپ نے بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ آپ نے کیتھلین آرناٹ کی کتاب 'بہادر ٹمبا' کے نام سے ترجمہ کیا جس کی اشاعت 1973 میں ہوئی۔ 'طلسمی کتا' کی اشاعت 1972 میں ہوئی۔ آسمانی یاقوت ترجمہ شدہ کتابچہ ہے۔ جو 1972 نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ دنیا کی لوک کہانیاں، کی اشاعت بہار اردو اکادمی پٹنہ سے 1983 میں ہوئی۔ اس میں مختلف ممالک کی لوک کہانیاں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ہندی میں شائع شدہ بالشتے کی گھنٹی جیبی سائز کی کتاب ہے جو، گیان بھارتی بال پاکٹ بکس سے شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں 'ہماری نظمیں' کی اشاعت 1979 میں بہار سرکار نے کرائی۔ یہ ایک درسی کتاب تھی جسے ڈاکٹر زبیر احمد کے ساتھ مل کر احمد جمال پاشا نے مرتب کیا تھا۔

کریمیہ ہائی اسکول جمشید پور سے درس وتدریس کے پیشے سے حسن وظیفہ یاب محمد ولی اللہ موضع محمد آباد پوسٹ بڑہریا کے مکیں ہیں۔ آپ کی پیدائش 8 جنوری 1935 کو ہوئی۔ مدرسہ عزیزیہ، بہار شریف سے فاضل اور بہار یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کرنے کے بعد ٹیچر ٹریننگ میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کا تقرر کریمیہ ہائی اسکول جمشید پور میں اردو اور فارسی کے استاذ کے طور پر ہوا۔ جب آپ استاذ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے تو انھیں محسوس ہوا کہ اردو اور فارسی کے قواعد و کمپوزیشن کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے آپ نے اردو اور فارسی کے قواعد و کمپوزیشن کی کتابیں لکھیں جو مشترکہ بہار و جھارکھنڈ کے نصاب میں شامل ہوئیں۔ ان کے علاوہ آداب نگارش (چار حصوں میں) فارسی قواعد اور آسان اردو قواعد (چار حصوں) میں تحریر کیں جو بہار اور جھارکھنڈ میں اردو طلبہ کے لیے کافی مفید اور کارآمد ثابت ہوئیں۔

سرور جمال نے سیوان کے ایک متمول خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ گریجویشن کے بعد پٹنہ سے بی ایڈ کیا اور راج بنسی دیوی ہائی اسکول میں اردو تدریس کے فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں لکھنؤ سے ایم اے (اردو) کیا اور یونیورسٹی میں پہلا مقام حاصل کیا۔ اس کے بعد دویا بھون مہیلا کالج میں بطور اردو لیکچرار بحال ہوئیں اور وہیں سے سبکدوش ہوئیں۔ آپ نے بچوں کے لیے مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ معلوماتی مضامین اور سبق آموز کہانیاں لکھیں، جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں۔ آپ کی آخری تخلیق 'عمر بن عبدالعزیزؒ ہے جو بچوں کا ماہنامہ امنگ نئی دہلی میں شائع ہوئی۔ آپ نے بچوں کے لیے بنیادی قواعد اردو (دو جلدوں میں) مع رنگین تصاویر شائع کیں۔

ادبی دنیا میں احمد مشکور کے نام سے معروف مشکور احمد صدیقی کا آبائی وطن سیوان ضلعے کی مردم خیز بستی ہری ہانس ہے۔ آپ نے گورکھپور میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے ریلوے میں ملازمت کا آغاز کیا اور وہیں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ احمد مشکور نے اردو ادب کی دیگر اصناف مثلاً کہانیاں، خاکے، مزاحیہ ڈرامے، کالم نگاری اور انشائیہ نگاری میں بھی قابل قدر نگارشات کی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے ادب اطفال میں لائق تحسین کارنامے انجام دیے ہیں۔ بچوں کی ذہنی نشوونما اور ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے لکھنؤ میں انجمن ادب اطفال قائم ہوا تھا۔ جب جھارکھنڈ اور آسام کے سابق گورنر جناب سبط رضی صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے اور سعد الدین احمد عندلیب اس کے سیکریٹری بنے تو اس کی سرگرمیاں کافی تیز ہو گئیں۔ احمد مشکور صاحب 1958 سے ہی اس انجمن سے وابستہ رہے اور مختلف طرح کے پروگراموں کو کرانے اور کامیاب بنانے کی ذمے داریاں نبھاتے رہے۔ سید سبط رضی سے آپ کے تعلقات گہرے اور نہایت خوشگوار رہے۔ آپ نے لکھنؤ سے شائع ہونے والا بچوں کا مقبول رسالہ 'ثانی' کی ادارت 1967 سے 1972 تک کی۔ آپ سے قبل اوصاف احمد اور احمد ابراہیم علوی اس رسالے کی ادارت کر چکے تھے۔ آپ کی ادارت میں ثانی نے توقع سے زیادہ ترقی کی۔ 1968 میں بچوں کے لیے ایک ناول ننھے جاسوس لکھا۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن 2013 میں منظر عام پر آیا۔ راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں دوسرا ایڈیشن موجود ہے۔ احمد مشکور نے ثانی میں شائع شدہ کہانیوں اور نظموں کا انتخاب

مرتب کر کے 'ٹافیاں' کے نام سے 2018 میں شائع کرایا۔

جہاں گیرانس سیوان میں اردو ادب کے مرد مجاہد ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ اب متقاعد زندگی گزار رہے ہیں۔ جب آپ مغربی بنگال میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو وہیں محمد حسین آزاد سے ملاقات ہوئی۔ وہ 'دیوار' نامی رسالہ نکالتے تھے۔ انھوں نے ہی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے کی ترغیب دی اور مشق کرایا۔ کچھ دنوں کے بعد جہاں گیرانس سیوان آگئے اور ثانوی تعلیم کے لیے زیڈ، اے، اسلامیہ کالج سیوان میں داخلہ لیا۔ یہاں احمد جمال پاشا کا سایۂ گسترانہ حاصل ہوا۔ ان کی سرپرستی میں متعدد مضامین اور انشائیے لکھے جو موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ قلیل آمدنی اور وسائل کے فقدان کے باوجود موضع رانی پور سے 'شعلہ' 'افکار' جاری کیا جو خالص ادبی اخبار تھا۔ اس میں بچوں کے لیے بھی مضامین اور کہانیاں شائع ہوتی تھیں۔ جہاں گیرانس نے بچوں کے لیے حسب ذیل کتابیں تصنیف کیں۔ پاکیزہ خطوط (دو جلد میں) جدید اردو قاعدہ۔ اس کتاب پر ڈاکٹر ظفر کمالی کا بھی نام درج ہے۔ جدید ٹیبل بک، مینار نور اور عظمت کے پھول وغیرہ۔ مینار نور (1980) اور عظمت کے پھول (1987) پر بہار اردو اکادمی نے انعامات دیے۔ آج بھی جہاں گیرانس ادب اطفال میں سرگرم ہیں۔ بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ 'کہانیاں' کے نام سے تیار ہے۔

ظفر کمالی کا تعلق سیوان ضلع کے موضع رانی پور سے ہے۔ زیڈ، اے اسلامیہ کالج سیوان میں آپ فارسی کے استاذ ہیں لیکن اردو ادب میں آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ آپ کی پہچان ایک ناقد، محقق، ظرافت نگار، شخصی مرثیہ گو، مترجم، مقدمہ نویس، صحافی اور سوانح نگار کے طور پر ہے۔ ڈاکٹر ظفر کمالی نے صنف رباعی میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بہار میں رباعی گو شعرا کی جب فہرست سازی کی جائے گی تو موصوف صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہوں گے۔ آپ کا رباعیوں کا دیوان 'خاک جستجو' شائع ہو چکا ہے۔ ادب اطفال پر ڈاکٹر ظفر کمالی کی تخلیقات وقیع، لائق تحسین اور قابل قدر ہیں۔ 'بچوں کا باغ' موصوف کا بچوں کے لیے پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف عنوانات پر بچوں کی ذہنیت اور شوق کا خیال رکھتے ہوئے بیس نظمیں ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 2014 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) نے شائع کیا ہے۔ نظم 'یتیم لڑکا' کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

وہ بیٹھا ہے لڑکا جھکائے جو سر
اٹھاتا نہیں ہے کبھی جو نظر
ٹپکتا ہے چہرے سے جس کے ملال
کبھی جانتے ہیں کہ ہے خوش خصال
خزاں بن کے آئی جو باد نسیم
تو بچپن میں ہی ہو گیا وہ یتیم
اچانک ہی اجڑا امنگوں کا باغ
بجھا اس کی خوشیوں کا روشن چراغ
امیدوں کا شعلہ لپکتا نہیں
چہکنے کے دن ہیں چہکتا نہیں
بہت غم زدہ ہے بہت ہے اداس
چلو چل کے بیٹھیں ذرا اس کے پاس
وہ لڑکا اگر مسکرانے لگے
تو اپنی محبت ٹھکانے لگے

ڈاکٹر ظفر کمالی کی بچوں کے لیے دوسری کتاب 'چہکاریں' ہے۔ بچوں کے عادات واطوار اور نفسیات پر مشتمل 266 رباعیوں کا مجموعہ 2014 میں طبع ہوا۔ ان رباعیوں میں بچوں کی سادہ ذہنیت، اول جلول حرکتیں، غصے میں روٹھنا اور معمولی چیز پر مان جانا، بچپن کی بے فکری اور موج و مستی اور عجیب و غریب کھیل تماشوں پر پر لطف طریقے سے اشعار کے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر کمالی نے بچوں کی مرغوب غذاؤں، چرند و پرند اور جانوروں کے متعلق بھی رباعیاں کہیں ہیں۔

گوریوں کا اس میں کاشانہ ہے
تیتر ہیں ان کا پانی دانہ ہے
مرغی، مرغا، توتا، میناسب ہیں
تیرا گھر ہے یا چڑیا خانہ ہے

42 نظموں اور 13 رباعیات پر مشتمل 'حوصلوں کی اڑان' ڈاکٹر ظفر کمالی کا بچوں کے لیے تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس میں موصوف نے بچوں کے جذبات و نفسیات اور ذہنی و فکری نشو و نما کے مد نظر اصلاحی، اخلاقی اور سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ موضوعات میں تنوع ہے، طرز ادا پر لطف ہے اور زبان سلیس و رواں ہے۔ رباعیات میں بھی بچوں کی ذہنیت کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

ہمتوں کا جہان باقی رکھ   حوصلوں کی اڑان باقی رکھ
کام دشوار ہے تو کیا پروا   راہ پر خار ہے تو کیا پروا
حوصلے جب اڑان بھرتے ہیں   چاند پر جا کے وہ ٹھہرتے ہیں

جواں سال شاعر التفات امجدی پیشے سے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا تعلق سیوان کے ایک معزز علمی اور صوفی خاندان امجدیہ سے ہے۔ صنف شاعری میں آپ کی تخلیقات اردو ادب کے لیے اہم اضافہ ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ موصوف کے تین شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جن میں 'ٹافیاں' بچوں کے لیے رباعیات کا مجموعہ ہے۔ ٹافیاں ایک سو چالیس رباعیات پر مشتمل ایک خوبصورت گلشن کے مانند ہے جس میں ترحم، خدمت خلق، علم، عقل مندی، محنت، لگن، تہذیب، وقت کی اہمیت، عزم و استقلال جیسے موضوعات پر رباعیوں کے پھول کھلے ہیں۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر التفات امجدی کو ان کے شعری مجموعے 'چٹکنے پات' پر 2014 میں ساہتیہ اکادمی یووا پرسکار مل چکا ہے۔ یہ ایوارڈ حاصل کرنے والے موصوف سیوان کے اول قلم کار ہیں۔ ڈھائی سو رباعیات پر مشتمل دوسرا بچوں کے لیے شعری مجموعہ 'آئس کریم' تیار ہے۔ رسالوں میں تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' اپریل کے شمارے میں آپ کی نظم 'ویر بچے' شائع ہوئی ہے۔

تقدیر کرو اپنی روشن پیارے
خوشیوں سے بھروا اپنا دامن پیارے
محنت سے اگر علم کروگے حاصل
کھاؤ گے ملائی اور مکھن پیارے
جو وقت دبے پاؤں گزر جائے گا
تا حشر پلٹ کے نہ کبھی آئے گا
تو قدر اگر نہیں کرے گا اس کی
پچھتائے گا پچھتائے گا پچھتائے گا

ان کے علاوہ چند ایسے قلم کار ہیں جن کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی لیکن بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں۔ سعدیہ پروین کی چند کہانیاں بچوں کا ماہنامہ امنگ میں شائع ہو چکی ہیں۔

کتابیات

1 یکتا سیوانی، احوال و تدوین کلام: ڈاکٹر مفتاح الہدیٰ، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95، 2011
2 عکس جمیل: جمیل مظہری، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 4، 1999
3 آئینۂ حیات: احمد مشکور، ایلائٹ پریس، بالدہ روڈ لکھنؤ 2017
4 ٹافیاں: مرتب، احمد مشکور، امین سلونوی میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی لکھنؤ 2019
5 بچوں کا باغ: ظفر کمالی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014
6 چہکاریں: ظفر کمالی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95، 2014
7 حوصلوں کی اڑان: ظفر کمالی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95، 2020
8 ٹافیاں: ڈاکٹر التفات امجدی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95، 2013

■

Dr. Irshad Ahmad
1731, Amina Manzil, Islamia Nagar
Seewan - 841226 (Bihar)
Mob.:9431644722

کامکس اور ادب اطفال

نبی شہاب

ہم میں سے ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ بچے میں کم عمری یا یوں کہیں کہ بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرنے کی اپنی اہمیت ہے اور یہ بات تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ بچوں کو کامکس اور کارٹون سے کتنی رغبت ہوتی ہے۔ رنگ، تصویریں اور کہانیاں وہ تین چیزیں ہیں جن کی طرف بچے سب سے پہلے متوجہ ہوتے ہیں۔ سیکھنے کے سفر کے آغاز میں رنگ، تصویریں اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ان کے ذہن پر اپنا ایک خاص اثر مرتب کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی بچے کے ہاتھ میں کتابیں آتی ہیں تو وہ سب سے پہلے تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ رنگوں کی جاذبیت اسے ان تصویروں کو دیکھنے پر مجبور کرتی ہے اور جب کوئی شخص اس سے ان رنگوں اور تصویروں میں چلتی پھرتی کہانیوں کو بیان کرتا ہے تو اس کا ذہن ایک خاص رفتار سے تربیت حاصل کرتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں بچوں میں کتب بینی کے شوق کو مہمیز دینے کے لیے کارٹون اسٹرپس اور کامکس کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ بلا جواز نہیں ہے۔ جس طرح ادب عالیہ کے مطالعے کے شوقین لوگوں نے جاسوسی ادب یا یوں کہیں کہ پاپولر لٹریچر کو بطور زینہ استعمال کیا ہے، اسی طرح بچوں میں زبان اور ادب نیز مطالعے کے شوق کو ہوا دینے کے لیے کامکس اور کارٹون اسٹرپس نہایت ہی کارآمد ثابت ہوتے رہے ہیں۔ کارٹون اسٹرپس اور کامکس بچوں کی ذہنی اور فکری سطح سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں ان کی دلچسپی عام کتابوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے کئی فوائد ہیں۔ کم وقت میں زیادہ صفحات، زیادہ تصویریں اور چند اہم خیالات کے ساتھ انھیں ایک ذخیرہ الفاظ بھی حاصل ہوتا ہے، درست املا اور صرف و نحو سے واقفیت ہوتی ہے، علم اور یادداشت میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور لکھنے کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے فوائد ہیں جو بچوں کو ان کارٹون اسٹرپس اور کامکس کے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں۔

بچوں کے ادب کی نوعیت کے حوالے سے جو بنیادی باتیں کہی جاتی رہی ہیں ان میں یہ ہے کہ، بچوں کا ادب دلچسپ ہو، ممکن ہو تو اس میں تصویریں ہوں، بچوں کے لحاظ سے اس کی زبان آسان اور عام فہم ہو، بات چیت یا مکالمے کا انداز زیادہ سے زیادہ اختیار کیا جائے، تخلیق ایسی ہو جو سائنسی نقطۂ نظر کو پیش کرے نہ کہ توہم پرستی اور دیگر نظریات کو بچوں کے اندر ابھارے۔ اس کے ساتھ ہی تفریح بچوں کے ادب کی ضروری شرط ہے، ورنہ بچے کچھ ہی دن میں کہانی یا نظم سننے میں دلچسپی لینا ترک کر دیں گے۔ اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ کامکس بچوں کی دلچسپی کا سب اچھا سامان ہوسکتے ہیں۔

کامکس دراصل قصہ گوئی کا ایک وسیلہ ہے جس میں سلسلہ وار تصاویر کے سہارے کہانی کا بیان ہوتا ہے۔ ان تصاویر کے ساتھ تحریری بیانیے اور دیگر بصری آلات کا استعمال بھی کامکس میں کیا جاتا ہے۔ کامکس کو اس کے روپ میں لانے کے لیے جو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ان میں اسپیچ ببل، کہانی کے متعلق تعارفی جملے اور بیانیہ شامل ہیں۔ کامکس کا بہت ہی خاص عنصر کارٹون اور تصویری خاکے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کارٹون اور تصویری خاکے کہانی کے بین السطور کی عکاسی کرتے ہیں۔

تقریباً تمام زبانوں میں کامکس کی ایک قدیم تاریخ رہی ہے۔ جدید یوروپی کامکس کی ابتدا 1830 کے آس پاس تسلیم کی جاتی ہے البتہ 1930 کی دہائی میں کامکس کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں کامکس کو خوب سراہا گیا۔ یہاں یہ عرض کردوں کہ انگریزی زبان میں کامکس مزاحیہ تصویری خاکوں کے لیے بولا جاتا تھا تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس لفظ کا استعمال سنجیدہ اور حساس بیانیوں کے لیے بھی کیا جانے لگا۔ چونکہ ابتدا میں لوگ کامکس کو سنجیدہ فن و ادب تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن بیسویں صدی میں کامکس کی مقبولیت نے سارے تصورات بدل کر رکھ دیے۔ حالانکہ والدین اور اساتذہ اسے آج بھی تعلیمی شعبے میں ایک بے جان ٹول (وسیلہ) ہی سمجھتے ہیں۔ جبکہ کامکس وہ تحریر ہوسکتی ہے جسے بچہ بغیر کسی رہنمائی کے سمجھنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں موضوع پر مزید گفتگو کروں، مناسب ہے کہ پہلے یہی عقدہ حل کرلیا جائے کہ آخر بچوں کو کامکس کیوں پڑھنے دیا جائے۔ اس کے اسباب کو چند نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

1 کامکس کی قرأت بچوں کو ان باتوں تک رسائی حاصل کرنے پر ابھارتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتیں۔ کامکس پڑھتے ہوئے بچے ڈائیلاگ (مکالمے) اور تصاویر پر انحصار کرتا ہے تاہم وہ ان باتوں پر غور کرتا ہے اور تصویر کی تفصیلات اسے جہاں تک لے جاتی ہیں اس کا ذہن ان تمام ابعاد تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی عمل سے بچے کی تصوراتی اور تخیلی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر سماج کو دیکھنے کا نظریہ فروغ دے پاتا ہے۔

2 بلاشبہ وہ بچے جو اپنی کتابوں کو جلد سے جلد ختم کرکے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہی بچے کامکس پڑھتے ہوئے بہت آرام سے مکمل پلاٹ اور تصویروں کو سمجھ کر انھیں اختتام تک لے جانے کی لاشعوری سعی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کامکس بچوں میں پڑھنے کے لیے دلچسپی پیدا کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

3 کامکس کی قرأت مختلف النوع کرداروں، حالات اور دیگر باتوں سے روشناس کراتی ہے۔ اس لحاظ سے بہت ہی کم وقت میں اور دلچسپیوں کے ساتھ بچے کو اپنے آس پاس کے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

4 وہ بچے جنھیں پڑھنا مشکلوں بھرا عمل لگتا ہے یا جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں، تو انھیں نہ صرف یہ کہ ایسی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں وہ پڑھ سکیں بلکہ انھیں ایسی کتابیں بھی چاہئیں جو ان میں کوشش کرتے رہنے کے لیے اعتماد پیدا کریں۔ کامکس کی کتابوں میں نہ صرف عمر کے لحاظ سے مواد فراہم کیا جاتا ہے بلکہ ان میں اضافی تصویریں اور عکس ہوتے ہیں، جو اس عمل میں معاون کا کردار ادا کرتے ہیں۔

5 کامکس بہت سے سنجیدہ موضوعات کو اپنے اندر سمونے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اس کی ایک روایت رہی ہے۔ ایسی صورت میں بچہ ابتدائی ایام سے ہی سماجی طور پر زیادہ گہری معلومات ان تصاویر اور عکس کے ساتھ حاصل کرسکتا ہے جنھیں بآسانی کامکس میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس حوالے سے ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ ہمیں اس بات سے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہیے کہ آج کے اس

تیز رفتار اور دن بہ دن ترقی کی جانب پیش قدمی کرنے والے عہد میں ہمارے بچے کن تفریحی ذرائع کے ساتھ بڑے ہو رہے ہیں؟ سماج میں برائیوں اور تشدد کا عنصر جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ ٹی وی اور سوشل میڈیا پر ہزاروں واہیات چیزیں بچوں کے ذہن کو کند اور برائیوں کی جانب لپکنے والا بنا رہی ہیں۔ جو کارٹون ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں وہ مار دھاڑ، لڑائی جھگڑے اور طرح طرح کی خرافات سے پُر ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان کہانیوں کی ضرورت ہے جو بچوں میں بچپن سے ہی اچھے اخلاق و عادات کی اہمیت سے انھیں آگاہ کردیں۔ چونکہ عام کہانیاں جس طرح سے شائع کی جاتی ہیں، بچوں کی دلچسپی ان میں زیادہ نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے کامکس کے سہارے انھیں پڑھنے کا گرویدہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہوگا جس سے ان میں پڑھنے کی عادت جڑ پکڑے گی اور ان کو صحت مند تفریح کا ایک اچھا ذریعہ بھی نصیب ہوگا۔

میں یہاں اردو زبان میں کامکس کی مکمل روایت کا ذکر نہیں کروں گا البتہ یہ بتاتا چلوں کہ حال کے دنوں میں بچوں کے چند ایک رسالے ایسے ہیں جو کبھی کبھار کامکس کہانیاں اپنے رسالوں میں شائع کرتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر اردو میں کامکس کی صورت حال کچھ خاص اچھی نہیں ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں جن پر تفصیلی بات بھی کی جاسکتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کا سبب کچھ بھی ہو، یہ تو قطعاً نہیں ہے کہ کامکس کہانیاں پڑھی نہیں جارہی ہیں، یا لوگوں کی ان کہانیوں میں دلچسپی نہیں ہے یا پھر یہ کہانیاں بچوں کے ذہن پر منفی اثر مرتب کرتی ہیں۔ بلکہ اس کی سامنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں وہ افراد یا ادارے نہیں ہیں جو اس جانب توجہ دیں۔ بچوں کے ادب کے نام پر صرف کہانیاں لکھ دینا، نظمیں کہہ لینا اور پھر ان کو غیر جاذب قسم کے گیٹ اپ میں شائع کرادینا ہی ادب اطفال کی خدمت نہیں ہے بلکہ ادب اطفال پر مشتمل کتابوں کے اپنے منفرد تقاضے ہیں۔ بچوں کی دلچسپیوں اور ان کی ذہنی و فکری سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں تیار اور شائع کرنے کی اپنی اہمیت ہے جس کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کی بیس نظمیں لکھ کر اسے کتابچے کی صورت میں شائع کرا کر، دس بیس صفحے کی کتابوں کو 40-50 روپے کی قیمتوں میں فروخت کرنے کی ہوڑ مچی ہے۔ ایسے میں کامکس جیسی کسی قدر دقت طلب کتابیں کس طرح تیار کی جاسکتی ہیں یا ان کی جانب توجہ دینے کی کسے فرصت ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ شکایت بے جا ہے کہ بچے کتاب نہیں اٹھاتے، وہ پورا دن ٹی وی پر کارٹون دیکھنے یا موبائل پر گیم کھیلنے میں گزار دیتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ جب کتابوں کی صورت میں ان کی دلچسپیوں کا مواد دستیاب نہیں ہے تو پھر وہ اپنے لیے دستیاب تفریحی پروگرام تلاش ہی لیں گے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ موبائل اور ٹی وی کی لت کا منفی اثر بچوں کے ذہن پر پڑتا ہے اور اس سے ہر والدین بخوبی واقف ہیں۔ ایسے میں کامکس جیسی دلچسپ کتابوں کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے۔

بلاشبہ موجودہ حالات اردو میں کامکس کے حوالے سے بہتر نہیں ہیں کیونکہ اس جانب بہت کم توجہ دیا جارہا ہے تاہم اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم مستقبل کے لیے تیار نہ ہوں۔ اس سلسلے میں افراد اور ادارے مل کر چند امور انجام دے سکتے ہیں اور کامکس کی ایک توانا روایت کی ازسرنو داغ بیل ڈال سکتے ہیں۔ یقیناً مستقبل کی نسل کے لیے یہ ایک بہترین سرمایہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس حوالے سے چند ضروری اعمال جو انجام دیے جاسکتے ہیں۔

(الف) ورکشاپ کا انعقاد:

سب سے پہلے ورکشاپ منعقد کرائے جائیں جن میں تخلیق کار، آرٹسٹ دونوں شامل ہوں۔ ورکشاپ کا مقصد چند منتخب عناوین کے تحت کہانیوں اور تصویری خاکوں کا ڈھانچہ تیار کرنا ہو۔ یہ دھیان رکھا جانا ضروری ہے کہ کامکس کس عمر کے بچے کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔ کیوں کہ اسی صورت میں مناسب لفظوں اور بہتر موضوعات کا انتخاب کیا جاسکے گا اور پھر یہ کہ اسی کی مناسبت سے ان تصویری خاکوں میں رنگ بھرے جاسکیں گے جو کامکس کو اس کی اصلی شکل میں پیش کریں گے۔

چونکہ بات اردو کے حوالے سے ہو رہی ہے اس لیے غالب امکان ہے کہ ایسے آرٹسٹ بہت کم دستیاب ہوں جنھیں آرٹ کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے بھی واقفیت ہو۔ اس لیے آرٹسٹ اور تخلیق کار کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ضروری ہے کیونکہ ایسی صورت میں آرٹسٹ کو اسکرپٹ کی ضروریات اور کرداروں کا بیان نیز کہانی کے تمام زاویوں سے آگاہ کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ آرہے مسائل کو بھی حل کرنا ہوگا۔

(ب) مسابقوں کا انعقاد:

دوسری بات یہ ہے اسکولوں میں اس طرح کے مسابقے منعقد کرائے جاسکتے ہیں جس میں ہر درجے کے طالب علموں کے لیے الگ الگ موضوعات پر کامکس کی کہانیاں تیار کرائی جائیں۔ ان کے خیالات کو اچھی طرح پڑھا جائے، انھیں کی کہانیوں پر نئے سرے سے کہانیاں مرتب کی جائیں اور ان کے لیے تصویری خاکے تیار کیے جائیں۔ این سی ای آر ٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان یا اردو اکیڈمیاں سب مل کر بھی یہ کام کرسکتی ہیں۔ رسالے کامکس کہانیاں طلب کرسکتے ہیں۔

آئیے اب کامکس کی تیاری کن مراحل سے ہو کر تکمیل کو پہنچتی ہے، کا جائزہ لے لیا جائے۔

کامکس تیار کرنے کے مراحل میں سب سے پہلا مرحلہ کسی خیال کو ذہن میں ترتیب دینے کا ہے۔ اگر آپ نے کوئی خیال اپنے ذہن میں بُن لیا ہے، اور یہ طے کرلیا ہے کہ آپ کس طرح کا کامکس تیار کریں گے تو آپ اگلے مرحلے کی جانب پیش قدمی کیجیے اور کہانی کو لفظوں کا روپ دیجیے۔ کہانی کا ڈھانچہ تیار کیجیے، مکالمے تحریر کیجیے۔ یہ غلطی کبھی نہ کریں کہ پہلے تصویری خاکے بنالیں اور پھر اس کے مطابق بیانیہ خلق کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ ایسی صورت میں کئی دقتیں پیش آئیں گی۔ کہانی مرتب کرنے کے بعد تصویری خاکے تیار کریں۔ اسپیچ ببل اور بیانیہ کے لیے جگہیں مختص کرتے ہوئے اصل کرداروں کی حرکات کو تصویری خاکوں میں زندہ کریں۔ تصویریں بناتے وقت کرداروں کے ماحول کو بھی تصویری ذرائع سے پیش کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد تصویروں میں رنگ بھرنے کا مرحلہ آتا ہے۔

چاہے کہانیوں کا انتخاب ہو یا پھر تصویروں اور رنگوں کا، ہمیں یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ وہ کامکس کس عمر کے بچوں کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔ کیونکہ ہر عمر کے بچوں کا ذہن اور چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا ان کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ کہانیوں کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کہانیوں میں لڑائی جھگڑے اور تشدد سے لبریز منظرنامے یا مکالمے نہ تخلیق کیے جائیں۔ پیار محبت اور اخلاص و دوستی کے درس پر مبنی کہانیاں بچپن سے سکھایا جانا عہد حاضر کی بڑی ضرورتوں میں سے ہے۔

کامکس کی اہمیت اور ادب اطفال میں اس کی ضرورت کے حوالے سے یہ مختصر گفتگو اس لیے کی گئی ہے تاکہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہنے والے ادارے اس جانب بھی توجہ دیں اور اردو میں کامکس کی روایت زندہ کریں۔ اگر اس جانب توجہ دی جاتی ہے تو یقیناً مستقبل کی نسل اس سے ضرور مستفید ہوگی اور ہمیں اردو زبان اور اس کے رسم الخط سے واقف لوگوں کی بڑی تعداد میسر رہے گی۔

■

Razi Shahab
Assistant Professor, Department of Urdu
West Bengal State University
Berunanpukuria, Malikapur
Barasat, North 24 Parganas
Kolkata-700126 (West Bengal)
Mob. 9810332595

شاعرِ اطفال ابوالمجاہد زاہد

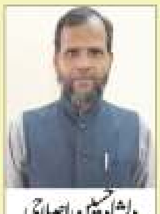

دلشاد حسین اصلاحی

مولانا ابوالمجاہد زاہد نے بچوں کی نفسیات، دلچسپی اور افتادِ طبع کو سامنے رکھ کر شاعری کی ہے۔ زندگی کا طویل عرصہ درس وتدریس سے وابستگی رہی، عمر بچوں سے اس قربت نے ان کے اندر ایک درک پیدا کردیا اس لیے بلا تردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اطفالی شاعری عملی اور مجرب ہے۔

''بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں،'' یہ مقولہ بڑا معروف ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ بچوں کی عمدہ تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام والدین اس طرف خاص توجہ صرف کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر تعلیم دلانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔

پہلے زمانے میں اہل ثروت اور ذی حیثیت لوگ اپنے بچوں کے لیے اتالیق متعین کرتے تھے، جو بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ان کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

تاکہ ان کے طلبہ سماج میں ایک اچھے انسان کا رول ادا کرسکیں۔ اپنے کام میں اساتذہ بے لوث ہوتے تھے، ان کے پیش نظر مادی منفعت سے ہٹ کر اپنے شاگردوں کے اندر انسانی جوہر پیدا کرکے مخلوق کا خادم اور خالق کا اچھا بندہ بنانا ہوتا تھا۔

ماضی میں اساتذہ اپنے خلوص وبے لوثی اور بے نیازی کی وجہ سے طلبہ ہی کے درمیان نہیں بلکہ پورے سماج میں عزت ووقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، آج زمانہ اور اس کی ترجیحات بہت کچھ تبدیل ہوگئی ہیں۔ اساتذہ بھی معلومات کی منتقلی کو فریضۂ تدریس سمجھنے لگے ہیں، طلبہ میں اعلیٰ اقدار اور حسن اخلاق کی نشوونما کو اہمیت ہی نہیں دی جارہی ہے، اس لیے دیکھنے میں آرہا ہے کہ طلبہ اور اساتذہ کا رشتہ ویسا مستحکم وعقیدت مندانہ نہیں رہا ہے جیسا کہ کبھی ہوا کرتا تھا، اقدار کے زوال میں جہاں بہت سے اسباب ہیں وہیں نصاب تعلیم کا حسن اخلاق واقدار کے مواد سے خالی ہونا بھی ہے۔ بچے پر نصابی تعلیم کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ بچپن کی پڑھی ہوئی چیزیں نقش کالحجر ہوتی ہیں۔ یعنی زندگی بھر یاد رہتی اور شعوری زندگی میں بڑا کام آتی ہیں۔ اس لیے اچھی نثر کے ساتھ ساتھ عمدہ شاعری اس دور کی ذہنی تربیت میں خاص اور اہم رول ادا کرتی ہے۔ اسی غرض اور مقصد سے ایسی چیزیں نصاب میں شامل کی جاتی ہیں۔

اردو زبان کا ابتدائی نصاب آج بھی مولوی اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر، چکبست وغیرہ کی اخلاقی اقدار پر مشتمل اطفالی شاعری کے بغیر مکمل تصور نہیں کیا جاتا۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کو اس میدان میں تقدم اور خدمات کے اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں پورا ایک نصاب مرتب کردیا تھا جو آج بھی بہت سے مقامات پر رائج ہے۔ وہ اطفالی ادب تخلیق کرنے والوں میں ایک بلند مقام پر فائز ہیں، ہم نے یوپی کے ابتدائی نصاب کی کتاب میں غالباً درجہ چہارم میں والدین اور استاذ کے تعلق سے یہ اشعار پڑھے تھے، جو آج تک ازبر ہیں۔

ہے ماں باپ کا پہلے رتبہ بڑا　　بعد ان کے حق ہے تو استاد کا
وہ تم کو سکھاتا ہے علم وشعور　　جہالت طبیعت سے کرتا ہے دور

ایسا ادب پڑھنے والا طالب علم نہ کبھی استاد کا احسان بھول سکتا ہے نہ کبھی زندگی میں اپنے ماں باپ کا نافرمان ہوسکتا ہے۔

فکری، لسانی، تربیتی اور بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر اردو میں شاعری کرنے والوں کی تعداد موجودہ دور میں بہت کم ہے اور جو شاعری ہورہی ہے وہ الا ماشاء اللہ اس معیار کی نہیں ہے کہ بچوں کے اندر اخلاقی اقدار کو بہت زیادہ پروان چڑھانے والی ہو، اور بچوں کے حسب حال اس کو بہت معیاری یا اعلیٰ کہا جاسکے۔

ادب اطفال کے تعلق سے خصوصاً شاعری پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو چند نمایاں ناموں میں مائل خیرآبادی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، پروفیسر مظفر حنفی اور شاگرد سیماب مولانا ابوالمجاہد زاہد ایسے اشخاص ہیں جو فکری وفنی خوبیوں، بچوں کی عمر وذہنی سطح اور نفسیات کو اپنے کلام میں ملحوظ رکھتے ہیں اور اپنی تخلیقات میں بچوں کے لیے اخلاقی اقدار کو سمو کر پیش کرتے ہیں۔

تربیتی زاویۂ نگاہ سے جب ہم مولانا ابوالمجاہد زاہد کی شاعری

کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اطفالی شاعری میں اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ بچوں کے اندر اخلاقی حسن پیدا ہو اور پروان چڑھے۔

مولانا ابوالمجاہد زاہد نے بچوں کی نفسیات، دلچسپی اور افتادِ طبع کو سامنے رکھ کر شاعری کی ہے۔ زندگی کا طویل عرصہ درس وتدریس سے وابستگی رہی، عمر بچوں سے اس قربت نے ان کے اندر ایک درک پیدا کر دیا اس لیے بلا تردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اطفالی شاعری عملی اور مجرب ہے۔ وہ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے بھی نہایت کامیاب شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کے فن کے سلسلے میں معروف ناقد ڈاکٹر ابن فرید نے ایک جگہ لکھا ہے:

''اچانک ایسا ہوا کہ میں سرکاری نوکری سے برطرف ہونے کے بعد مرکزی درسگاہ رامپور میں استاد ہو گیا۔ ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ناظم درسگاہ افضل حسین خاں صاحب مرحوم نے 'ہماری کتاب' کا پورا سیٹ نظر ثانی کے لیے میرے سپرد کر دیا۔ اس وقت تک یہ کتاب صحیح نصابی تقاضوں کے مطابق مرتب نہیں ہو سکی تھی... اس مہم جوئی میں مجھے بہت سے شاعروں سے مطلوبہ موضوعات پر نظمیں بھی لکھوانی پڑیں۔ زیادہ تر جن استاد شاعروں نے فکر سخن فرمائی وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ بچوں کا ادب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ زیادہ تر نظمیں موضوع کے لحاظ سے بچوں کے لیے ضرور لکھی گئیں لیکن زبان تکنیک اور لفظیات کے اعتبار سے نہ صرف غیر فنی تھیں بلکہ فطری روانی اور شعری آہنگ سے بھی محروم تھیں۔ میری نظر میں صرف ایک شاعر نصابی مطالبات کو سمجھ سکا اور بے حد مترنم نظمیں کہہ سکا۔ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد دل چاہنے لگا کہ اس شاعر سے پورے سیٹ کی تمام ہی نظمیں لکھوالی جائیں تاکہ واقعتاً بچوں کا ادب وجود میں آجائے۔ اس کے علاوہ دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ اس شخص سے ذاتی ربط ہو جائے۔ پھر جب 'ادارہ ادب اسلامی' کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو اس شاعر ابوالمجاہد زاہد سے ملاقات ہوئی۔''

(پیش لفظ 'ید بیضا' مجموعہ کلام: ابوالمجاہد زاہد، از: ڈاکٹر ابن فرید، ص9، مطبوعہ اکتوبر 1998)

ابوالمجاہد زاہد نے اپنی اطفالی شاعری کے ذریعے یہ کوشش کی ہے کہ ان کے اندر اخلاقی اقدار پروان چڑھیں، پڑھائی لکھائی اور محنت کا ذوق وشوق پیدا ہو، زندگی میں صاف صفائی اور سلیقہ مندی کی ترغیب ملے، ذہن توحید اور خوف خدا کی تعلیمات سے آراستہ ہوں، خدمت خلق کے جذبات سے بچے سرشار ہوں، اور تمام عادات رذیلہ سے اجتناب کرنے والے بن جائیں اور ساتھ ہی خصائل حسنہ کو اختیار کرنے پر برضا ورغبت ان کے اندر آمادگی پیدا ہو جائے، یہ چیز ان کی تمام نظموں میں اہتمام کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے عناوین متعین کرنے میں بھی بچوں کے مزاج ومعیار کو پیش نظر رکھتے ہیں، جو بچوں کو لبھانے والے اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان کی چند اطفالی نظموں کے مطالعے کی ایک جھلک پیش کی جارہی ہے۔

پھولوں سے بڑوں ہی کو نہیں بچوں کو بھی بڑی محبت ہوتی ہے۔ وہ اپنی نظم 'پھول' میں بچوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں کہ پھول کتنے رنگ کے ہوتے ہیں، کس کس وقت کھلتے ہیں۔ معلومات دینے کے بعد بچے کی فکری تربیت کے پیش نظر اس کی جیب پھولوں سے بھری دیکھ کر ماں کے ذریعے یہ مکالمہ کراتے ہیں۔

دیکھ کے امی بول اٹھیں ——— 'اے ہے اتنے سارے پھول
پھلواری کے مالک سے ——— پوچھ کے بھی ہو لائے پھول''
سن کے مجاہد بول اٹھے ——— ''کیوں لاتا چوری کے پھول
پھلواری کے مالک سے ——— پوچھ کے توڑے میں نے پھول
ناخوش ہو جاتا اللہ ——— لاتا جو چوری کے پھول''
امی نے خوش ہو کے کہا ——— ''ہنستا رہ اے میرے پھول''

چوری سے رکنے اور باز رہنے کی تعلیم ان کی اکثر نظموں میں ملتی ہے۔ وہ اللہ سے بچے کا

ابوالمجاہد زاہد نے اپنی اطفالی شاعری کے ذریعے یہ کوشش کی ہے کہ ان کے اندر اخلاقی اقدار پروان چڑھیں، پڑھائی لکھائی اور محنت کا ذوق وشوق پیدا ہو، زندگی میں صاف صفائی اور سلیقہ مندی کی ترغیب ملے، ذہن توحید اور خوف خدا کی تعلیمات سے آراستہ ہوں، خدمت خلق کے جذبات سے بچے سرشار ہوں، اور تمام عادات رذیلہ سے اجتناب کرنے والے بن جائیں اور ساتھ ہی خصائل حسنہ کو اختیار کرنے پر برضا ورغبت ان کے اندر آمادگی پیدا ہو جائے، یہ چیز ان کی تمام نظموں میں اہتمام کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔

رشتہ مضبوط رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اچھا انسان بن کر اس دنیا میں جیے اور خلق خدا اس سے فیض پائے۔ وہ اپنے طالب علم کو ضرر رسانی سے کوسوں دور دیکھنا چاہتے ہیں۔

'پنچھی سبھا' ایک مزیدار نظم ہے۔ جس میں اکتیس پرندوں کے نام گنوائے ہیں۔ منظر کشی بڑی عمدہ ہے۔ بچے شوق کے ساتھ اس کو پڑھتے ہیں۔ اگر ان پرندوں کو مختلف قسم کے انسانوں کا علامتی گروہ مان لیا جائے (میرا ماننا یہی ہے) تو یہ نظم انسانوں کا ایک بہترین اجتماع ہوگی۔ اس میں بہت سے شریک پرندے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم سب کا راجا کون ہے۔ پھر سب کی رائے سے 'مٹھو' یعنی توتے صاحب ان کے اس سوال کا دل لگتے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ اللہ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کا ذکر کرکے آخر میں یہ پیغام دیتے ہیں جس میں بڑی خوبی سے مذکورہ سوال کا جواب بھی آ گیا ہے۔

جس نے یہ سنسار بنایا ——— بس وہ ہے سب کا راجا
سب کا مالک سب کا داتا ——— سب کا حاکم سب کا راجا
ہم سب اس کو خالق مانیں ——— ہم سب اس کو رازق جانیں
اس کے آگے سر کو جھکائیں ——— اس کے ہی بندے کہلائیں

مٹھو میاں کی اس گفتگو اور جواب کو سن کر تمام پرندے بیک زبان بول اٹھتے ہیں کہ سچ ہے سچ ہے، سچ ہے سچ ہے نظم کے اختتام پر بچوں کا ذہن اس چیز کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ واقعی اللہ ہی ہمارا حقیقی رب اور مالک ہے، اور پھر اپنی اس حیثیت کے تناظر میں اس چیز کا بھی وہی سزاوار ہے کہ اسی کے سامنے سر جھکا کر اس کی بندگی کا اظہار و اقرار کیا جائے۔

ذریعہ تعلیم میں کتاب اور استاد طالب علم کے لیے دو اہم واسطے ہوتے ہیں، زاہد صاحب نے نظم 'استاذ' میں دونوں کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا ہے کہ ان کا رویہ اور برتاؤ ایک دوسرے کے لیے کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے۔

لکھاتا ہے تم کو پڑھاتا ہے تم کو ——— ادب اور سلیقہ سکھاتا ہے تم کو
بھلائی کی باتیں بتاتا ہے تم کو ——— وہ حیواں سے انساں بناتا ہے تم کو
سنو غور سے اس کی ہر اک نصیحت
کرو اپنے استاد کی خوب خدمت

جو تم اس کی تعظیم وعزت کرو گے ——— جو تم شوق سے اس کی خدمت کرو گے
جو تم دل سے اس کی اطاعت کرو گے ——— جو پوری کوئی اس کی حاجت کرو گے
تو اس سے بڑھے گی تمھاری ہی عزت
کرو اپنے استاد کی خوب خدمت

زاہد صاحب نے بچوں کے ذہن کے اندر استاد کی خدمت کے جذبے کو جاگزیں کیا ہے۔اس کی دو وجہیں بتا کر طالب علم پر واضح کر دیا ہے کہ اس کو کیوں ایسا کرنا چاہیے۔

'بچی عید' ایک ایسی نظم ہے جو بچوں کو اپنے غریب دوستوں اور کمزوروں کی مدد کرنے پر ابھارتی ہے۔ یہ ایک مکالماتی انداز میں کہی گئی نظم ہے،ایک معصوم بچہ عید کے دن اپنے گھر آئے ہوئے اپنے دوست کو پرانے کپڑوں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھتا ہے،تو اس کی وجہ معلوم کر لیتا ہے،وہ بتاتا ہے کہ میرے ابو نہیں ہیں اور ماں بیمار ہے،میں کس سے ضد کروں!؟؟

خاتون خانہ نے اپنے بچے کے دوست کی یہ گفتگو سن لی تھی،مگر اس کا احساس کرائے بغیر کہ انھوں نے یہ گفتگو سنی ہے اس یتیم بچے کو ایک جوڑا کپڑے اور عیدی دی۔ بچہ اپنی ماں کا یہ عمل دیکھتا ہے اور اسی سے اثر پذیر ہوتے ہوئے اپنی عیدی کے پیسے غریب دوست کی والدہ کو دے آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ مکالمہ

شام کو ماں نے پوچھا مجاہد میاں! اپنے پیسے کہاں خرچ تم نے کیے؟
مجھ کو سینے سے چمٹا لیا جب سنا میں نے صابر کی ماں کو وہ سب دے دیے

غریب سے ہمدردی کا یہ جذبہ بچے کے اندر اپنی امی کے عمل سے پیدا ہوا۔ یہ بچے کی اس نفسیات کا پتا دیتا ہے کہ بچے اپنے ماحول سے دیکھ کر بہت کچھ سیکھتے ہیں۔نظم کا مکالماتی اسلوب بھی اس کے اثر اور رنگ کو دوبالا کرتا ہے۔

'اے بچو!' آٹھ اشعار پر مشتمل ایسی نظم ہے،جس میں انھوں نے آنکھ' زبان' کان' ہاتھ' اور دل کے حسن استعمال کی تعلیم دی ہے اور غلط استعمال سے باز رہنے پر زور دیا ہے۔ اسلوب اور الفاظ نہایت سادہ اور سلیس ہیں۔مفہوم کی تفہیم میں بچے کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔اس نظم کے یہ دو شعر دیکھیے

جو اللہ کے بندوں کو تکلیفیں دے اور دکھ پہنچائے ایسے ہاتھوں والے سے ہے لنجا اچھا اے بچو!
سود' ڈکیتی' چوری' رشوت کی ناجائز دولت سے پاک اور نیک کمائی کا ایک پیسا اچھا اے بچو!

تربیتی نقطۂ نظر سے بچپن میں پڑھی ہوئی یہ چیزیں بڑے ہونے پر عملی زندگی میں اثر انداز ہوتی ہیں۔

زاہد صاحب کی نظموں میں سائنسی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ایسی ہی نظموں میں سے دو نظمیں 'پانی کی آپ بیتی' اور 'میں پانی ہوں' ہیں۔ان میں بچوں کو معلومات دی گئی ہے کہ پانی کہاں کہاں کن کن شکلوں میں زمین پر دستیاب ہے'پانی کیسے سمندر سے اڑتا ہے' کس طرح بادل بنتا ہے' اور اولا کیوں اور کب بن جاتا ہے؟؟؟

آج کل پانی کی حفاظت اور پانی کے ذخائر کو صاف ستھرا رکھنے کا مسئلہ بین الاقوامی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔دنیا اس سلسلے میں فکر مند ہے۔ادب کے ذریعے بچوں کے ذہن میں یہ نکتہ بٹھا دینا کہ پانی ہی زندگی کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے پانی کی اہمیت اور قدر و قیمت کے لیے انتہائی مثبت اور اہم ہے۔نظم کا ایک شعر جس میں پوری نظم کا خلاصہ آگیا ہے،دیکھیے۔

خدا کی بڑی مہربانی ہوں میں زمیں پر ہوں زندگی کا نشاں

دونوں نظموں کا انداز بیان اور اسلوب الگ ہے۔لیکن مضامین تقریباً یکساں ہیں۔

ایک دور تھا جب دادیاں اور نانیاں نونہالوں کو اچھی اچھی کہانیاں سنایا کرتی تھیں'اور مائیں اپنے لاڈلوں کو لوری دے کر سلاتی تھیں،اب بچوں کے لیے خواب خیال کی بات ہو چکا ہے۔آج کے ترقی یافتہ جدید دور میں جس کی ابتدائی وی سے ہوئی تھی اور اب بات نیٹ یعنی موبائل تک آ پہنچی ہے،حال یہ ہے کہ پیدائش کے چند ماہ بعد ہی بچے کو موبائل اسکرین کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔ہر ایک کو ایک نیا ساتھی مل گیا ہے۔کس کو فرصت ہے کہ کہانیوں اور لوریوں سے بچوں کا دل بہلائے۔نتائج بد ہمارے سامنے ہیں۔زاہد صاحب نے ایک نظم 'امی کی لوری' کے عنوان سے لکھی ہے،جو بڑی عمدہ اور سلیس ہے جس میں ماں کی محبت،اس کی آرزوئیں اور تمنائیں لفظ لفظ سے عیاں ہیں۔ ایک ایک لفظ ماں کی شفقت میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔سولہ اشعار کی آٹھ بند پر مشتمل اس نظم کے یہ دو بند دیکھیے،جن میں ماں کے پیار اور تمنا کا عکس ہی بچے کے لیے موجود نہیں بلکہ بچے کے محفوظ اور روشن مستقبل کی آرزو ماں کے دل میں موجزن ہے۔

میرا راج دلارا تو ہے میری آنکھ کا تارا تو ہے
میرے راج دلارے سوجا
میری آنکھ کے تارے سوجا
سائے میں ایماں کے پلے تو پھولے مہکے اور پھلے تو
دکھ نہ کوئی تو پائے سوجا
آنچ نہ تجھ پر آئے سوجا

آخر میں زاہد کی ایک دعائیہ نظم 'اے سنسار بنانے والے' کے دو بند پیش ہیں۔ایک معصوم بچہ کس پیارے انداز میں اللہ کے حضور اپنے جذبات اور خواہشیں پیش کر رہا ہے۔

ہے یہ دعا ہم پڑھ لکھ جائیں دین ترا ہر سو پھیلائیں
سب کو سیدھی راہ دکھائیں اندھیارا دنیا سے مٹائیں
سورج چاند بنانے والے
تاروں کو چمکانے والے
باتوں میں سچائی بھر دے کاموں میں اچھائی بھر دے
دل میں ذوق صفائی بھر دے نیکی اور بھلائی بھر دے
چڑیوں کو چہکانے والے
پھولوں کو مہکانے والے

زاہد کی اطفالی شاعری زبان و بیان میں سلاست و روانی،نغمگی اور حسن آہنگ کے لحاظ سے اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔نظموں کے عناوین،زبان و اسلوب سب کچھ بچوں کی فطرت اور مزاج سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں،جو ان کے اندر تعمیری اقدار کو پروان چڑھانے کا شوق و ذوق پیدا کرتے ہیں۔ان کی شاعری مستقبل کے لیے تعمیری رخ پر بچے کی ذہن سازی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

آج کے ماحول میں جہاں تعلیم گاہوں میں تربیتی نظام بہت ڈھیلا ہے بلکہ ختم ہی ہے،ایسے میں ہمیں اپنے نونہالوں کی تربیت کے لیے ایسی اردو شاعری اور ادبی لٹریچر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔شاعری اختصار اور جامعیت کے ساتھ چیزوں کو پیش کرتی ہے۔ اس لیے چیزیں ذہن میں زیادہ محفوظ رہتی ہیں۔اپنے بچوں کے اندر شاعری کے مطالعے کی عادت ڈالنی چاہیے،بچپن کی چیزیں بڑے ہو کر ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں، مثبت اور بااخلاق زندگی گزارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔اس کے علاوہ بچوں میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کو نشو و نما دینے میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہے۔ بچے دنیا اور آخرت دونوں میں والدین کے لیے ایک سرمایہ ہیں،اس لیے ان کو قوم و وطن اور خلق خدا کی خدمت اور بھلائی کے لیے مثبت سوچ اور فکر کا حامل بنانا ہر فرد کی اہم ذمے داری ہے۔

■

Dilshad Husain Islahi
E-54, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:8750380917
Email.: dilshadhussain426@gmail.com

مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور قومی تعلیمی پالیسی

شفاعت احمد

کسی بھی انسان کی تعلیمی زندگی میں مادری زبان کی حیثیت بنیاد کے پتھر کی ہے۔ تمام تر تعلیمی اور علمی ترقی اس کی مادری زبان پر منحصر ہوتی ہے۔ درس و تدریس کی زبان اگر فطری اور قابل فہم ہو تو طلبہ نہ صرف نفس مضمون کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں بلکہ اپنے خیالات کو بھی موثر انداز میں پیش کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ قانون فطرت کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی مادری زبان ان کی فطری زبان ہوتی ہے جسے وہ اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ خوشی و غم کے اظہار میں مادری زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ مادری زبان انسانی جذبات کے اظہار کا سب سے موثر وسیلہ ہوتی ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور درس و تدریس میں ہم نے اس نظریے کو یکسر فراموش کر دیا ہے جس کا خمیازہ آج ہماری نسلیں بھگت رہی ہیں۔ ہمارا بچہ اپنے گھر میں جو زبان بولتا اور سمجھتا ہے، اس کے برخلاف اسکول میں اسے بالکل اجنبی زبان سے سابقہ پڑتا ہے۔ مثلاً گھر میں وہ اپنے والدین، بھائی بہن اور پاس پڑوس کے لوگوں کو اردو یا ہندی، ملیالم، تمل، مراٹھی، تیلگو، پنجابی وغیرہ جیسی زبانیں بولتے ہوئے سنتا ہے اور جب وہ بولنے کے قابل ہوتا ہے تو اپنے ماحول کے زیر اثر وہ بھی انھی میں سے کوئی زبان بولتا ہے، مگر جب اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول میں بٹھایا جاتا ہے تو اس کی تعلیم انگریزی زبان میں شروع کی جاتی ہے جس کا برا اثر اس کی پوری علمی و تعلیمی زندگی پر پڑتا ہے اور بعد میں چاہے وہ کسی بھی شعبے میں کتنی ہی مہارت حاصل کرلے مگر ابتدائی تعلیم مادری زبان میں نہ ہونے کی وجہ سے جو نقص رہ جاتا ہے وہ کبھی دور نہیں ہوتا۔ مادری زبان سے ناواقفیت اور بے پروائی ہمارے معاشرے کی پسماندگی کا ایک اہم سبب ہے۔

تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جو بچے ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرتے ہیں وہ اجنبی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے مقابلے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یونیسکو اور دیگر ادارے اس حقیقت پر زور دیتے رہے ہیں کہ مادری زبان میں حصول علم خود اعتمادی اور خود شناسی کے ساتھ ساتھ بچے کی مجموعی نشو و نما کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

یہاں عظیم ہندوستانی ماہر طبعیات اور نوبل انعام یافتہ سر سی وی رمن کا ذکر ضروری ہے، جنھوں نے مثالی بصیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں سائنس اپنی مادری زبان میں پڑھانی چاہیے، بصورت دیگر سائنس طبقۂ خواص تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور عوام الناس سے اس کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اگرچہ ہمارے نظام تعلیم نے اس حد تک ترقی کرلی ہے کہ وہ انجینئرنگ، طب، قانون اور لسانیات میں بین الاقوامی شہرت یافتہ کورسز پیش کرتا ہے، لیکن ہم نے خلاف عقل اپنے ہی لوگوں کو وہاں تک رسائی سے محروم کر دیا ہے۔ ہم نے اتنے برسوں میں صرف انگریزی میڈیم یونیورسٹیوں اور کالجوں کا ایک چھوٹا نیٹ ورک بنا دیا اور ہماری اپنی زبانیں پیشہ ورانہ تعلیم سے محروم رہیں۔ اس طرح ہم نے اپنے طالب علموں کی اکثریت کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی۔

اگر ہم عالمگیر سطح پر رائج اعلیٰ ذریعۂ تعلیم پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو پتہ چل جائے گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اور یہ بھی کہ ہمارا طرز عمل درست نہیں ہے۔ مثال کے طور پر G-20 ممالک میں بیشتر ایسے ہیں جہاں اسکولوں کے ساتھ یونیورسٹیوں میں بھی بہترین تعلیم کا ذریعہ وہاں کے عوام الناس کی زبانیں یعنی ان کی مادری زبانیں ہیں۔ اگر ہم ایشیائی ممالک پر ہی نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی کوریا کی 70 فیصد یونیورسٹیوں میں کوریائی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں کے فضلا بین الاقوامی سطح پر اپنا کردار نبھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جب وہاں کی حکومت نے دیکھا کہ انگریزی کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھنے لگا ہے تو اس نے یہ انوکھا قدم اٹھایا کہ 2018 میں اسکولوں میں تیسری جماعت تک انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر مکمل پابندی عائد کر دی، کیونکہ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ طلبا میں جنوبی کوریائی زبان کے تئیں دلچسپی کم ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں وہ مادری زبان سے بیگانہ ہو جائیں گے۔

اسی طرح جاپان کی یونیورسٹیز کے بیشتر تعلیمی پروگراموں کی تدریس جاپانی زبان میں ہوتی ہے۔ یہی صورت حال چین کی بھی ہے جہاں نیچے سے یونیورسٹی سطح تک ذریعۂ تعلیم وہاں کی عوامی زبان ہے۔ یورپ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ فرانس اور جرمنی میں اپنی زبانوں کے تحفظ کا رجحان شدت سے موجود ہے۔ فرانس تو اس حد تک جا پہنچا ہے کہ ''ذریعہ تدریس صرف فرانسیسی'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، جبکہ جرمنی میں اسکولوں میں تعلیم کی زبان بنیادی طور پر صرف جرمن ہے اور ماسٹر پروگرام بھی 50 فیصد جرمن زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ کناڈا میں لسانی تنوع کی بہت عمدہ تصویر سامنے آتی ہے، اگرچہ زیادہ تر صوبوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے، مگر کیوبک میں فرانسیسی بولنے والوں کا غلبہ ہے اور یہاں کے بیشتر اسکولوں میں تحتانوی اور ثانوی سطح تک بلکہ متعدد یونیورسٹیوں میں بھی ذریعۂ تعلیم فرانسیسی ہے۔

اس عالمی تناظر کی روشنی میں اگر ہم اپنے ملک کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو بہت ہی افسوسناک صورت حال کا سامنا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں نہ صرف زیادہ تر پیشہ ورانہ کورسز انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں اور انجینئرنگ، طب اور قانون میں تو صورت حال مزید ناگفتہ بہ ہے، بلکہ ابتدا سے ہی بچوں کو مادری زبان کی بجائے انگریزی میں تعلیم دیتے ہیں اور انھیں اپنی زبان سے ناواقف رکھنے کی گویا شعوری کوشش کرتے ہیں۔

یہاں اس نکتے پر توجہ دینا بھی ضروری ہے کہ مادری زبان میں تعلیم پر زور دینے سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ دوسری زبانوں کو کمتر سمجھا جائے یا نظر انداز کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے موجودہ نائب صدر جمہوریہ جناب وینکیا نائیڈو کی یہ بات اہم ہے کہ ہر شخص کو کئی زبانوں کا ماہر ہونا چاہیے، لیکن مادری زبان میں حصول تعلیم کی حیثیت کلیدی اور بنیادی ہونی چاہیے۔ یعنی انسان کی بنیادی تعلیم تو مادری زبان میں ہی ہونی چاہیے، البتہ اپنی دلچسپی اور شوق اور دیگر علمی و معاشی ضرورت کے تحت وہ جتنی زبانوں میں چاہے مہارت حاصل کرے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے مثال ترقیات کی وجہ سے آج دنیا باہم مربوط ہو گئی ہے۔ ایسی صورت حال میں مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کرنے سے کامیابی کے نئے امکانات

روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی بھی زبان، خصوصا مادری زبان کو نظر انداز کر کے ہم نہ صرف یہ کہ بہت بڑے علمی خسارے کا سودا کرتے ہیں، بلکہ نئی نسل کو اس کے ثروت مند سماجی، ثقافتی ولسانی ورثے سے بھی محروم کرتے ہیں۔

دنیا میں دو زبانیں ایسی ہیں جو ہر شخص بغیر کوئی علم حاصل کیے بول یا سمجھ سکتا ہے۔ ایک مادری زبان اور دوسری اشاروں کی زبان۔ اشاروں کی زبان کو یونیورسل لینگویج کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی وہ واحد زبان ہے، جس کو سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور مادری زبان وہ ہے جو انسان شعور سنبھالنے کے بعد اپنے والدین، گھر اور ماحول سے سیکھتا ہے۔ مادری زبان صرف زبان نہیں ہوتی، بلکہ پوری ایک شناخت ہوتی ہے۔ ایک پوری تہذیب، تمدن، ثقافت، جذبات واحساسات کا حسین امتزاج ہوتی ہے۔ مادری زبان میں خیالات ومعلومات کی ترسیل اور ابلاغ ایک قدرتی اور آسان طریقہ ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کا عمل جو کہ سراسر انسانی ذہن میں تشکیل پاتا ہے، وہ بھی لاشعوری طور پر مادری زبان میں ہی وجود میں آتا ہے۔ انسان خواب بھی مادری زبان میں ہی دیکھتا ہے۔ انسانی ذہن اور تخلیقی عمل میں رابطے کا کام بھی غیر ارادی طور پر مادری زبان میں ہی انجام پاتا ہے۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا سب سے بہترین اظہار بھی مادری زبان میں ہی ممکن ہے۔ فی البدیہہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بھی مادری زبان کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ فہم انسانی کا براہ راست تعلق بھی ذہن انسانی اور مادری زبان کے رابطے سے ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ فہم انسانی میں جامعیت، وسعت اور گہرائی صرف مادری زبان میں ہی ممکن ہے۔

الغرض سیکھنے اور سکھانے کے لیے آسان ترین زبان، مادری زبان ہی ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ تخلیق اور ایجاد کا براہ راست تعلق بھی مادری زبان سے ہے۔ سائنسی اور فنی علوم میں نفس مضمون، سائنسی نظریات کی فہم اور ترسیل وابلاغ کے لیے بہترین ذریعہ مادری زبان ہی مانا جاتا ہے۔ مادری زبان میں قدرتی طور پر یہ وسعت اور گنجائش ہوتی ہے کہ وہ تمام تر جدید عصری علوم بشمول سائنسی علوم کو ان کی اصل اصطلاحات کے ساتھ بغیر کسی ترجمے کے اپنا سکتی ہے اور ان کی ترسیل وابلاغ کر سکتی ہے۔

مادری زبان انسانی شناخت، تشخص اور کردار سازی میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ہر وہ زبان جس میں لٹریچر تخلیق پا سکتا ہو، ترسیل علم کے لیے بہترین مانی جاتی ہے۔ جب کہ لٹریچر کا تعلق بھی مادری زبان سے ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا ماہرین تعلیم کی رائے میں ذریعہ تعلیم کے لیے مادری زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ دنیا میں زیادہ تر ممالک میں تعلیم مادری زبانوں میں دی جاتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے مطابق بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے سب سے موثر زبان، مادری زبان ہے۔ مادری زبان میں تعلیم سے بچوں کی تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم دیے جانے میں ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ بچے کے پاس اپنی زبان کے علم کا ایک ذخیرہ پہلے سے موجود ہوتا ہے اس لیے دوران تعلیم بوریت کی بجائے بچہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم سے بچوں کے ذہن پر کم بوجھ پڑتا ہے اور بچوں کے سکول چھوڑنے کی شرح میں بھی حیرت انگیز کمی دیکھنے میں آتی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کے بارے میں یونیسکو کا کہنا ہے کہ جو بچے اپنی مادری زبان سے تعلیم کی ابتدا کرتے ہیں شروع سے ہی ان کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ ان کی یہ اچھی کارکردگی مسلسل قائم رہتی ہے بہ نسبت ان بچوں کے جو اپنی تعلیم ایک نئی زبان سے شروع کرتے ہیں۔ یونیسکو نے یہ بھی اشارہ دیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی شرح خواندگی میں کمی کی ایک بڑی وجہ مادری زبان میں تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ ابتدائی تعلیم سے متعلق یونیسکو کی جاری کردہ پالیسی میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ چھوٹے بچوں کو ابتدائی 6 سال تک مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہیے، تاکہ جو کچھ بچے نے سیکھا ہے وہ بھول نہ جائے۔

اس ضمن میں وزیر اعظم نریندر مودی کی سربراہی والی موجودہ مرکزی حکومت کے زیر نگرانی تیار کی جانے والی نئی تعلیمی پالیسی اہم ثابت ہو سکتی ہے جس میں پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پالیسی میں پرائمری تعلیم بذریعہ مادری زبان کو یقینی بنانے کی وکالت کی گئی ہے اور یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ مادری زبان کے ذریعے تعلیم سائنٹفک نظریے کو مد نظر رکھ کر اپنائی گئی ہے۔ حکومتی پالیسی میں ابتدا سے چھٹی کلاس تک لازمی طور پر مادری زبان میں تعلیم دینے کی بات کہی گئی ہے، جس سے یقیناً تمام مقامی زبانوں کو فائدہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے کو لازمی بنایا جائے گا تو مختلف علاقوں میں علاقائی زبانوں کے فروغ کا بھی راستہ ہموار ہوگا اور اس ضمن میں اردو کے لیے بھی ترقی کی نئی فضا قائم ہوگی البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تمام اسکولوں میں طلبہ کی ضرورت کے مطابق اردو اساتذہ بحال کیے جائیں نیز وہ اساتذہ ضروری اہلیت وقابلیت سے لیس ہوں۔ سرکار کا کام پالیسی بنانا ہے مگر اسے زمینی سطح پر اتارنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس شعبے سے وابستہ ہیں، مثلاً پیشۂ تدریس سے وابستہ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کریں اور اسکول کے ذمے داران مقامی تعلیمی افسران اور انتظامیہ کی ذمے داری ہے وہ ہر علاقے میں وہاں کے طلبہ کی مادری زبان کے اساتذہ کی تقرری کا نظم کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ چھٹی کلاس تک طلبہ کی پوری تعلیم مادری زبان میں ہو۔

فی الوقت ہمارے ملک میں قومی سطح پر پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں اساتذہ کی بحالی کے لیے بی ایڈ، بی پی ایڈ اور دیگر تربیتی کورسوں کی ڈگری کے ساتھ ساتھ قومی سطح کے اساتذہ اہلیتی امتحان کو بھی پاس کرنا لازمی ہے اور اس کے لیے قومی سطح پر سی ٹیٹ (CTET) امتحان سال میں دو مرتبہ منعقد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ریاستوں کے ذریعے بھی اساتذہ کے لیے اہلیتی امتحان (STET) لیے جاتے ہیں۔ چوں کہ اب اساتذہ بحالی کے لیے سی ٹیٹ یا ایس ٹیٹ کا پاس ہونا لازمی ہو گیا ہے، اس لیے اردو آبادی کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کو یقینی بنایا گیا تو مختلف موضوعات کے ایسے اساتذہ جو اردو کے ذریعہ تدریسی عمل کو انجام دے سکیں وہ مذکورہ سی ٹیٹ اور ایس ٹیٹ امتحان پاس ہیں یا نہیں۔ اگر اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اساتذہ ہی اس امتحان میں پاس نہیں ہوں گے تو پھر اردو طبقے کے بچوں کے لیے اردو کے ذریعے تعلیم دینے کا راستہ ہموار کیسے ہوگا؟

اس طرح اگر ہم حقیقی معنوں میں مادری زبان سے محبت کرتے ہیں اور اس کے فروغ کے تئیں سنجیدہ ہیں تو ہمیں پوری دیانت داری اور حقیقت پسندی کے ساتھ عملی اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔ جہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام مادری زبان میں کرنا ہوگا وہیں اس چیز کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ ہمارے اساتذہ اہل اور باصلاحیت ہوں جو واقعی مادری زبان میں مختلف موضوعات کی تدریس کا فریضہ بخوبی انجام دے سکیں۔ سرکار کی نئی تعلیمی پالیسی اپنے دیگر پہلوؤں کے ساتھ اس اعتبار سے بھی قابل تحسین ہے کہ اس میں مادری زبان میں تعلیم پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہے، بس اس کے عملی نفاذ کے تئیں سنجیدگی دکھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یقینی طور پر ہمارے ملک میں مادری زبان میں تعلیم کے حوالے سے ایک خوشگوار انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔

■

Dr. Shafayat Ahmad
Associate Professor, MANUU,
College of Teacher Education
Chandanpatti, Laheriasarai
Darbhanga (Bihar)
Mob.:7091490018

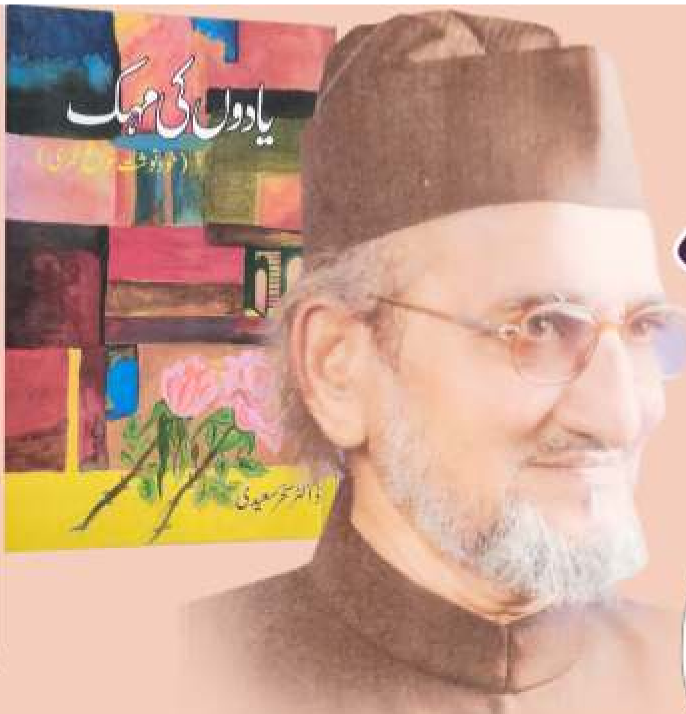

عظیم راہی

سحر سعیدی
ایک وضع دار شخصیت

ڈاکٹر سحر سعیدی مرحوم پرانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ نہایت وضعدار اور اصول پسند شخص تھے۔ اپنی اصول پسندی کی وجہ سے کئی بار انھیں نقصان بھی اٹھانا پڑا، لیکن وہ آخر تک اپنے اصولوں پر قائم رہے۔ بہت کم آمیز اور کم گو تھے۔ قہقہہ مار کر ہنسنا ان کے نزدیک آداب واخلاق کے خلاف تھا۔ وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ مزاجاً سخت تھے بلکہ ہر بات میں آداب ملحوظ رکھتے تھے اور ایک طرح کی شائستگی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی زندگی میں بڑا نظم وضبط اور سلیقہ وطریقہ اور ایک ترتیب تھی۔ وہ وقت اور وعدے کے بڑے پابند تھے۔ چونکہ کم گو تھے لہٰذا اکثر خاموش ہی رہتے، لیکن جب کبھی بولنے پر آتے تو سامنے والے کو خاموش ہو جانا پڑتا۔ اپنے مخصوص لباس اور بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ خوش خطی ان کے مزاج کے صاف ستھرے اور نکھرے ہوئے ذہن کی نمائندگی کرتی، ان کے انداز تحریر میں ان کی شخصیت کا پرتو صاف جھلکتا تھا۔

سحر سعیدی خاموش طبیعت کے مالک ضرور تھے لیکن خاموشی سے وہ اپنا کام کرتے رہنے کے قائل تھے۔ لہٰذا اُن کی شخصیت ہمیشہ فعال اور متحرک رہی' اُن کی کوئی نہ کوئی ادبی' سماجی اور معاشرتی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ انھوں نے اورنگ آباد میں نان قلیہ کلب بھی اپنے گروپ کے ساتھ قائم کیا تھا جس میں نان قلیہ سے مدعوئین کی ضیافت کی جاتی۔ وقت اور اصولوں کی بڑی پابندی کے ساتھ ایک عرصے تک وہ نان قلیہ کلب کا بڑی خوش اسلوبی سے اہتمام کرتے رہے۔ اسی طرح سیر وتفریح کا پروگرام بھی وہ اپنے ہم خیال احباب کے ساتھ طے کرتے اور اپنے احباب کے ساتھ کسی صحت بخش یا تاریخی مقام پر تفریح کو جایا کرتے تھے۔ اپنے ان ہم خیال دوستوں کے ساتھ ایک بڑی لٹریری سوسائٹی بھی قائم کی تھی جس کے تحت کئی کتابوں کی ترتیب تدوین کا انھوں نے ارادہ کیا تھا جس میں نذر عبدالحق اور دکن کے چار چاند کے علاوہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد کی تہذیبی وتمدنی تاریخ ترتیب دینے اور اُسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا منصوبہ بھی انھوں نے بنایا تھا لیکن اس کام میں کوئی پیش رفت نہ ہونے کے سبب ان کے یہ خواب پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے۔ بقول اسلم مرزا، سحر سعیدی دوستی کے معاملے میں بہت محتاط رہے۔ زبردست قیافہ شناس رہے۔ انھوں نے کبھی اپنے اطراف دوستوں کی بھیڑ کو پسند نہیں کیا۔ اس معاملے میں وہ بہت احتیاط سے کام لیتے رہے اور اپنے ہم خیال مخلص دوستوں کو ترجیح دی۔ دراصل وہ تعلقات میں کچھ فاصلے روا رکھتے تھے۔ شاید اسی لیے اکثر لوگ انھیں انا پسند سمجھتے تھے۔ حالانکہ اُن کی طبیعت میں انا پسندی تھی اور نہ ہی تصنع' اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے شعروں میں یوں کیا تھا کہ

تعلقات میں کچھ فاصلے میں رکھتا ہوں
انا پسند عبث لوگ مجھ کو سمجھے تھے
تصنع سے عاری ہے طبیعت میری
مرا دل ہے شفاف آئینہ جیسے

سحر سعیدی بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ شاعری میں بطور خاص غزل ان کا خاص میدان تھا اور اس میں ان کا اپنا ایک رنگ سرچڑھ کر بولتا تھا۔ ان کی یہ غزلیں زیادہ تر غنائیت سے پُر ہوتی تھیں، غزل اُن کی پسندیدہ صنف سخن تھی۔ کوشش کے باوجود غزل کے علاوہ کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ غزل دراصل ان کے مزاج سے میل کھاتی تھی انھوں نے خود ہی کہا تھا۔

میں نے غزل میں اتنی توانائی صرف کی
میرا تعارف اب مری پہچان ہے غزل

محمد علی اثر کے مطابق 'سحر سعیدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر اور اُن کی شہرت اور ناموری کا دارومدار بھی اس صنف شعر پر ہے۔' سحر سعیدی کی شاعری جہاں روایت سے جڑی رہی وہیں جدیدیت کا فن بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کا خمیر روایت اور جدیدیت کی آمیزش سے اٹھا تھا۔ شاذ تمکنت نے بجا طور پر کہا تھا کہ: ''سحر سعیدی' جدت کے چراغ، روایت کے روغن سے روشن کرتے رہیں گے۔'' شاعری میں وہ جدت کو پسند تو کرتے تھے لیکن جدیدیت کی انتہاپسندی کے خلاف تھے۔ اس تعلق سے انھوں نے کہا تھا کہ

روایتی ہے مرا طرز گفتگو لیکن
دکھائی دے گی غزل میں جدیدیت میری

اپنی شاعری کو وہ اپنے شہر ولی وسراج کی دین سمجھتے تھے۔ جس کا انھوں نے یوں اعتراف کیا تھا کہ

مجھ کو مرے کلام سے پہچانتے ہیں لوگ
یہ ذوق یہ ہنر ہے مرے شہر کی عطا

جہاں وہ اپنی شاعری میں خود کی الگ پہچان کا اعتراف کرتے' وہیں اپنے منفرد لہجے کی بات یوں کرتے کہ

منفرد لہجہ میں کہتا ہوں غزل
ہے مرقع یہ دلی جذبات کا

ان کا ایک شعر مجھے بے حد پسند آیا تھا اور اکثر نظامت کے دوران ان کے اس شعر سے شاعروں کو دعوت سخن دیتا تھا۔ جو حالات حاضرہ کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ شعر دیکھیے۔

پرانے لوگ مراسم کا پاس رکھتے تھے
کوئی بھی اب نہیں ملتا ہے ضرورتوں کے بغیر

دراصل ان ہی مراسم کا پاس ان کی شاعری میں ملتا ہے جس میں اُن کی شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ وہیں عصر حاضر کے مسائل اور خاص کر ٹوٹتی ہوئی تہذیب اور گرتی ہوئی قدروں کی عکاسی بھی ان کے اشعار میں اکثر نظر آتی ہے جو آج ہماری تہذیب اور معاشرتی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

آج اخلاص سے کھل کر نہیں ملتا کوئی
سادگی بولتے چہروں سے عیاں تھی پہلے
وہ عہد بھی تھا کہ معصوم باادب بچے
نظر جھکا کے بزرگوں سے بات کرتے تھے
وفا پہ جان بھی دینے کو کم سمجھتے تھے
سنا ہے اگلے زمانے میں لوگ ایسے تھے

ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ نے ''سحر سعیدی کی غزلوں کو ایک ایسے ابلتے ہوئے چشمے سے تعبیر کیا جس کی سمت اور رفتار کا انحصار رستوں کے موڑ اور اُن کے نشیب و فراز پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی دھن میں ایک اڑتے ہوئے پرندے کی بے کراں فضاؤں میں اپنا راستہ آپ متعین کرنے کی بساط بھر کوشش ہے۔'' سحر سعیدی کی غزل بشر نواز کے لفظوں میں:

''سحر سعیدی کے لہجے کے غنائیت اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہوکر ایسی تخیلی دنیا آباد کرتی ہے جو بالکلیہ نئی نہ ہونے کے باوجود بھی نئی معلوم ہوتی ہے اور دلکش بھی۔''

سحر صاحب شاعری کے ساتھ نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے اور انھوں نے اپنے غائر مطالعے اور ادبی ذوق و شوق سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنی اچھی نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کی نثر میں بلا کی روانی کے ساتھ زبان سلاست اور فصاحت سے بھری ہوتی تھی، حافظہ بھی خوب پایا تھا اور ہر چیز میں ان کا اپنا ایک انداز اور بڑا سلیقہ ہوتا تھا۔ ان کی خودنوشت کے مطالعے سے بھی اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیقی و تنقیدی نظر بھی غضب کی تھی۔ ان کی کتابوں میں ان کا تنقیدی نظریہ اور تحقیقی نقطۂ نظر بڑی قطعیت کے ساتھ ملتا ہے اور تحریروں میں بڑا توازن اور تسلسل ملتا ہے۔ وہی توازن اور ترتیب' جواُن کی زندگی کا معمول تھا۔ علاقۂ مرہٹواڑہ کے مایہ ناز سپوت اور محقق و ناقد شیخ چاند پر انھوں نے تحقیقی کام کیا اور اسی مناسبت سے بعد میں شیخ چاند کے مضامین کو کتابی شکل میں ترتیب دیا تھا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے انھیں دھن کا پکا ریسرچ اسکالر کہا تھا اور فاروق شمیم کے لفظوں میں ''ڈاکٹر سحر سعیدی نے شیخ چاند پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرکے اپنی مٹی کا حق ادا کیا۔'' شاعری کے چار مجموعوں کے ساتھ نثر میں بھی ان کی چار کتابیں ان کی گرانقدر ادبی خدمات کا بین ثبوت ہیں تو وہیں کئی جلدوں پر مشتمل ادبی تراشے کو جمع کرنے کا اہم کام بھی سحر صاحب نے انجام دیا تھا۔

سحر سعیدی صاحب کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ جو ایک بار ٹھان لیتے تھے چاہے وہ کتنا ہی مشکل کام کیوں نہ ہو، کرگزرتے تھے۔ ان کی پوری زندگی میں اسی بات کا عمل دخل رہا۔ اسی جہد مسلسل سے ان کی زندگی عبارت ہے۔ چاہے وہ کیسا معاملہ ہو، کوئی بات رہی ہو، تقریباً بہت سارے معاملات میں چاہے علم و ادب اور تعلیم کے میدان میں ہو یا عملی زندگی کے مرحلے ہوں یا پھر ابتدا میں ملازمت کے سلسلے میں جو پریشانیاں رہی ہوں، مختلف ملازمتیں کیں اور بعد میں مرہٹواڑہ یونیورسٹی میں باقاعدہ ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا اور ترقی پاتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے حسن وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ازدواجی زندگی کے معاملے میں بڑے دشوار کن مراحل سے گزرتے ہوئے ان حالات سے نبردآزما ہوکر بعد میں ایک پُرسکون ازدواجی زندگی گذاری۔ اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی ملازمت کے دوران ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بیماری کے آخری ایام میں باوجود بیحد تکلیف کے، اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر دیکھنے والے کی ہمت پست ہوجاتی لیکن ان کی ہمت میں کمی نہیں آتی۔ ان میں قوت برداشت بلا کی تھی اور قوت ارادی غضب کی تھی۔ فریضہ حج کے دوران ان کی اہلیہ کا ایک حادثے میں پیر فریکچر ہوگیا تھا۔ انھوں نے بڑی ہمت سے خود اپنے حج کے ارکان ادا کرتے ہوئے وہیل چیئر پر اہلیہ کو بھی ارکان ادا کروائے اور حج بیت اللہ سے واپسی پر بیوی کا معقول علاج کروایا۔ مگر مختلف امراض کی وجہ سے علاج کا خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ سحر صاحب مسلسل علاج کے ساتھ تیمارداری کرتے رہے اور اہلیہ کی خوب خدمت کی۔ لیکن طویل علالت کے بعد ان کی شریک زندگی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بیوی کی جدائی کے بعد وہ اندر سے بہت ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن اپنی طبیعت کے مطابق کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور پھر ایک ایسی بیماری نے انھیں گھیر لیا کہ باوجود علاج کے کوئی افاقہ نہ ہوا اور تقریباً ایک سال کی طویل بیماری کی تکلیف جھیل کر آخر وہ 26 جنوری 2017 کو اس دارفانی سے رحلت کرگئے۔

سحر سعیدی کا پورا نام سید منیرالدین تھا۔ وہ 18 مئی 1940 کو اورنگ آباد کی تحصیل پیٹھن میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اورنگ آباد کے ایک سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تحتانیہ تک اُن کی تعلیم پھلمبری میں ہوئی اور مڈل سے ہائی اسکول تک انھوں نے اورنگ آباد میں پڑھائی کی۔ 1958 میں چیلی پورہ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اسی سال انھوں نے پہلی غزل کہی۔ ابتدا میں جے پی سعید سے مشورۂ سخن کیا تقریباً آٹھ دس برس ان کی رہنمائی حاصل رہی۔ ان کے اسکول کے استاد عباس انجم نے انھیں سحر تخلص عطا کیا تھا اور جے پی سعید سے نسبتِ تلمذ کی وجہ سے سعیدی ہوگئے تھے۔ اپنے استاد جے پی سعید کے احترام میں انھوں نے یہ شعر بھی کہا تھا کہ

خاطر سے احترام سے سر جھک گیا مرا
محفل میں ذکر آیا تھا جے پی سعید کا

ڈاکٹر سحر سعیدی نے 1993 میں میسور یونیورسٹی کرناٹک سے اردو میں ایم اے کامیاب کیا تھا اور 1997 میں ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے ''شیخ چاند، حیات اور ادبی خدمات'' موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس تحقیقی کام کی خاص بات یہ تھی کہ اسے بغیر کسی گائیڈ کے یونیورسٹی میں راست پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور یہ تعلیمی لیاقت، اپنی علمی و ادبی دلچسپی کے باعث ملازمت کے دوران مکمل کی اور اس کے ساتھ ہی علم و ادب کی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہے۔ چونکہ سحر سعیدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ بچپن سے ان کی طبیعت کا میلان شاعری اور موسیقی کی طرف تھا۔ 1958 سے انھوں نے باقاعدہ اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ سحر سعیدی صاحب کے چار مجموعہ کلام بالترتیب مضراب (1978)، کمند ہوا (1980)، شعر خوشبو لے (1987) اور شعر میرا شوق انگیز (2015) میں شائع ہوکر مقبول ہوئے، جن کی ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور مقتدر اہل علم و فن نے انھیں خراج تحسین سے نوازا۔ عارف خورشید مرحوم نے سحر سعیدی کے چار شعری مجموعوں کے بارے میں یہ دلچسپ بات بتائی تھی کہ 'مضراب' یک لفظی، 'کمند ہوا' دو لفظی، 'شعر خوشبو لے' سہ لفظی، اور 'شعر میرا شوق انگیز' چہار لفظی ہے۔ سحر سعیدی کے ان چاروں شعری مجموعوں میں بڑی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں لیکن یہاں میں نے طوالت کے خوف سے چند ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جو انھوں نے خود نمونے کے طور پر عالم گیر ادب کے اپنے نمبر میں پیش کیے تھے۔ ملاحظہ کیجیے۔

دل کو تنہائی میں اک گونہ سکوں ملتا ہے
ہاں یہی بات ذرا مجھ سے بچھڑ کر کہنا
دل میں ارماں منفرد ہیں، سر میں سودا منفرد
سوچتے تو سب ہیں لیکن میں نے سوچا منفرد

آتشیں رخسار کی نیرنگیوں کے سامنے
اس دہکتے دل کے سارے استعارے مسترد
گھنا درخت کسی نے کہیں گرایا تھا
نواحِ دشت کئی دن ہوا بلکتی رہی
شرارتاً وہ کبھی جھانک کر گیا تھا سحر
کئی برس مری کھڑکی مگر مہکتی رہی
ہم دونوں کی چاہ نرالی، ہم دونوں کا ظرف اعلیٰ
اپنے گھر کا راجا میں وہ میرے گھر کی رانی ہے
آپ آئے سامنے یا میں نہ آیا آپ میں
خوبصورت جھیل پر جیسے ٹھہر جائے نظر
گزر ہوا جو اُدھر سے تو کپکپی سی ہوئی
ہم ایک ساتھ جہاں بارشوں میں بھیگے تھے
ہمارے پاؤں کے پڑتے ہی چیخ اٹھے تھے
نظر جھکا کے جو دیکھا تو خشک پتے تھے
دور کیسے میں کروں اپنی نگاہوں سے اُسے
وسوسے دل میں کہیں سر نہ اٹھانے لگ جائیں
سحروابستگی روح و بدن کی عارضی نکلی
رہی یہ زندگی، اندر سے وہ بھی کھوکھلی نکلی
سحرلب بوس ہوتے پھول سے دیکھا جو تتلی کو
ہمارے حق میں یہ چاہت بھی اک تحریک سی نکلی

سحر سعیدی صاحب کو شاعری کے علاوہ چونکہ تحقیق و تنقید سے بھی گہری دلچسپی رہی تھی اسی سبب انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران پی ایچ ڈی مکمل کی اور 1998 میں اپنے گرانقدر تحقیقی مقالے کو کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ جس کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ اس تحقیقی کام کی تکمیل کے بعد اپنے موضوع 'شیخ چاند' کو آگے بھی تحقیق کا مرکز بنایا اور شیخ چاند کے مطبوعہ مضامین جو مختلف رسائل میں چھپ چکے تھے مگر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے ان کو یکجا کر کے مرتب کیا اور 'مضامین شیخ چاند' کے نام سے 2007 میں شائع کیا۔ جس کی ایک عرصے سے تعلیمی حلقے میں ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ 'نذر مولوی عبدالحق' اور کئی تحقیقی و تنقیدی کتابیں زیر ترتیب رہیں لیکن طویل علالت نے ان کاموں کو پورا نہیں ہونے دیا۔ اُس کے ساتھ ہی اسی دوران ہم خیال احباب کے مشورے سے کتابی سلسلے کے تحت ایک ادبی تنظیم تشکیل پائی جن میں عارف خورشید، نورالحسنین، شاہ حسین نہری، اسلم مرزا، مرحوم قاضی رئیس، ساحر کلیم اور راقم الحروف پیش پیش تھے۔ جسے 'عالم گیر ادب' کا نام دیا گیا جو سحر سعیدی کا تجویز کردہ نام تھا جسے اتفاق رائے سے منظوری دی گئی اور اس کے تحت کتابی سلسلے کا کام شروع ہوا۔ طے شدہ ضابطے کے مطابق پہلے عالم گیر ادب کے

سحر سعیدی مرحوم کا ایک اور اہم اپنی نوعیت کا منفرد کام 'ادبی تراشے' ہیں جو انھوں نے بڑی لگن اور جستجو کے بعد اپنے طور پر بڑی تعداد میں جمع کیے تھے۔ 15 جلدوں پر مشتمل 'ادبی تراشے' میں سحر سعیدی نے اہم کثیرالاشاعت روزناموں اور رسائل میں شائع ہونے والے ادبی تحقیقی، تنقیدی مضامین کے تراشوں کو ان میں محفوظ کردیا۔

ارکان کے فن اور شخصیت پر مشتمل نمبر شائع کیے جائیں گے۔ لہٰذا اس کے تحت اسلم مرزا کے بعد سحر سعیدی صاحب کا نمبر شائع ہوا تھا۔ (اس کے بعد عارف خورشید، شاہ حسین نہری، جاوید ناصر، حمید سہروردی اور نورالحسنین کے نمبر شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں) عالم گیر ادب کتابی سلسلے کے تحت ہر ہفتے ایک نشست کا اہتمام ہونا طے پایا تھا، جس کے تحت یہ نشستیں جاری ہیں۔ ویسے تو سبھی اراکین اُن کے قریب تھے لیکن اسلم مرزا کی قربتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اُن کو اپنا پیر و مرشد کہتے تھے۔ ان نشستوں کے ذریعے میری سحر صاحب سے تقریباً ہر ہفتے ملاقات ہوتی رہی اور ان ملاقاتوں کے سبب ان کے قریب آنے، ان کی شخصیت کو سمجھنے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ ایک دو بار میری اُن سے بحث بھی ہوئی اور ناراضگی بھی رہی لیکن اُس کے باوجود میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ عالم گیر ادب کی نشستوں نے ہم سب کی ادبی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا اور اسی دوران انھوں نے اپنی خودنوشت تحریر کی جو 'یادوں کی مہک' کے نام سے 2015 میں کتابی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں اسلم مرزا لکھتے ہیں کہ:

''یادوں کی مہک ایک دلچسپ من موہنی دلچسپ سوانح ہے جس میں بے شمار کردار ہیں، واقعات ہیں، پلاٹ ہیں، علامت نگاری، تصوریت، رمز و کنایہ، اشاریت اور فلیش بیک کے رنگ آمیز مناظر ہیں اس پر مستزاد اُن کا زوردار بیانیہ جو ایک نیک طینت، سلیقہ مند اور کھرے انسان کی یادوں اور اس کے تجربات زندگی کا دل گداز اظہار یہ ہے جو ایک غیر معمولی ادبی دستاویز بن گئی ہے۔''

اس کے اگلے سال ان کی ایک اور اہم کتاب 'خاصانِ خوش خیال' کے عنوان سے چھپ کر ادبی حلقوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئی، جو مختلف ادبی شخصیات کی حیات اور ادبی کارناموں پر لکھے گئے ان کے مضامین پر مشتمل تھی۔ بقول عارف خورشید:

''خاصانِ خوش خیال اورنگ آباد دکن کے ادبی خزانے کی ایک ایسی کتاب ہے جو اس میں مذکورہ اشخاص ہی نہیں بلکہ سحر سعیدی کے موجود ہونے کا احساس دلانے کے ضامن ہیں۔''

اسے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا جو ان کے انتقال کے بعد ان کے لواحقین نے حاصل کیا تھا۔

سحر سعیدی مرحوم کا ایک اور اہم اپنی نوعیت کا منفرد کام 'ادبی تراشے' ہیں جو انھوں نے بڑی لگن اور جستجو کے بعد اپنے طور پر بڑی تعداد میں جمع کیے تھے۔ 15 جلدوں پر مشتمل 'ادبی تراشے' میں سحر سعیدی نے اہم کثیرالاشاعت روزناموں اور رسائل میں شائع ہونے والے ادبی تحقیقی، تنقیدی مضامین کے تراشوں کو ان میں محفوظ کر دیا۔ بقول خان شمیم ڈاکٹر سحر سعیدی نے برسوں کی ان محنت کو ان اخبار کے تراشوں کو یکجا کیا، زیراکس کاپیاں بنوائیں، بائنڈنگ کروائیں اس طرح ان تراشوں سے اردو کی ایک تاریخ مرتب کر دی۔ دراصل ان کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو اخبارات کے تراشے جمع کرنا شروع کیے تھے۔ ان تراشوں میں شہر اورنگ آباد کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے تذکرے کو محفوظ کرلیا جن کا تعلق اردو زبان اور دکن کی تہذیب و تمدن سے رہا ہے اس کے علاوہ قدیم شعرا اور ادبا پر مختلف دور میں جو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان کو بھی محفوظ کرلیا گیا۔ جو ان کی برسوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔ یہ نہایت ٹھوس اور جامع کام ہے۔ یہ مشکل اور اہم ترین کام سحر سعیدی نے انجام دے کر واقعی اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام کیا تھا۔ یہ ادبی تراشے ریسرچ اسکالرس کے استفادے کے لیے اہم دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ادبی تراشوں کی جلدوں کا اجرا حمایت علی شاعر کے ہاتھوں 2007 میں انجام پایا تھا۔ یہ ایک بڑی یادگار تقریب تھی۔

سحر سعیدی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات کا تمام اہلِ ادب نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور وہ اپنی شاعری کے ساتھ ان تحقیقی و تنقیدی خدمات کے سبب اردو ادب میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ آخر میں دنیا کی بے حسی اور آج کے دور کی ترجمانی کرتے ہوئے اُن کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ

جیتے جی تو قدر نہیں کی 'یاد بھی ہم کو کب آتے ہیں
کتنے دنیا سے اٹھے ہیں' نیک صفت دیوانے لوگ

■

Azeem Rahi
Karim Colony, Roshan Gate
Aurangabad - 431001 Mob.:9370992203

محمد ضیاء المصطفیٰ

اردو صحافت کی خشتِ اوّل

جام جہاں نما

ہندوستان میں انگریزی، بنگلہ، فارسی اور ہندی کی طرح اردو صحافت کی ابتدا بھی کلکتہ سے ہوئی۔ 27 مارچ 1822 کو 'جام جہاں نما' کے نام سے کلکتہ سے ایک اردو اخبار جاری کیا گیا جسے اردو صحافت میں فضل تقدم حاصل ہوا۔ چونکہ اس اخبار کے اجرا سے قبل برصغیر کی زبانوں میں صرف بنگلہ زبان کا اخبار ہی جاری ہوا تھا۔ اس وقت تک اردو یہاں تک کہ فارسی یا ہندی کے بھی کسی اخبار کے نکلنے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیے اسے اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار تسلیم کیا گیا ہے تاہم بعض صحافی اور محققین نے اس کی اولیت سے انکار کرتے ہوئے غالباً دو ایسے اخبارات کی نشاندہی کی ہے جن کی اشاعت 'جام جہاں نما' سے قبل ممکن ہے۔ لیکن چونکہ ان کے دعوے دستاویزی حوالوں اور مستند تاریخی شواہد کے بجائے نرے قیاس پر مبنی ہیں اس لیے محض قیاس اور سماع کی بنیاد پر انھیں کسی محقق شے کے مقابل درست نہیں گردانا جاسکتا ہے۔ مثلاً کچھ ارباب تحقیق نے ٹیپو سلطان کے سرکاری پریس سے شائع ہونے والے 'فوجی اخبار' کو اردو کا پہلا اخبار مانا ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والوں میں پہلا نام 'میسور میں اردو' کے مصنف محمد سعید عبدالخالق کا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''بنگلور کے ایک عمر رسیدہ بزرگ اپنے مرحوم دادا کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ٹیپو سلطان نے جو سرکاری مطبع قائم کیا تھا اس سے اس کے حکم سے ایک سرکاری ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا تھا، جس کی تقسیم اس کی فوج تک محدود تھی۔ اخبار میں فوجی خبروں اور احکام وغیرہ کے علاوہ انگریزوں کی شکایت اور فرانسیسیوں کی تعریف ہوتی تھی۔ یہ مطبع ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ضبط کرلیا گیا اور جہاں کہیں اس اخبار کے نسخے دستیاب ہوئے

27 مارچ 1822 کو 'جام جہاں نما' کے نام سے کلکتہ سے ایک اردو اخبار جاری کیا گیا جسے اردو صحافت میں فضل تقدم حاصل ہوا۔ چونکہ اس اخبار کے اجرا سے قبل برصغیر کی زبانوں میں صرف بنگلہ زبان کا اخبار ہی جاری ہوا تھا۔ اس وقت تک اردو یہاں تک کہ فارسی یا ہندی کے بھی کسی اخبار کے نکلنے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیے اسے اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار تسلیم کیا گیا ہے تاہم بعض صحافی اور محققین نے اس کی اولیت سے انکار کرتے ہوئے غالباً دو ایسے اخبارات کی نشاندہی کی ہے جن کی اشاعت 'جام جہاں نما' سے قبل ممکن ہے۔

انھیں تلف کردیا گیا۔''[1]

اس دعویٰ کی تردید میں مشہور صحافی گربچن چندن نے چند اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے بڑی ہی مدلل گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''مصنف کا ماخذ بنگلور کے ایک عمر رسیدہ بزرگ کی اپنے مرحوم دادا کی روایت ہے جس کی تائید میں انھوں نے کوئی مستند شہادت یا دستاویزی حوالہ پیش نہیں کیا بلکہ خود یہ تاثر دیا ہے کہ آج اس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں کیونکہ انگریزوں نے 1719 میں فتح میسور کے بعد اس کا تمام ریکارڈ تلف کردیا تھا۔ یہ اتلاف کا نظریہ کچھ حلق سے نہیں اترتا۔ ان دنوں انگریز حکام ہر قسم کا ریکارڈ حفاظت سے رکھنے کی راہ پر چل رہے تھے... پھر ایک شکست خوردہ اور جنگ میں کام آجانے والے حکمراں کے مبینہ مطبوعہ اخبار کے ریکارڈ کو تلف کرنے کی ضرورت یا شدت ہی کیا تھی؟... اور پھر اٹھارہویں صدی کے دیسی زبان کے ایک اوّلین اخبار کا رکارڈ تو ویسے ہی ایک ایسا اثاثہ تھا جسے تلف کرنے کے لیے کوئی بھی ذہن آمادہ نہیں ہوسکتا۔''[2]

فوجی اخبار کو اردو کا اوّلین اخبار قرار دینے والوں میں ایک شمیم طارق بھی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب تک کی تحقیق تو یہی تھی کہ کلکتہ کا 'جام جہاں نما' اردو کا پہلا اخبار تھا جو 1822 میں شائع ہوا۔ عبدالسلام خورشید اور عتیق صدیقی نے بھی اسے تسلیم کیا ہے مگر اب جو آثار ملے ہیں، ان کی روشنی میں سرنگا پٹنم سے شائع ہونے والا فوجی اخبار اردو کا پہلا اخبار ہے۔''

ٹیپو سلطان 1782 میں اپنے والد حیدر علی کے انتقال کے بعد سلطنت خداداد کے فرمارو ا ہوئے اور 1799 میں شہادت سے سرخرو ہوئے۔ یہ وہ دور ہے جب مشرق وسطیٰ سے فرانسیسیوں کی سرپرستی میں اخبارات شائع ہورہے تھے۔ ٹیپو سلطان اور فرانسیسیوں میں خاص روابط تھے۔ اس کے علاوہ عبداللہ یوسف علی کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار James Augustus Hicky کا تھا اور ہکیز 'بنگالی گزٹ' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ اخبار 1780 میں جاری ہوا تھا۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ انگریزی اخبار کے ردعمل میں فرانسیسیوں سے تحریک پاکر ٹیپو سلطان نے اخبار شائع کیا

ہو۔اس اعتبار سے اردو کے فوجی اخبار کو برصغیر کی ہر زبان کے اخبارات میں اولیت حاصل ہے۔"[3]

شمیم طارق کی رائے راقم الحروف کے خیال سے اصول تحقیق کے خلاف ہے۔ انھوں نے متذکرہ بالا اقتباس میں محض قیاس کی بنیاد ٹیپو سلطان کے فوجی اخبار کی اشاعت کا نتیجہ اخذ کیا ہے تاکہ 'جام جہاں نما' پر اس کی اولیت وسبقت ثابت ہو سکے کیونکہ ٹیپو سلطان کی شہادت 1799 کی ہے اور فوجی اخبار کو جیسا کہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ٹیپو سلطان نے شائع کیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فوجی اخبارات ان کی زندگی میں ہی یعنی 1799 (جوان کی شہادت کا سال ہے) سے قبل ہی جاری ہوا ہوگا۔ اس طرح فوجی اخبار کی اشاعت کا سنہ، جام جہاں نما کی اشاعت کے سال (1822) سے پہلے ہوگا اور وہ اردو کا پہلا اخبار قرار پائے گا۔ بجز اس کے کہ طارق صاحب دستاویزی حوالوں اور مستند شواہد کی روشنی میں اس اخبار کے وجود واشاعت کو ثابت کرتے حالانکہ انھوں نے خود اولاً یہ تسلیم کیا ہے کہ 'جام جہاں نما' کا اردو کا پہلا اخبار ہونا تحقیق شدہ ہے اس کے باوجود اس کے رد میں کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہ کرنا صرف قیاس پر تکیہ کرنا کئی سوالات کو جنم دیتا ہے کیونکہ کسی شے کی مسلمیت کا اقرار کرتے ہوئے اس پر کسی قیاسی شے کی اولیت وفوقیت کا قائل ہونا اصول تحقیق سے چشم پوشی کی طرف غمازی کرتا ہے۔

فوجی اخبار کے علاوہ اردو کے اولین اخبار کے بارے میں ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ مولوی اکرام علی نے 1810 میں 'ہندوستانی پریس' سے 'اردو اخبار' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جو اردو کا پہلا اخبار تھا۔ نادم سیتاپوری رقم طراز ہیں:

"ہندوستانی پریس قائم کرنے کے بعد اکرام علی کا دوسرا ادبی کارنامہ کلکتہ سے 'اردو اخبار' کا اجرا تھا۔ اردو اخبار 1810 میں کلکتہ سے اکرام علی کی ادارت میں نکلا اور یہی اردو کا پہلا اور سب سے پہلا اخبار تھا۔"[4]

اس دعوے کی تائید میں مدعی موصوف نے سید حامد حسن قادری کی کتاب 'داستان تاریخ اردو' اور سید رئیس احمد جعفری کی کتاب 'بہادر شاہ ظفر' سے ایک ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ پھر مولوی باقر کے 'اردو اخبار' ہری ہردت کے 'جام جہاں نما' اور راجہ رام موہن رائے کے 'مرآۃ الاخبار' کی اولیت کی تردید کے بعد نادم سیتاپوری نے 'اردو اخبار' کے وجود واولیت کی اثبات میں لکھا ہے کہ:

"یہ صحیح ہے کہ 'اردو اخبار' (کلکتہ) کا ایک پرچہ بھی فراہم کرنے میں اب تک میں ناکام رہا ہوں لیکن میں اپنے حافظے پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں "اردو اخبار کے کچھ پرچے بچپن میں میری نظر سے گزرے ہیں جو فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر ٹائپ حروف پر چھپا ہوا تھا.......................... اکرام علی کے 'اردو اخبار' کی نایابی کا سہارا لے کر یہ یقین کر لینا مناسب نہیں ہے کہ اس نام کا کوئی اخبار انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں نکلا ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ چل کر اردو اخبار 'کلکتہ' کے شمارے سامنے آجائیں۔"[5]

مندرجہ بالا اقتباسات پر غور کرنے کے بعد چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ نادم سیتاپوری کے دعوے کی بنیاد دستاویزی حوالوں کے بجائے عہد طفلی کی یادداشت پر ہے جس میں سہو و مغالطے کا قوی امکان ہے۔ دوسرے یہ کہ بچپن میں اتنا شعور بالیدہ نہیں ہوتا کہ انسان اشیا کے درمیان امتیاز کر سکے خاص کر ایک ایسی شے کی شناخت کر سکے جو اپنی نوعت کی پہلی پیش کش ہو جسے اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں اور کسی نے اسے اس چیز سے آشنا نہ کرایا ہو۔ تیسرے یہ کہ یہ دعویٰ، مفروضہ اور ایک ایسی امید پر قائم ہے جس کا وجود وعدم واضح نہیں۔

مزید یہ کہ "انڈین ڈیلی میل کے حوالے سے آر آر بھٹناگر نے کہا ہے کہ مولوی اکرام علی نے 1810 میں ایک اخبار جاری کیا جس کا نام 'ہندوستانی' تھا اور جس کی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس اخبار کے بارے میں کوئی مواد دستیاب نہیں۔"[6]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادم سیتاپوری نے مولوی اکرام علی کے جس اخبار کا ذکر کیا ہے اس کا نام نہ اردو اخبار تھا اور نہ ہی اس کی زبان اردو تھی۔ وہ مغالطے کا شکار ہوگئے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تاریخ صحافت اردو پر اب تک کی گئی تحقیق اور حاصل دستاویزات کی روشنی میں جام جہاں نما کو اردو کی مطبوعہ صحافت کی خشت اوّل تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ 'جام جہاں نما' اردو کا پہلا اخبار ہے۔ اس کا اجرا کلکتہ کے 11 نمبر سرکلر روڈ سے 27 مارچ 1822 کو ہوا تھا۔ اگرچہ بعد میں اس کا دفتر 'کولوٹولہ' منتقل ہو گیا تھا۔

'جام جہاں نما' کے بانی اور درخواست دہندہ ہری ہردت تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے صیغۂ مالیات میں کلرک تھے۔ ان کا تعلق بنگال کے دت خاندان سے تھا۔ ان کے والد تاراچند دت مشہور مصلح اور معمار قوم راجا رام موہن رائے کے صحافتی معاون تھے۔ ایڈیٹر سدا سکھ لعل تھے جو ایک صاحب علم منشی تھے اور پرنٹر کلکتہ میں ہی موجود ایک یورپی تجارتی ادارہ تھا جس کا نام ولیم ہاپکنس پیئر اینڈ کمپنی تھا۔

یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا جو ہر بدھ کو نستعلیق ٹائپ میں شین پریس سے چھپ کر شائع ہوتا تھا۔ اس کا سائز 20x30/8 ہوا کرتا تھا۔ اس کے ابتدائی شماروں کے سرورق کے دونوں طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری مہر کا نشان ہوتا تھا اور یہ نشان کمپنی سے امداد ومراعات حاصل کرنے کے لیے شائع کیا جاتا تھا۔ جب کمپنی نے تخفیف اخراجات کے سبب 1828 میں سرکاری امداد بند کر دی اور 3 ستمبر 1828 کو اخبار کا اپنا چھاپا خانہ بھی قائم ہو گیا تو کمپنی کی مہر کا نشان غائب کر دیا گیا جو روز اول سے اخبار کے ماتھے کی زینت بنا ہوا تھا۔

معلوم ہو کہ 'جام جہاں نما' بنیادی طور پر اردو میں شائع ہونا شروع ہوا تھا لیکن چھ یا سات شماروں کی اشاعت کے بعد قابل اعتنا خریدار نہ ہونے کی وجہ سے فارسی زبان میں تبدیل کر دیا گیا اور جون 1822 سے فارسی میں نکلنے لگا۔ پھر تقریباً ایک سال بعد یعنی 23 مئی 1823 سے فارسی 'جام جہاں نما' کے ساتھ ایک اردو ضمیمہ بھی نکلنا شروع ہوا۔ اس طرح 'جام جہاں نما' کبھی صرف اردو، کبھی صرف فارسی اور کبھی اردو فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ اردو کا یہ ضمیمہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جس کے ہر صفحے پر دو کالم ہوا کرتے تھے، سرورق کے دونوں طرف فارسی حصے کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی

معلوم ہو کہ 'جام جہاں نما' بنیادی طور پر اردو میں شائع ہونا شروع ہوا تھا لیکن چھ یا سات شماروں کی اشاعت کے بعد قابل اعتنا خریدار نہ ہونے کی وجہ سے فارسی زبان میں تبدیل کر دیا گیا اور جون 1822 سے فارسی میں نکلنے لگا۔ پھر تقریباً ایک سال بعد یعنی 23 مئی 1823 سے فارسی 'جام جہاں نما' کے ساتھ ایک اردو ضمیمہ بھی نکلنا شروع ہوا۔ اس طرح 'جام جہاں نما' کبھی صرف اردو کبھی صرف فارسی اور کبھی اردو فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔

سرکاری مہر کا نشان بھی ہوتا تھا اور نشان کے بالکل نیچے جلی حروف میں اخبار کا نام لکھا ہوتا تھا۔ ابتدائی صفحے کے داہنے سرے پر 'اردو زبان میں' لکھ کر ضمیمہ کے اردو زبان میں ہونے کی طرف اشارہ کیا ہوتا تھا۔ اس کے سامنے شمارہ نمبر اور تاریخ اشاعت بھی درج ہوتا تھا۔

'جام جہاں نما' کے فارسی حصے کا ماہانہ چندہ دو روپے اور اردو ضمیمہ کا ماہانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔ مطلب یہ کہ فارسی 'جام جہاں نما' اپنے اردو ضمیمے کے ساتھ صرف تین روپے ماہانہ کے ساتھ دستیاب تھا لیکن اگر قاری کو صرف اردو ضمیمہ درکار ہوتا تو اسے اس کے لیے بھی فارسی حصے کی طرح دو روپے ہی ماہانہ ادا کرنا ہوتا تھا۔

یہ سلسلہ 23 جنوری 1828 تک یونہی چلتا رہا، اس کے بعد اخبار کے مالک ہری ہردت نے اردو حصے کو بند کرنے اور اس کی جگہ فارسی حصے کو آٹھ صفحات کے بجائے بارہ صفحات پر نکالنے کا اعلان کردیا۔ چنانچہ 23 مئی 1823 سے 23 جنوری 1828 تک یعنی چار سال آٹھ ماہ تک اردو پرچہ فارسی پرچے کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوتا رہا اور بالآخر مطبوعہ اردو صحافت کی خشت اول رکھ کر ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

'جام جہاں نما' کے ابتدائی چھ شمارے جو صرف اردو میں ایک مستقل اخبار کی حیثیت سے شائع ہوئے تھے ان کا تلف ہونا، اخبار کی زبان کا فارسی زبان میں تبدیل ہونا اور فارسی حصے کے ساتھ اردو حصے کا بطور ضمیمہ شائع ہونا چند ایسے عوامل ہیں جن کی بنا پر بعض ارباب صحافت کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس اخبار کا اجرا سب سے پہلے فارسی میں ہوا تھا، اردو پرچے کا سنہ اشاعت 1823 ہے اور اردو پرچے کی اشاعت ابتداً کسی مستقل اخبار کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ فارسی پرچے کا ایک ضمیمہ تھا۔ ان تمام غلط فہمیوں اور شبہات کا ازالہ ڈاکٹر جان برائس کے اخبار 'جان بل' کے اس اطلاعاتی بیان سے ہوتا ہے جو کلکتہ جرنل کے 1822 کے فائل میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''آج صبح ایک نیا اخبار ہندوستانی زبان میں جاری ہوا ہے۔ یہ اخبار کوارٹر سائز کے تین ورق پر مشتمل ہے اور اس کا نام 'جام جہاں نما' ہے۔ پہلا شمارہ بدھ کے دن 27 مارچ کو شائع ہوا۔''[7]

'جام جہاں نما' کے دستیاب فائلوں کے جائزے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں عموماً ملکی اور غیرملکی خبریں ہی ہوتی تھیں۔ خبروں کی سرخیاں چھوٹی ہوتی تھیں۔ جیسے بنارس کی خبر، لاہور کی خبر، مفت کی خبر وغیرہ۔ ایک شمارے میں اوسطاً چار خبریں ہوتی تھیں اور عموماً ایک خبر ایک کالم سے تین کالم تک پھیلی ہوئی تھی اور بسا اوقات چار صفحوں پر بھی مشتمل ہوتی تھی۔ اہم خبریں شروع میں رکھی جاتی تھیں۔ خبروں میں ہی اکثر مدیر کی رائے اور تبصرہ شامل ہوتا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر یہ خبریں نوع بنوع ہوتی تھیں۔ سیاست، جنگ، جرم و سزا، تعلیم، نئی ایجادات و انکشافات اور انسانی دلچسپیوں سے متعلق خبریں اس اخبار میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نمونے کے طور پر تعلیم سے متعلق ایک خبر ملاحظہ ہو:

''اخبار کے کاغذ سے جانا گیا کہ انگلینڈ کے ملک میں ایک کروڑ پانچ لاکھ آدمی سب فرقے رہتے ہیں۔ ان میں سے چھ لاکھ پچاس آدمی ہنروں کے سیکھنے میں مصروف ہیں اور فرانس کے رہنے والے تین کروڑ دو لاکھ آدمی سب گننے میں آئے۔ ان میں سے دس لاکھ ستر ہزار شخص علم پڑھنے کے لیے اسکول میں زندگانی کرتے ہیں۔ اس بات سے ثابت ہوا کہ انگلینڈ کے لوگ اور ملکوں کی خلقت سے زیادہ کسب کمانے کے واسطے ہمت رکھتے ہیں۔''[8]

> **'جام جہاں نما' کو صحافت کے بنیادی وظائف، خبر کی فراہمی، تعلیم اور تفریح کے اعتبار سے اردو صحافت کا امید افزا آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار نے اردو صحافت میں جن روایات کو رواج دیا، بعد میں شائع ہونے والے اخبارات نے ان کی تقلید کی اور بہت سارے امور میں اس کی روش کو اپنایا۔**

'جام جہاں نما' کی خبروں کے حصول کے متعدد ذرائع تھے۔ کچھ خبریں انگلستان اور کلکتہ کے مطبوعہ انگریزی اور فارسی اخبارات سے ترجمہ کرکے حاصل کی جاتی تھیں، تو کچھ خبریں قلمی اخبارات، سرکاری وقائع نگار کے مراسلوں اور قارئین کے خطوط سے اخذ کرکے اپنے اسلوب میں ترتیب دیے جاتے تھے لیکن ان خبروں کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔

'جام جہاں نما' کی زبان تکلف اور آرائش سے پاک ہے اور اس کی نثر سلیس، رواں اور عام فہم ہے کیونکہ اس کے مدیر وغیرہ اگرچہ اردو کے تہذیبی مراکز سے دور تھے لیکن چونکہ ان کی نظر انگریزی زبان و ادب اور انگریزی کے مطبوعہ اخبارات پر گہری تھی اس لیے وہ اپنے اخبار میں خبریں سیدھی سادی اور آسان زبان میں لکھنے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ 'جام جہاں نما' کی نثر میں ادبی حسن بھی جا بہ جا پایا جاتا ہے۔ اس کی نثر پر فارسی کے اثرات برائے نام بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی خبروں میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے جوہر بھی نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی خبروں میں بھی ادبی چاشنی کا لطف ملتا ہے تاہم کہیں بھی اخباریت کے فقدان کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ ادبی طرز نگارش کا عکاس خبر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''آج تک بنارس کی صبح اور اودھ کی شام خاص و عام کے زبان زد تھی۔ اس سبب سے کہ بنارس میں صبح دم گنگا کے کنارے ایسی (ایسے) پری پیکروں کی بھیڑ ہوتی ہے کہ ہفت اقلیم کے سیاح ان کے دیکھنے سے حیران ہوتے ہیں اور اودھ میں شام کے وقت شفق کی سرخی اور دو گز کے فاصلے سے پہاڑوں کی سیاہی اور دریا کے کنارے سبزی ایسی لطافت دکھلاتی ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اب اخبار کے کاغذ سے ایسا ثابت ہوا کہ انگلستان کے صاحبو(ں) نے چڑوبا کی صبح و شام کو بہت پسند کیا اور اس دلیل سے کہ اس وقت کی ہوا آدمی کے جسم کو تازگی اور بدن کو تفریح بخشتی ہے وہاں کی صبح اور شام کو بنگالے کے ملک پر ترجیح دیا۔''[9]

بہرکیف 'جام جہاں نما' کو صحافت کے بنیادی وظائف، خبر کی فراہمی، تعلیم اور تفریح کے اعتبار سے اردو صحافت کا امید افزا آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار نے اردو صحافت میں جن روایات کو رواج دیا، بعد میں شائع ہونے والے اخبارات نے ان کی تقلید کی اور بہت سارے امور میں اس کی روش کو اپنایا۔

حواشی

1 میسور میں اردو از محمد سعید عبدالخالق، مطبوعہ درگاہ اردو دارالمطالعہ عام، معظم بلڈنگ حیدرآباد 1942، ص 76،77
2 جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا از گربچن چندن، ص 25
3 شمیم طارق، روشن لکیریں، ممبئی 1998 ص 80
4 فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی، از نادم سیتاپوری، شائع کردہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ 1959، ص 170
5 فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی از نادم سیتاپوری، ص 172
6 بحوالہ جام جہاں نما، اردو صحافت کی ابتدا از گربچن چندن، ص 24
7 صحافت پاکستان و ہند میں از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص 20
8 جام جہاں نما، 4 مئی 1825
9 جام جہاں نما، یکم اکتوبر 1825

■

Md Ziyaul Mustafa
Senior Research Fellow, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

کتابوں کا محل: امیر الدولہ پبلک لائبریری

زین البشر انصاری

لکھنؤ اپنی تہذیب وتمدن کے لیے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی ایک الگ پہچان کا حامل ہے۔ نوابین اودھ کے عہد سے لے کر موجودہ زمانے تک شہر لکھنؤ کی اپنی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ نوابین اودھ کے زمانے میں دار السلطنت ہونے کا شرف اسے حاصل تھا اور آج بھی اتر پردیش کی راجدھانی کے طور پر یہ جانا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں سیاح وعوام الناس نوابین اودھ کی تعمیر کردہ تاریخی عمارتوں کی سیر سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک سے بھی لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور اس طرح وہ تاریخ کے اس سنہرے دور کا کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھوں سے دیدار کرتے ہیں۔ لکھنؤ اور یہاں کی تعمیرات کو دیکھ کر بہت سے لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ لکھنؤ ایک طرف اپنی تاریخی وراثت کے لیے مشہور ہے تو وہیں تجارت کے لیے بھی کیونکہ یہاں کے تیار کردہ چکن کے کپڑے پورے ملک میں پہنے جاتے ہیں۔ لکھنؤ ہر زمانے میں اپنے علمی ادبی تجارتی اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔

تعلیمی میدان میں بھی لکھنؤ اپنی نمایاں خدمات کے سبب ماضی سے تاحال جانا جاتا ہے یہاں کے تعلیمی ادارے پوری دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ شبلی کا مشہور مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم 1888 میں یہیں بارہ دری میں پڑھا گیا تھا اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی اسی مطلع سے شبلی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ نوابین اودھ اپنی طرز معاشرت، طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ علم پروری اور کتاب دوستی کے سبب بھی جانے گئے۔ عبدالحلیم شرر مرحوم نے گذشتہ لکھنؤ لکھ کر جہاں بہت سے واقعات اور باتوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے وہیں اب بھی اس عہد کی بہت سی یادگار ہیں جن سے نوابین اودھ کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انھیں میں ایک امیر الدولہ پبلک لائبریری ہے۔

امیر الدولہ پبلک لائبریری کی تاریخ ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔ نوابین اودھ کو تعلیم سے بے پناہ محبت تھی۔ تعلیم کو فروغ دینے میں انھوں نے یوں تو بے شمار خدمات انجام دیں۔ انھوں نے عوامی خدمت کے جذبے اور علم دوستی کی وجہ سے ہی عوام الناس کے لیے ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی جس سے سبھی لوگ ایک جگہ پر بیٹھ کر فیض یاب ہوسکیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایک لائبریری کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس کتب خانے کی بنیاد کا اصل مقصد یہی تھا کہ عوام الناس کتابوں سے براہ راست استفادہ کریں اور اس طرح ان کی تعلیمی لیاقت میں اضافہ ہو۔ یہ لائبریری آج بھی علمی فیض رسانی کا کام انجام دے رہی ہے اور اس میں اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور بعض دیگر زبانوں کی کتابیں موجود ہیں۔

لائبریری کا قیام 1886 میں ہوا۔ لائبریری کے بعض اندراج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1857 کی لوٹ پاٹ اور قتل وغارت نے جو تباہی مچائی تھی اس کا کوئی حساب نہیں۔ اس موقع پر انسانی جانوں اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ علمی آثار کا بھی زیاں ہوا۔ کتابیں اور دیگر علمی چیزیں بھی برباد ہوئیں۔ لیکن اس کے بعد جب حالات قدرے معمول پر آئے تو اس بچے کھچے آثار کو اور چیزوں کو جو کہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں شکلوں میں تھیں، جمع کر کے لائبریری کی بنیاد رکھی گئی۔ آج بھی امیر الدولہ لائبریری کے ذخائر میں ایسے نادر و نایاب مخطوطے موجود ہیں جس پر بادشاہ اودھ کی لال مہر لگی ہوئی ہے۔''

قدیم نسخہ تاریخ سعادت پر شاہی کتب خانہ کی مہر لگی ہوئی ہے۔

کتب خانہ میں گزیٹیر کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اس میں موجود یونائیٹڈ پراونسز گورنمنٹ گزٹ میں یہ لکھا ہے کہ'' 1882 میں لکھنؤ کا صوبائی میوزیم کا یہ ایک حصہ تھی اور اس وقت اس کا نام 'لکھنؤ پبلک لائبریری' تھا۔ اس لائبریری کا استعمال کچھ خاص لوگ ہی کر سکتے تھے لیکن 1887 میں یہ لائبریری پہلی بار عوام الناس کے لیے کھول دی گئی۔ اب ہر ایک خاص وعام اس لائبریری میں موجود قیمتی سرمایہ سے استفادہ کرسکتا تھا۔

1907 میں یہ لائبریری لال بارہ دری کے بالائی حصے پر قائم کی گئی تھی، جو اس وقت لکھنؤ کا میوزیم بھی تھی 1910 تک لکھنؤ پبلک لائبریری کے نام سے ہی جانی جاتی رہی۔ انجمن ہند کی تیسری جلد میں اس کتب خانہ کی تاریخ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے:

''تعلقہ داران اودھ کی انجمن (برٹش ایسوسی ایشن)

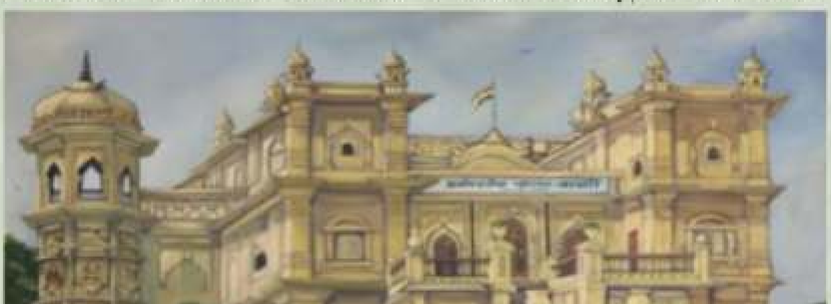

امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ کی قدیم عمارت کی تصویر

جو کہ انجمن اودھ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس کا ایک جلسہ 7 فروری 1904 کو منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے یہ فیصلہ لیا گیا کہ ریاست محمود آباد کے مالک سر محمد امیر حسن خان بہادر ممتاز جنگ مرحوم کی اعلیٰ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے شایانِ شان ایک یادگار لائبریری کی صورت میں قائم کیا جائے۔''

(انجمن ہند جلد سوم ص 152)

اس موقعے پر اس وقت کے راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی ریاست سے اس یادگار لائبریری کو مبلغ پچاس ہزار روپے اور تیس ہزار روپے کی کتابیں بطور تحفے میں دینے کا وعدہ کیا۔

3/فروری 1920 کو مذکورہ بالا انجمن اودھ کے جلسہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ راجہ امیر حسن خاں بہادر مرحوم آف محمود آباد کی یاد میں جو لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ 1904 میں لیا گیا تھا اس پر عمل درآمد جلد سے جلد ہو اور اس کے قیام کو جتنی جلد ممکن ہو یقینی بنایا جائے اور اس لائبریری کے لیے ایک الگ عمارت تعمیر کی جائے۔ جس میں اس لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس کام میں تیزی لانے کے لیے ایک سلیکٹ کمیٹی قائم کی گئی جس میں راجہ صاحب جہانگیر آباد اور راجہ کوری شامل تھے۔ ان صاحبان کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس لائبریری کی عمارت کے لیے 'انجمن اودھ' کے دفتر کے برابر ہی الٹی کوٹھی (یہ عمارت اب موجود نہیں ہے) کی جگہ تجویز پیش ہوئی اور یہ طے پایا کہ اسی زمین پر لائبریری کی نئی عمارت تعمیر کی جائے۔ 22/جنوری 1921 کو اس عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور اس کا سنگ بنیاد ایک شاندار تقریب کی صورت میں اس وقت کے گورنر سر ہارٹ کورٹ بٹلر صاحب کے بہ دست مبارک سے رکھا گیا۔ یہ عمارت تقریباً پانچ سال یعنی 1926 میں بن کر تیار ہوگئی۔ انجمن ہند جلد سوم ص 160 پر لکھا ہے کہ:

6 مارچ 1926 کو سر ولیم مایرس (Sir William Mayers) گورنر صوبہ جات متحدہ آگرہ اور اودھ نے باقاعدہ اس لائبریری کا افتتاح کیا اور اسی افتتاحی تقریب میں اس لائبریری کا نام 'امیر الدولہ گورنمنٹ پبلک لائبریری' طے پایا گیا۔'' (انجمن ہند جلد سوم، ص 160)

یہ لائبریری اسی صورت میں 1947 تک کام کرتی رہی۔ 1947 میں ہندوستان کی آزادی کے بعد اس لائبریری کا نام حکومت اتر پردیش کی طرف سے ''امیر الدولہ پبلک لائبریری، ہوگیا۔ تب سے لے آج تک اسی نام سے اپنی خدمات عوام الناس کے دیتی چلی آرہی ہے۔ اس کتب خانہ کے موجودہ ذخائر میں تقریباً تین لاکھ کے قریب کتابیں، رسائل و جرائد موجود ہیں۔ اس لائبریری میں تاڑ پتر، تامر پتر، بھوج پتر، اور بہت سے نادر و نایاب مخطوطے موجود ہیں جو شاید لکھنؤ کے لیے کسی بھی لائبریری میں موجود نہ ہوں اسی لیے یہ محققین کے توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ اس لائبریری میں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگلا، برمی، بنگالی اور پالی زبان میں مخطوطات و مطبوعات موجود ہیں۔ سنسکرت زبان میں تقریباً 270 مخطوطات ہیں۔ اسی طرح عربی، اردو اور فارسی زبان میں مخطوطات موجود ہیں جن کے تحفظ کا انتظام کیا گیا۔ لکھنؤ کے انٹیک کے ذریعہ سے ان مخطوطات کا تحفظ کیا جاتا ہے۔

اس کتب خانہ میں موجود مخطوطات کی تعداد تقریباً 300 کے قریب ہے۔ ان میں عربی فارسی اردو اور سنسکرت زبان میں ہے۔ جو علم نجوم، منطق و فلسفہ، تاریخ، لغات، تصوف اور شاعری وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ان مخطوطات میں کچھ مخطوطے ایسے بھی ہیں جو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں ذخیرہ میں موجود کچھ نسخوں پر شاہی مہر لال رنگ کی لگی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر عربی زبان میں موجود مخطوطہ 'برہان اسطرلاب' کے سرورق پر شاہان اودھ کے کتب خانہ کی سرخ و سیاہ مہر لگی ہوئی ہے۔ فارسی زبان میں موجود 'تاریخ سعادت' مصنف امام بخش بیدار جو منظوم اودھ کی تاریخ ہے اس کے سرورق پر بھی شاہان اودھ کی سرخ مہر ثبت ہے۔

اس لائبریری کے ذخائر میں غیر مطبوعہ مخطوطات ہیں جن کی اپنی ایک الگ تاریخی اہمیت ہے۔ اس میں ہمایوں نامہ اور مجمع الفرس سروری ہے۔ یہ دونوں مخطوطات فارسی زبان میں ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی اپنی اہمیت و افادیت بہت ہے۔ اس پر امجد علی شاہ بادشاہ کی مہر لگی ہے۔ اس میں ایک بہت ہی نادر و نایاب کتاب 'واقعات بابری' (مصنفہ مرزا عبد الرحیم خاں خاناں) ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں بابر کے عہد سے عہد جہانگیر تک کے واقعات سلسلے وار درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر اودھ کے بادشاہ امجد علی شاہ کی مہر لگی ہوئی ہے۔

اس لائبریری کے ذخائر میں ایسی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے جو اٹھارہ سو ستاون کے اہم دستاویز کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت ملک ہی نہیں بلکہ غیر ملکی سطح پر بھی رہی ہے۔ جن میں انگریزی زبان میں Mrs. Murter کی بہت ہی اہم کتاب "Recollectons of the Sepoy Revolt 1857-1858" ہے۔ جس میں جنگ آزادی میں ہندوستانی سپاہیوں کی کہانی کو بہت ہی دلکش پیرائے میں

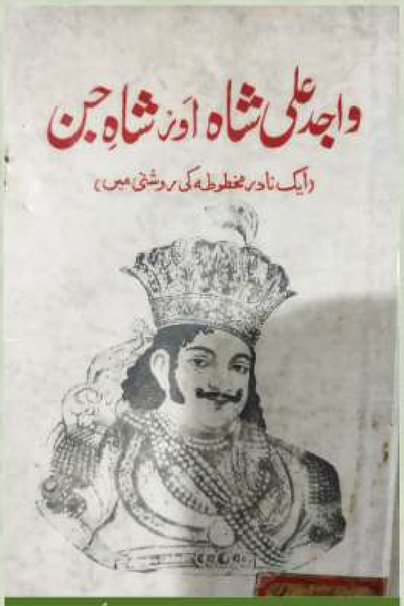

لائبریری کا ایک نادر مخطوطہ جسے لائبریری نے شائع کیا ہے۔

بیان کیا گیا ہے۔ Chritopher Hibbert کی تاریخی کتاب "The Great Mutiny India 1857" ہے۔ جس میں اس جنگ عظیم کی داستان کو مصنف نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعہ ابھی کا ہے۔ William Howar Russel کی مایہ ناز تصنیف "My Indian Mutiny Diary" ہے۔ جس میں انھوں نے اس جنگ عظیم کے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ "Freedom Struggle in Uttar Pradesh" کے نام سے ہے جسے Publications Bureau نے سات جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بھی کتب خانہ کے ذخائر میں ایک اہم اضافہ ہے اور اپنے قاری کو بہت ہی اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی اہم و نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں ہر ایک کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہندی زبان و ادب میں بھی کئی اہم کتابیں جو اس لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ 'بھارت میں انگریزی راج' سندر لال کی بہت ہی مقبول و عام کتاب ہے اس کتاب میں انگریزوں کے ہندوستان آنے سے قبل بابری حملے جو ہوئے اس وقت ہندوستان کی کیا حالت تھی اور پھر انگریزوں کے وقت کیا حالت ہوئی ان کے منفی اثرات کیا ہوئے ان سب کے بارے میں بہت بیباکی کے ساتھ سندر لال جی نے بحث کی۔ یہ کتاب تاریخ کے طالب علم کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ ایک اور بہت ہی اہم کتاب عبد الرحمٰن ابن خلدون کی 'ابن خلدون کا مقدمہ' ہے۔ جو تاریخی اعتبار سے بہت اہم تاریخی ماخذ ہے۔ راہل سانسکرتیاین

کی تصنیف 'میری جیون یاترا' جس کا شمار اہم خودنوشتوں میں کیا جاتا ہے ایک بہت اہم کتاب ہے۔

لائبریری کا سب سے اہم ذخیرہ۔

اس لائبریری میں جہاں ایک طرف نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ ہے وہیں نقاشی کے متعلق بہت سے ایسے فوٹو فریم موجود ہیں جس کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ابھی بنا کر تیار کیا گیا ہو۔ جبکہ وہ ساٹھ سے ستر سال پرانے ہیں۔ مغل نقاشی اور نوابین اودھ کی نقاشی سے متعلق بہت ہی اہم فوٹو فریم موجود ہے۔ "Jeypore Portfolio of Archtectural Details" کے نام سے ایک کتاب موجود ہے جس میں محرابوں کے ڈیزائن اور پچی کاری کے ایسے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ان کی خوبصورتی کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ ایک دوسری اہم کتاب Paintings کے حوالے سے ہے جس کی پینٹنگ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ابھی کی تیار کردہ ہے۔ تقریبا سو سال پرانے ہوجانے کے بعد بھی اس کے رنگ میں تھوڑا بھی فرق نہیں آیا ہے اور اس کی چمک ویسے ہی قائم ہے۔ اس کتاب کا نام "Famous Paintings" کے نام سے ہے۔

ہندوستان ماضی سے ہی اپنے سوتی کپڑوں کے لیے مشہور تھا۔ وہ طرح طرح کے ملبوسات کو الگ الگ ڈیزائن سے تیار کرتا تھا۔ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے غیر ملکیوں کی نظریں ہندوستان کی اس تجارت پر پڑی ہوئی تھیں۔ اس لائبریری کے ذخیرہ میں ٹکسائل کے نام سے تقریبا آٹھ جلدوں میں ایک کتاب محفوظ ہے۔ اس کتاب کا نام "Collectonf of Specimens of the Textile Manufactures of India" ہے۔ اس میں جو ڈیزائن 1873 سے قبل تیار کیے جاتے تھے ان کو یکجا کر کے یہ کتاب تیار کی گئی ہے۔ اس میں ہر ایک قسم کے کپڑے کو محفوظ کر کے رکھا گیا ہے اتنے پرانے ہونے کے باوجود بھی ان کپڑوں کی کوالٹی اور رنگ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اسی لیے اس لائبریری کی ہندوستان میں ایک الگ اہمیت ہے۔

لائبریری کا ٹکسائل کے ذخیرہ کا فوٹو

اس لائبریری کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں الگ الگ سکشن بنے ہوئے ہیں۔ بچوں کے لیے بال کچھ، اودھ سکشن، منشی نول کشور سکشن، انگریزی، اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت، عربی وغیرہ کا الگ الگ سکشن ہے۔ اس کتب خانہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کرنے کے لیے کمپٹیشن بھی ہے۔ جہاں پر مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کے لیے کتابیں، رسائل و جرائد ماہانہ آتے ہیں جس میں کرونیکل، پرتیوگیتا درپن، انڈیا ٹوڈے وغیرہ آتے ہیں۔ اس لائبریری کے اس مقابلہ جاتی سکشن سے فیض یاب ہو کر بہت سے طلبا و طالبات نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لائبریری کے ہر ایک شعبے کی اپنی ایک الگ خوبی ہے۔ اسی وجہ سے اس لائبریری کا نام پورے ملک میں لیا جاتا ہے۔

لائبریری کے کتب خانہ میں ایک سے ایک نایاب کتابیں موجود ہیں۔ ان کی دیکھ بھال لائبریری کے کارکنان کے لیے ایک اہم ہدف ہے۔ موجودہ وقت میں لائبریری کے ایکٹنگ لائبریرین کے طور پر جناب ہریش سنگھ کا کام کر رہے ہیں۔ جو باصلاحیت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کو ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔

اس لائبریری کے ذخائر میں موجودہ کتابوں کی تاریخ دو سو سال سے بھی پرانی ہے۔ اتنی پرانی کتابوں کو ضائع ہونے کا بھی ڈر ہے اور بہت سی کتابیں کیڑے مکوڑے لگنے کی وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ اسی وجہ سے اتنے اہم ادبی سرمایہ کے تحفظ کرنے کے لیے کتب خانہ نے اپنے کئی ایسے نادر و نایاب مخطوطے کو دوبارہ شائع کروا کر محفوظ کر لیا ہے۔ لکھنؤ ہر دور میں اپنی ایک الگ پہچان بنائے ہوئے تھا۔ اس لیے اسمارٹ سٹی کے زمرے میں آنے کے بعد سے ہی یہاں پر ہر ایک شعبہ جات میں خاطر خواہ تبدیلی لائی جانے لگی۔ ٹکنالوجی کا استعمال بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔ حکومت وقت کے ڈیجیٹل انڈیا کے نعرے کے ساتھ ہی ہر ایک شعبہ میں ڈیجیٹل کام ہونے لگا۔ لوگ اس کے زیادہ عادی ہو گئے اور ان کو سہولیت بھی فراہم ہونے لگی۔ اس کے مدنظر حکومت اترپردیش نے لائبریری کو ڈیجیٹل لائبریری بنانے کا فیصلہ لیا۔

لکھنؤ اسمارٹ سٹی نے اس لائبریری میں محفوظ ذخائر جو کہ سو ڈیڑھ سو سال سے بھی پرانے ہیں وہ تباہ و برباد ہو جائے اور ایک وقت کے بعد کوئی بھی چیز کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے پنچ سالہ پروجکٹ کے ذریعے

لائبریری کے ڈیجیٹل لیب کی تصویر۔

سے اس لائبریری کو ڈیجیٹل لائبریری بنانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کا نام 'لکھنؤ ڈیجیٹل لائبریری' ہوگا۔ جس کا کام بہت تیزی سے چل رہا ہے اور یہ کام تقریبا پورا ہو گیا جس کو اس لنک کے ذریعے سے www.lucknowdigitallibrary.co آسانی سے اس لائبریری کی نادر و نایاب کتابوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لائبریری کو ڈیجیٹل لائبریری بنانے کا پروجکٹ بنگلور کی کمپنی انفار ملکس پبلشنگ لیمیٹڈ کو ملا ہے۔ کمپنی نے اس پروجکٹ کو طے وقت پر اسے مکمل کر دیا ہے۔ یہ حکومت وقت اور اسمارٹ سٹی کا بہت ہی قابل تعریف قدم ہے۔ اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔

■

Zainul Bashar Ansari
296/19k, Hata Sangi Beg
Shahgunj, Lucknow: 226003
Mobile No. 9936763045

صدف کلام

جھاگ چھوڑتے اور جلتے ہوئے پانی کے ذخائر
ایک خطرناک معمہ

یہ صحیح کہا گیا ہے کہ پانی زندگی ہے۔ چونکہ کرۂ ارض کا 70% فیصد حصہ پانی ہے،لہٰذا بلاشبہ پانی ہمارے عظیم وسائل میں سے ایک ہے۔ یہ گھریلو اور صنعتی دونوں مقاصد کے لیے ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ پانی کے ذخائر کی متعدد قسمیں ہیں؛ پانی کے قدرتی ذخائر ہوتے ہیں، جیسے سمندر، دریا وغیرہ اور مصنوعی یا انسان کے پیدا کردہ ذخائر ہوتے ہیں، جیسے ساختہ ذخیرۂ آب (Reservior)، تالاب، حوض، ٹنکی، جھیل وغیرہ۔ پوری دنیا کے آبی ذخائر فضلات سے بھرتے جارہے ہیں، جن میں پلاسٹک کے تھیلے اور کیمیائی فضلات شامل ہیں، جو ہمارے پانی کے ذخائر کو زہر کے جوہڑ میں بدل رہے ہیں۔ پلاسٹک کے تھیلے میں زائی لین (Xylene)، ایتھی لین آکسائڈ (Ethylene Oxide) اور بنظین (Benzene) بطور کیمیائی اجزا شامل ہوتے ہیں، جو بنی نوع انسان اور ماحول دونوں کے لیے زہریلے ہوتے ہیں۔ صنعتی فضلات خطرناک ہوتے ہیں، جن میں کیمیائی محلل (Solvent)، رنگنے کے مادّے، کچرے، دھات، راکھ،پینٹس، ریگ مال، کاغذی اشیا، صنعتی ذیلی پیداوار اور تابکاری (Radioactive) فضلات شامل ہوتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر پانی کے ذخائر کی گندگی کا مطلب دراصل آبی آلودگی ہوتا ہے۔ جھیلوں، تالابوں، سمندروں، دریاؤں اور ندیوں کے غلط استعمال اوران میں متعدد قسم کے فضلات کے درآمد کو آبی آلودگی کہتے ہیں۔ان مادّوں اور زہریلے فضلات کے اخراج کے سبب پانی کی نوعیت و ماہیت منفی طریقے سے بدلتی ہی نہیں ہے بلکہ باقی ماندہ پانی کے ذخائر سوکھنے بھی لگتے ہیں۔

آبی آلودگی ایک خوفناک مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ اتنا خطرناک ہے کہ دنیا کو تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچا سکتا ہے۔ پانی ایک آسان محلل ہے اور بیشتر آلودکاروں کو اپنے میں آسانی سے تحلیل کرسکتا ہے، نتیجتاً آلودہ ہوسکتا ہے۔ آبی آلودگی کا سب سے بنیادی مضر اثر براہ راست نامیوں بشمول پانی اور خشکی دونوں پر پائے جانے والے حیوانوں اور نباتی زندگیوں پر پڑتا ہے، جو پانی میں زندہ رہتے ہیں۔ جب ہم انسانی سطح پر دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ہر روز متعدد لوگ آلودہ اور جراثیم زدہ پانی کے استعمال سے مرتے ہیں۔ آبی ذخائر جھاگ چھوڑ رہے ہیں اور آگ پکڑ رہے ہیں، جس سے گردونواح میں رہنے والوں کی صحت کو سنگین خطرات درپیش ہوتے ہیں۔ دراصل جھاگ چھوڑنے کا عمل 2015 میں بنگلور کی جھیلوں اور تالابوں سے شروع ہوا، اس کے بعد حیدرآباد اور پھر ہندوستان کے دیگر علاقوں کی جھیلوں اور تالابوں تک پہنچ گیا۔ آبی ذخائر بالخصوص جھیلیں مہلک اور زہریلے جھاگ چھوڑ رہی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں تیزی سے ہورہے تعمیری کام اور ناقص شہری منصوبہ بندی کے سبب بالآخر آبی ذخائر روز بروز کثیف ہوتے جارہے ہیں۔ یہ آبی ذخائر آلودکاروں سے لبریز ہیں، نتیجتاً پورا ہندوستان ایک خوفناک ماحولی بحران سے دوچار ہونے کی کگار پر پہنچ گیا ہے۔ جھیلوں کو ان کے نازک اور بہت پیچیدہ ماحولی نظام کے سبب انھیں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ جھیلیں دراصل خودصفاکار مخفی قوت نہیں رکھتیں، لہٰذا آسانی سے آلودکاروں کی زد میں آجاتی ہیں۔ بڑے پیمانے پر صنعت کاری، شہرکاری اور غلط طرز پر زمینوں کے استعمال سے بھی آبی آلودکاری ہورہی ہے اور آبی ذخائر روز بروز سوکھتے اور اوجھل ہوتے جارہے ہیں۔ چونکہ آبی آلودگی نے آبی اور ارضی مخلوقات دونوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے، لہٰذا اب سے اگر بالکل ختم کرنے کے لیے نہیں تو کم سے کم ماحولی نظام پر مرتب ہورہے خطرناک اثرات کو کم کرنے کے لیے ہی صحیح سنجیدہ اقدامات اٹھائے جانے چاہئیں۔

جھاگ دراصل ہے کیا؟

آبی ذخائر میں جھاگ عام طور سے ایک قدرتی عمل کا نتیجہ ہے، جو مائع میں ہلچل کے عمل کے باعث بنتا ہے۔ اس مسلسل عمل کے نتیجے میں ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے بلبلے بن جاتے ہیں۔ قدرتی جھاگ جھیلوں، تالابوں، ندیوں، پانی کے چشموں میں اس وقت بنتے ہیں، جب آبی نامیے مرتے ہیں اور تحلیل ہوجاتے ہیں، نتیجتاً آبی ذخائر میں متعدد نامیاتی مرکبات پائے جانے لگتے ہیں۔ یہ قدرتی نامیاتی مرکبات آبی سالموں میں ایک دوسرے کے لیے پائے جانے والے تناؤ کو کم کرتے ہیں، جسے پانی کی جھلی کا تناؤ کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال ہوا کو پانی سے آمیز ہونے میں آسانی فراہم کرتی ہے۔ آبی ذخائر پر بہتی ہوئی ہوا اس میں مزید ہلچل پیدا کرتی ہے، جس سے جھاگ کے پیدا ہونے کے عمل میں

آسانی فراہم ہوتی ہے۔ بیشتر عمومی جھاگ غیر مستحکم اور ایک مخصوص ساخت کے ساتھ گیس اور مائع کے دو مرحلے وار میڈیم ہوتے ہیں۔ یہ مخصوص ساخت مائع کی پتلی جھلی اور پلیٹیو بارڈرس کے ایک نیٹ ورک میں مقبوض گیس حلقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

جھاگ بننے کا عمل واحد عامل کے بجائے مجموعی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں تین اہم عوامل طبیعیاتی، کیمیائی اور حیاتیاتی شامل ہیں۔

الف: جھاگ کے لیے ذمے دار طبیعیاتی عوامل: اس میں کچھ خارجی طاقتوں کے سبب آبی ذخائر میں ہلچل شامل ہے، جو ہوا کے سبب میکانکی یا قدرتی ہوسکتی ہے۔

ب: جھاگ کے لیے ذمے دار کیمیائی عوامل: اس میں مصفّا کار (Detergent) اور گندے پانی کا اخراج شامل ہے۔ جھاگ بننے کے عمل کو بہت زیادہ مقدار میں صنعتی فضلات اور غیر مصفّا گندے پانی کو آبی ذخائر میں برسوں سے چھوڑنے پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ اجزا ایک زہریلا آمیزہ بنانے کے لیے باہم مربوط ہو جاتے ہیں، جسے کیمیکلس کا کاکٹیل کہا جاتا ہے۔ گھریلو مصفّا کار کا بہت بڑا حصہ نونیل فینائل ایتھوکسی لیٹ ہے، جو ماحول میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے، نتیجتاً نونیل فینائل بنتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ زہریلے، آب و ہوا کے اعتبار سے سب سے زیادہ خراب اور حیاتی اعتبار سے سب سے زیادہ ذخیرہ اندوز کیمیاؤں میں سے ایک کیمیا ہے۔

ج: جھاگ کے لیے ذمے دار حیاتیاتی عوامل: انسان کی پیدا کردہ گندگی اور متعدد انڈسٹریز کے خارج کردہ فضلات آبی ذخائر کو آلودہ کرنے کے لیے آلودہ کاروں کے اہم ذرائع ہیں۔ دیگر اہم ذرائع آبی ذخائر میں پائے جانے والے خرد نامیے ہیں، جو انفرادی طور پر اکٹھا ہونے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور گچھا (Flocs) نامی مختلف اجزا کا مجموعہ تشکیل دینے کے لیے گالا یا گچھے کی صورت میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ گالے یا گچھے خرد نامیوں کے زندہ اور مردہ خلیوں کے ساتھ ان کے میٹابولیک پروڈکٹس اور آبی ذخائر میں موجود نامیاتی مادّوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس گالے یا گچھے کو حیاتیاتی گالا یا گچھا بھی کہا جاتا ہے، جو متعدد خرد نامیوں مثلاً جرثومہ (Bacteria)، پھپھوند (Fungi) اور یک خلوی (Protozoa) سے مشکّل ہوتا ہے۔ جرثوموں میں خیطی جرثومے (Filamentous Bacteria) سب سے زیادہ حاوی جرثومے ہوتے ہیں۔ یہ لمبے دھاگے نما ڈوری کی طرح افزائش پاتے ہیں۔

بنگلور کی جھیلیں

بنگلور کی جھیلیں انسان کی پیدا کردہ بدترین آفات یعنی خطرناک جھاگ اور اس میں لگنے والی آگ سے دوچار ہیں۔ اس بتدریج بڑھتے اور شدید ہوتے ہوئے ماحولی بحران نے قومی اور بین الاقوامی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے جب آلودگی کی وجہ سے آبی ذخائر میں آگ لگی ہو۔ بنیادی طور سے آبی ذخائر مثلاً جھیلوں میں اس وقت آگ لگتی ہے، جب گندگی اور گندے پانی اور دیگر زہریلے آلودہ کار اس میں پھینکے جاتے ہیں۔ بارش کا موسم بڑے انتظار کا وقت ہوتا ہے اور ہندوستان میں برسات دراصل دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ دیہی علاقے کا منظر ہر طرف پانی اور ہریالی سے پُر ہوتا ہے، لیکن شہروں اور قصبوں میں بیشتر کار اور ریل سے سفر کرنے والے لوگ اس سے اتفاق نہیں کریں گے اور برسات کو ایک بدنما منظر کہیں گے۔

بلاندور اور وارتھر کی جھیلیں بظاہر بنگلور کے سب سے بڑے پانی کے ذخائر ہیں اور یہ دونوں جھیلیں پانی کو جمع کر کے محفوظ رکھنے کے اہم سرچشمے بھی ہیں۔ بلاندور جھیل بہت زیادہ آلودہ ہونے کی وجہ سے خبروں میں ہمیشہ سب سے زیادہ گرما گرم بحث کا موضوع بنی رہتی ہے۔ یہ جھیل فضلہ انصرام (Waste Management) اور آبی آلودگی کے ساتھ بنگلور شہر کی جد و جہد کی ایک علامت بن چکی ہے۔ وقتاً فوقتاً اٹھتی ہوئی جھاگ کی لہریں دیکھی جاتی ہیں، سڑکوں پر جھاگ پھیل جاتے ہے اور ہوائیں انھیں بہالے جاتی ہیں۔ نتیجتاً کاریں جھاگ سے ڈھک جاتی ہیں اور پڑوس کے علاقے میں بدبو پھیل جاتی ہے۔ بار بار جھاگ کے بننے اور پھیلنے کے عمل کو مقامی باشندے خوفناک بدبو سے موسوم کرتے ہیں۔ زہریلے کیمیکلس کی بہت زیادہ مقدار ان جھیلوں میں بہہ کر شامل ہونے کی وجہ سے جھاگ پیدا ہوتے ہیں۔ بارش کے دوران میں جب جھیل کے پانی کی سطح اٹھتی ہے تو ضرر رساں جھاگ جھیل کے چاروں طرف سڑکوں پر پھیل جاتے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے جھاگ کے بننے اور پھیلنے کی خبریں میڈیا میں گرما گرم بحث کا موضوع رہی ہیں اور یہ باتیں سامنے آتی رہی ہیں کہ کیسے بنگلور کی ان جھیلوں میں بنتے جھاگ سڑکوں پر پھیلتے ہیں اور لوگوں کو خوف زدہ کرتے ہیں نیز متعدد مسائل سے دوچار کرتے ہیں۔ بلاندور جھیل کی نواحی سڑکوں پر جھاگ کے مرغولوں میں ڈھکی کاریں اوجھل ہو جاتی ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ جھیلوں میں گندگی اور گندے پانی اور صنعتی فضلات کے اخراج سے زہریلے کیمیکلس کا آمیزہ پیدا ہوتا ہے، جس سے خطرناک جھاگ تشکیل پاتے ہیں۔ جہاں پر آبی ذخائر دستیاب ہوتے ہیں، ان علاقوں میں موسلادھار بارش کے بعد عموماً جھاگ بننے کے عمل میں اضافہ رونما ہوتا ہے۔

حیدرآباد کی جھیلیں

حیدرآباد میں واقع چار سو پچاس سالہ قدیم 'حسین ساگر' جھیل اتنی زیادہ آلودہ ہوگئی ہے کہ بدبودار جھاگ چھوڑنے لگی ہے۔ حیدرآباد کی یہ تاریخی جھیل کسی زمانے میں یہاں کے لاکھوں لوگوں کی پینے کے پانی کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی، جو اب جھاگ چھوڑنے لگی ہے۔ اس سے اس جھیل میں بدتر ہوتی ہوئی آلودگی کی سطحوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس جھیل کے دہانے کے قریب سفید بُراق رنگ کے جھاگ نکل رہے ہیں۔

ماہرینِ ماحولیات حیدرآباد کی متعدد جھیلوں میں اس

طرح کے ناگفتہ بہ جھاگ چھوڑنے کے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ برسات کے موسم میں موسلا دھار بارش کے بعد بشمول حسین ساگران جھیلوں سے جھاگ نما برف رونما ہوتے ہیں۔ بعدۂ موسم سرما میں بدبودار اور خطرناک جھاگ بنتے ہیں۔ سائنسی محققین کے مطابق یہ جھیل غیر مثالی طور سے ایک حیاتیاتی لیبارٹری میں بدل گئی ہے۔ سائنسی محققین نے ان نقصان دہ بیکٹیریا یعنی خیطی بیکٹیریا کی ان جھیلوں میں موجودگی کا پتہ لگایا ہے، جو بہت سی اقسام کے جرثوموں کے خلاف عمل کرنے والے اینٹی بایوٹکس کے تئیں مزاحم ہوتے ہیں۔ تیسری نسل کے اینٹی بایوٹکس بھی ان خطرناک بیکٹیریا کی مخالفانہ سرگرمیوں کو ظاہر کرنے میں ناکام ہوئی ہیں۔

بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر (BARC) کی ایک تحقیقی ٹیم نے اس جھیل کے پانی کے معیار پر غائر اور جامع و مانع تحقیق کی۔ اس جھیل کی آلودگی کی اعلیٰ سطح کے سبب درحقیقت جرثوموی آبادی میں تبدیلی ہوئی اور اضافہ ہوا، جس سے محققین کو حیرت ہوئی۔ ان مبدل (Mutants) نے اینٹی بایوٹک کے تئیں مزاحمت ظاہر کی۔

ماحولیاتی محققین اور ماہرین کے مطابق برسات کے موسم میں ایک آبی ذخیرے میں جھاگ کا بننا قدرتی مظہر ہے۔ چونکہ حسین ساگر میں زراعتی فضلات، ادویاتی تچھٹ، بلدیاتی گندگی اور گندے پانی اور صنعتی فضلات جیسے متعدد کیمیائی ماڈے پھینکے جا رہے ہیں، اس لیے یہ جھیل بہت ہی زیادہ آلودہ ہے۔ ایک دوسرے سائنسی تحقیقی مطالعے سے یہ پتہ چلا ہے کہ جھیلوں میں جھاگ بننے کے عمل کا ایک مخصوص جرثوموی نسل یا ذات محرک ہوتا ہے۔

نکلتے جھاگ کے نقصانات:

1 جھاگ بہت زیادہ زہریلے ہوتے ہیں اور سائنس دانوں نے اس کی سرطانوی نوعیت (Carcinogenic Nature) کو ثابت کیا ہے۔

2 جھاگ جلد پر خراش و سوزش پیدا کرتے ہیں، تنفسی مسائل پیدا کرتے ہیں اور یہ ناقابل برداشت بدبودار ہوتے ہیں۔

3 بارش کی وجہ سے جھاگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سڑکوں پر پھیل جاتے ہیں۔ ریل گاڑی، بس، کار، موٹر سائیکل وغیرہ کے مسافرین کے لیے بصارت (Visibility) کے مسائل پیدا کرتے ہیں، آنکھوں میں کھجلی پیدا کرتے ہیں اور نقل و حمل میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

4 جھاگ صحت عامہ کو منفی طریقے سے متاثر کرتے ہیں۔ جراثیم زدہ پانی کے سبب وبا پھیلنے کا امکان پیدا کرتے ہیں۔

5 جھاگ خراب ماحولیاتی حالات، صفائی و ستھرائی اور حفظان صحت سے متعلق حالات کے سبب کنویں کے پانی کی آلودگی ایک دوسرے نقصان دہ اثر کا سبب بنتے ہیں۔

بلائے جان جھاگ کو قابو میں رکھنے کے اقدامات:

جھیل بنی نوع انسان کے لیے قدرت کا ایک تحفہ ہے۔ ان آبی ذخائر کی بحالی اور ان کا تحفظ وقت کی سخت ضرورت ہے۔ جھاگ چھوڑتے آبی ذخائر پورے ہندوستان میں بار بار تشویش کا سبب بنتے ہیں۔ ماحول مخالف نتائج اور عوامی صحت کو لاحق خطرات کی روک تھام کے لیے ہمیں 'جھیل بچاؤ' اور 'آبی آلودگی روکو' جیسے نعروں کی پیروی کرنی ہوگی۔ زہریلے فضلات کو جھیلوں میں پھینکنے سے روکا جانا چاہیے۔ پھیلتے جھاگ کے زہریلے اثرات سے بحسن و خوبی نبرد آزما ہونے کے لیے صنعتی اداروں اور عوام پر سخت سے سخت قانون نافذ کیا جانا چاہیے۔

بلدیاتی افسران کے ذریعے ایسی جھیلوں کی جانچ پڑتال ہونی چاہیے، جن میں متنوع قسم کے فضلات پھینکے جا رہے ہیں اور ان کی آلودگی کی سطح کی دیکھ ریکھ کے لیے مسلسل اور باقاعدہ نظم ہونا چاہیے۔ جھیلوں میں بلا امتیاز گھریلو گندگی اور صنعتی فضلات کا اخراج، جو جھاگ بننے کا سبب ہے، مکمل طور سے روکا جانا چاہیے۔ مصفا کار (Detergents) کے بلا امتیاز استعمال پر بالخصوص فوسفیٹ سے پُر مصفا کاروں پر پابندی لگائی جانی چاہیے اور کپڑے دھونے کے ماحول دوست مصفا کاروں کے استعمال کی گھروں کے لیے اور کپڑے دھونے کے لیے حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ جھاگ آفت سے بچنے کی راہ نکالنے کے لیے آبی ذخائر میں گندگی اور گندے پانی کے اخراج کی مناہی کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ بھاری دھاتوں سے پر یہ گندگی اور گندے پانی آب اور مٹی میں رس کر پہنچ جاتے ہیں، جس سے بڑے پیمانے پر مٹی اور نباتات کا معیار منفی طریقے سے متاثر ہوتا ہے۔

جھاگ کی وبا سے نبرد آزما ہونے کے طریق کار

1 جھاگ کو قابو میں رکھنے کے لیے جسمانی طریق کار بیزار کن، وقت اور محنت طلب ہیں نیز مشینری مدد کے متقاضی ہیں۔ یہ مہنگی مشینوں کے تقاضوں کے سبب قابل عمل نہیں ہیں۔ کیمیائی ماڈوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کے ذیلی پیداوار ماحولی نظام کے دیگر سودمند عمل کو منفی طریقے سے متاثر کر سکتے ہیں۔ جھاگ کے مظہر کو قابو میں رکھنے کے لیے جسمانی مدد کے ساتھ اس طریق کار کو استعمال کرنے میں زیادہ لاگت سب سے بڑا نقصان ہے۔

2 کیمیائی طریق کار میں متعدد قسم کے کیمکل فارمولیشنس شامل ہوتے ہیں، جو جھاگ کے بننے کے عمل کو یا تو روکنے میں یا ان کے بننے کے بعد انھیں تباہ کرنے میں موثر ہو سکتے ہیں۔ جھاگ کو تتر بتر کرنے والے کیمیائی ماڈے مذکورہ بالا رول میں سے کوئی بھی رول ادا کر سکتے ہیں۔ آبی ذخائر میں جھاگ بننے کے عمل کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی موثر آفاقی حکمت عملی نہیں ہے۔ مخصوص اور وقیع اقدامات کرنے کے لیے سب سے پہلے جھاگ بننے کے عمل کے پس پشت کارفرما وجوہ کو سمجھنے، جھاگ بننے کے عمل میں شامل نامیوں اور ان کے عمل کی صورت حال کا مطالعہ کرنے بالآخر جھاگ کو ختم کرنے کے لیے حکمت عملیاں تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

3 خرد حیاتیاتی طریق کار میں بایو کنٹرول حکمت عملیاں شامل ہیں۔ معروف سائنس دانوں اور ماہرین خرد حیاتیات نے ان حکمت عملیوں کے استعمال کو تجویز کیا ہے۔ ان میں وائرس بالخصوص وہ حملہ آور بیکٹیریا کا استعمال شامل ہے، جنہیں بیکٹیریوفے جز (Bacteriophages) کہا جاتا ہے۔ مخصوص خلیات تحلیل کرنے والے لیٹک فے جز (lyticphages) کا استعمال ایک موثر کنٹرول حکمت عملی ہے، جو دیگر بیکٹیریا کو چھوڑتے ہوئے صرف جھاگ بنانے والے ہی بیکٹیریا کو متاثر کرتی ہے۔ ان بیکٹیریو فے جز کے ذریعے جھاگ بننے کے عمل میں تخفیف کے لیے مقررہ ضابطۂ عمل پر مفصل تحقیق اب بھی جاری ہے۔

جھاگ بننے کے عمل کو کنٹرول کرنے کے لیے طبعیاتی اور کیمیائی طریق کار روقتی ہیں، چوں کہ جھاگ کا کنٹرول اور اس کی روک تھام بار خاطر ہو رہے ہیں۔ اسی لیے نئے طریق کار کے لیے تحقیق جاری ہے۔

اس طرح یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دریاؤں، جھیلوں اور آبی ذخیروں میں بنتی ہوئی ناپسندیدہ مہلک جھاگ کو قابو میں رکھنے کے لیے طبعیاتی، کیمیائی اور حیاتیاتی تین طریق کاروں میں سے حیاتیاتی طریق کار نہ صرف ماحول دوست ہے بلکہ یہ مستقبل میں کامیابی کی توقعات سے پُر ہے۔ مختلف عوامل کے تجزیے سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ قابل فہم اور قابل عمل طریق کار حیاتیاتی طریق کار ہوگا، جس کے لیے جامع و مانع ریویوز اور ایکس پری من ٹیشنس (Experimentation) کرنے ہوں گے۔ اس طریق کار کو زہریلی جھاگ بنانے والے خیطی بیکٹیریا سے بحسن خوبی نبرد آزما ہونے کے لیے لیبارٹری سے آگے بڑے پیمانے پر استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

■

Dr.Sadaf Kalam
Associate Professor
Department of Biochemistry
Coordinator, DBT Star College Scheme
St. Ann's College for Women, Mehdipatnam.
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Cell No: 09502403852

ابو اسامہ

غیر حکومتی تنظیموں کی بدلتی جہات

پس منظر اور پیش منظر

ساختیاتی غربت اور سماجی و معاشی عدم مساوات کی وجہ سے سماجی ناانصافی، تشدد، تعصب، دقیانوسیت اور حقوق کی پامالی مشاہدہ و عمل میں آتی ہے۔ ہر سماجی مسئلہ پورے معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے مگر کچھ طبقات پر غربت اور سماجی و معاشی عدم مساوات کی وجہ سے دوہری مار پڑتی ہے۔ ان میں غربا، خواتین، بچے، بزرگ، معذورین، ہم جنس پسند، دلت، قبائلی افراد اور اقلیتیں سر فہرست ہیں۔

گزشتہ دو سو سالوں میں غیر حکومتی تنظیموں کے فلسفے، کام کے طریقے اور فلاحی عمل کی حصے داری میں تبدیلی آئی ہے۔ یہ تنظیمیں تاریخی نقطۂ نظر سے جدید معاشرے کی پیداوار ہیں (سین 1993، فاؤلر 1997، لیوس 2001)۔ آج بے شمار تنظیمیں ہیں جو عوامی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے امر پر کاربند ہیں۔ ان میں خواندگی اور تعلیم، صحت، روزگار، ماحولیات، دیہی اور شہری ترقی، غریبی دور کرنے کے پروگرام، صاف پانی کے انتظام اور ذخیرہ اندوزی کی تدابیر، مائیکرو فائنانس کے نظم و نسق اور عوامی بیداری کی تنظیمیں قابل ذکر ہیں۔ ساتھ ہی اقلیتوں، دلتوں اور قبائل کے معیار زندگی میں بہتری، صنفی مساوات، تشدد کے خاتمے، نوجوانوں کے لیے پروگرام اور پسماندہ طبقات کو روزگار مہیا کرنے والی تنظیمیں بھی ہیں۔ محروم طبقات کے لیے خصوصی پروگرام، مظلوم افراد کے حقوق کی بازیابی اور حکومتوں کو جواب دہ بنانے والی انصاف پر مبنی تنظیموں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ بہت سی تنظیمیں ضرورت مندوں کو روزگار اور بنیادی صحت عامہ سے مربوط کرتی ہیں، تعلیم تک رسائی کے مواقع فراہم کرتی ہیں، ان کی زندگی میں بہتری لانے والے فروغ استعداد کے پروگرام منعقد کرتی ہیں اور حکومت و پرائیویٹ سیکٹر کی کسی سماجی مہم، فلاحی اسکیم اور پروجیکٹ کے نفاذ میں خصوصی مہارت رکھتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی تعداد اور نمایاں سماجی سرگرمیوں کے باوجود اسکالرز اور پیشہ وروں نے تنظیموں پر قدغن لگانے والے ساختیاتی محرکات کو نشان زد کیا ہے۔ ایڈورڈس (2003) نے بدلتی ہوئی ڈیولپمنٹ (ترقی) کی بحث کے ضمن میں غیر حکومتی تنظیموں کو درپیش چیلنجز پر خاصا ادب تحریر کیا ہے۔ انھوں نے معاشی عالم کاری اور بیرونی مالی امداد کے تناظر میں تنظیموں کی محدود سماجی معنویت اور ان کے دیرپا اثرات پر بے حد ناقدانہ نوعیت کے سوالات کھڑے کیے ہیں۔

حالانکہ اس کے برعکس بہت سے اسکالروں نے تنظیموں کی قابل قدر خدمات کو سراہا ہے۔

کورٹن (1987) نے تنظیموں کی بدلتی ہوئی حکمت عملی اور طریقہ کار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق غیر حکومتی تنظیمیں تین مرحلوں سے گزری ہیں۔ پہلے مرحلے کی تنظیموں کا محور ریلیف اور ویلفیئر تھا جو لوگوں کی پریشانی اور مصیبتوں کو دور کرنے میں متحرک تھیں۔ عالمی جنگ کے دوران پیدا ہونے والی ہنگامی صورت حال کے پیش نظر متعدد تنظیمیں وجود میں آئیں۔ سیو دی چلڈرن (انگلینڈ) اور کیئر (امریکہ) جیسی تنظیموں کا جنم اسی پس منظر میں ہوا۔ دوسرے دور کی تنظیموں نے مقامی سطح پر کمیونٹی میں لوگوں کی ضروریات زندگی سے جڑی معاشی و سماجی سرگرمیوں پر توجہ دی۔ انھوں نے مقامی وسائل و ذرائع کے استعمال کا اور مقامی لوگوں کی بااختیاری کا ذمہ اٹھایا۔ تیسرے مرحلے میں پہنچ کر تنظیموں میں تبدیلی آئی ہے۔ دائرہ کار میں اضافے کے ساتھ ساتھ حکمت عملی میں پائیداری ان کا مطمح نظر ہے۔ اسی لیے وہ حکومتی اداروں کے اشتراک سے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ معیاری زندگی کو فروغ دینے والے پروگرام تیار کرتی ہیں۔ اسی دوران فورڈ فاؤنڈیشن اور ایکشن ایڈ جیسی تنظیموں کی متحرک لیڈرشپ ملکوں کے سماجی قوانین اور پالیسیوں پر اثر انداز ہوئیں۔ کورٹن کا ماننا ہے کہ سماج میں معاشی غیر برابری کی بڑھتی ہوئی خلیج اور بازار کی مفاد پرست معیشت نے تنظیموں کو چیلنج دیا کہ وہ پائیدار حکمت عملی اپنائیں۔ ان میں محدود وسائل کے باوجود یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ محروم طبقات کی زندگی میں مثبت بدلاؤ لا سکیں۔ سین (1993) نے ہندوستانی تناظر میں کام اور سرگرمیوں کے حوالے سے غیر حکومتی تنظیموں کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی فلاحی (ویلفیئر) کی تنظیمیں ہیں۔ ایسی تنظیموں کا یقین کار خیر، کفالت اور معاونت میں ہے۔ وہ قدرتی آفات و مصائب، قحط سالی، سیلاب، زلزلے یا انسان کے ہاتھوں ہوئی تباہی میں فوری مدد پہنچانے میں شامل رہتی ہیں۔ ان کے فلسفے میں فلاح اور ویلفیئر کا جذبہ پنہاں ہے۔ دوسری جدید کاری (ماڈرنائزیشن) پر مبنی تنظیمیں ہیں جن پر انسانی ترقی اور ڈیولپمنٹ کا فلسفہ غالب ہے۔ یہ تنظیمیں غریبی کو ختم کرنے اور سماجی و معاشی انصاف کو یقینی بناتی ہیں۔ تیسری بااختیار بنانے والی

امپاورمنٹ کی تنظیمیں ہیں جو پسماندہ اور محروم طبقات کی زندگی میں امید اور مواقع پیدا کرتی ہیں۔ وہ پسماندگی کو ایک سیاسی پروسیس مانتی ہیں اور سماجی تبدیلی کے لیے ضرورت مند طبقات کو باخبر کرتی ہیں۔ سین کی یہ خانہ بندی ایک طرف کام کے اختصاص کا پتہ دیتی ہے اور دوسری طرف تنظیموں کے تاریخی ارتقا کو بھی بتاتی ہے۔ سین نے ہندوستان میں غیر حکومتی تنظیموں کے سیاسی پہلو اور ان کی سیاسی سرگرمیوں پر بحث کرتے ہوئے مملکت اور ڈیولپمنٹ سیکٹر کے جدلیاتی رشتوں کی دبیز تہوں کو اجاگر کیا ہے۔

حکومتی (پہلے) اور پرائیویٹ (دوسرے) سیکٹر کے بعد غیر حکومتی تنظیموں کو مختلف اصطلاحات جیسے تیسرے سیکٹر، ڈیولپمنٹ سیکٹر اور والنٹری سیکٹر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح غیر حکومتی تنظیموں کے تعلق سے بہت سارے نام مستعمل ہیں۔ ہر مروجہ نام کا ایک تاریخی تناظر ہے۔ والنٹری آرگنائزیشن کا استعمال انگلینڈ میں زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں عیسائی اقدار کی وجہ سے رضاکارانہ امداد کی لمبی تاریخ رہی ہے۔ انیسویں صدی میں چیریٹی آرگنائزیشن سوسائٹیز میں ضرورت مند افراد کی مدد کا رجحان غالب تھا۔ امریکہ میں نان پرافٹ آرگنائزیشن کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ وہاں بازار اور منافع بخش اداروں کی بہتات ہے اس لیے وہ تنظیمیں جو رفاہی اور انسان دوست سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہیں، انھیں پرائیویٹ اور منافع بخش اداروں سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ وہ ترقی پذیر ممالک جو اقوام متحدہ سے قریب رہے، وہاں ایسی تنظیموں کو غیر حکومتی تنظیم (نان گورمنٹل آرگنائزیشن) کہا جاتا ہے۔ حالیہ سالوں میں ہندوستان میں نان گورمنٹل آرگنائزیشن، والنٹری اسوسی ایشن، والنٹری آرگنائزیشن اور نان پرافٹ آرگنائزیشن کی اصطلاحات کو استعمال میں لانے کا رجحان بڑھا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی موضوع پر کام کرنے والی کوئی تنظیم مذکورہ تینوں ملکوں میں تین مختلف ناموں سے جانی جاتی ہو۔ مثلاً بے گھر افراد کے ساتھ کام کرنے والی کسی تنظیم کو انگلینڈ میں والنٹری آرگنائزیشن، امریکہ میں نان پرافٹ آرگنائزیشن اور ہندوستان میں نان گورمنٹل آرگنائزیشن کے نام سے موسوم کیا جانا تعجب کی بات نہیں ہے (لیوس، 2001)۔

نجم (1996) نے غیر حکومتی تنظیموں کے لگ بھگ 48 نام درج کیے ہیں۔ پرائیویٹ والنٹری آرگنائزیشن، لوکل آرگنائزیشن، گراس روٹ آرگنائزیشن، کمیونٹی بیسڈ آرگنائزیشن، سیلف ہیلپ آرگنائزیشن، پیپلز آرگنائزیشن، اس قبیل کی چند مثالیں ہیں۔ یہ فہرست بھی اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے۔ سین (1993) نے نان گورمنٹل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (اسے ڈیوڈلیوس نے اپنی تحریروں میں بہت استعمال کیا ہے)، والنٹری اسوسی ایشن، والنٹری آرگنائزیشن، والنٹری ایجنسی، ویلفیئر آرگنائزیشن اور فلنتھراپک آرگنائزیشن جیسی اصطلاحات رقم کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ مستعمل اصطلاح والنٹری ایجنسی ہے (جب کہ 2007 میں آنے والی قومی پالیسی میں والنٹری آرگنائزیشن لکھا ہوا ہے)۔ ٹنڈن (2005) نے اپنی تحریروں میں نان پرافٹ آرگنائزیشن کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں دوسرے ملکوں کے بالمقابل چیریٹی سیکٹر، انڈیپنڈنٹ سیکٹر وغیرہ کا کم استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں ڈیولپمنٹ سیکٹر کی اصطلاح کو ترجیح دی ہے۔

ساختیاتی غربت اور سماجی و معاشی عدم مساوات کی وجہ سے سماجی ناانصافی، تشدد، تعصب، دقیانوسیت اور حقوق کی پامالی مشاہدہ و عمل میں آتی ہے۔ ہر سماجی مسئلہ پورے معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے مگر کچھ طبقات پر غربت اور سماجی و معاشی عدم مساوات کی وجہ سے دوہری مار پڑتی ہے۔ ان میں غربا، خواتین، بچے، بزرگ، معذورین، ہم جنس پسند، دلت، قبائلی افراد اور اقلیتیں سر فہرست ہیں۔ اسی کو دھیان میں رکھتے ہوئے فاؤلر (1997) نے کہا کہ جدید انسانی معاشرے میں غیر برابری ایسی دودھاری تلوار ہے جو ایک طرف غیر حکومتی تنظیموں کے وجود میں آنے اور ان کی تعداد میں اضافے کا سبب ہے تو وہیں بہت ساری تنظیمیں اور ادارے غریبی اور غیر برابری کا ناقدانہ احتساب کرنے اور اسے جڑ سے ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ لوگوں کو سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی طور پر بااختیار بنانے اور انھیں ان کی زندگی سے متعلق فیصلوں میں خود مختار بنانے کا عمل پیچیدہ ہے اور لمبے وقت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن اسی حکمت عملی سے مثبت نتائج کی امید کی جاسکتی ہے۔ این جی او مینجمنٹ کا پرچہ پڑھاتے وقت کم و بیش ایسے یکساں نکات نکل کر آئے جن کا مشاہدہ طلبا نے فیلڈ ورک کے دوران کیا۔ خود تنظیموں کے نمائندوں نے بھی ڈیولپمنٹ سیکٹر کے محدود کردار پر فکر جتائی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی زد میں ہر معاشی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی ادارے میں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ شہریوں کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں فلاحی ریاست کا دائرہ سمٹ گیا۔ غیر حکومتی تنظیموں پر بھی اس نظام کے اثرات مرتب ہوئے۔ تنظیموں نے ضرورت مندوں کو بنیادی خدمات دے کر مملکت کے ساتھ اشتراک کا ماڈل تیار کیا۔ جب کہ ان کے اس متبادل کردار پر محققین نے نقد کیا ہے۔ بہت سی تنظیمیں جمہوری قدروں کو فروغ دینے اور مملکت اور شہریوں کے رشتے کو مضبوط کرنے میں موزوں کردار نبھاتی ہیں۔ اس پورے دور میں پالیسی سازوں نے ڈیولپمنٹ پر خصوصی توجہ دی۔ اقوام متحدہ اور دیگر بین حکومتی تنظیموں (انٹر گورمنٹل آرگنائزیشنز) کے اعلامیے اور منشورات میں خوشحالی اور ڈیولپمنٹ ایک بنیادی کڑی ہے جس کے بغیر جدید دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ اقوام متحدہ اور بین حکومتی تنظیموں کی ڈیولپمنٹ کی سیاست اور اس کی پولیٹکل اکانومی سے آنکھیں نہیں موندی جاسکتیں۔ مئی 1988 میں انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے نام ڈیویسن بودو نے انف از انف کے عنوان سے تیس صفحات پر مشتمل اپنا استعفیٰ نامہ پیش کیا۔ اس میں لاطینی امریکہ اور کیریبیائی و افریقی ممالک میں آئی ایم ایف کے سامراجی اور سرمایہ دارانہ ایجنڈے کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ منافع بخش، حکومتی اور غیر حکومتی تنظیموں کی نظر میں ڈیولپمنٹ کو مرکزی مقام ملنے کا سہرا اقوام متحدہ کے اقدامات اور کاوشوں کے سر جاتا ہے۔

کئی ملکوں میں عوام کی ترقی اور فلاح میں غیر حکومتی تنظیموں کو اہم اسٹیک ہولڈر اور معاون مانا گیا ہے۔ ہندوستان میں ڈیولپمنٹ سیکٹر اور غیر حکومتی تنظیموں کو مناسب قومی پالیسی کے لیے لمبے انتظار سے گزرنا پڑا۔ ڈیولپمنٹ سیکٹر کی مرکزی توجہ عوامی خدمات کی فراہمی اور پسماندہ طبقات کی عمومی ترقی پر ہے۔ اس فلسفے کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف قسم کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ انھیں اس عمل میں کبھی مالی، کبھی قانونی تو کبھی تعاون و اشتراک نہ ملنے کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی وسیع خدمات کو تسلیم نہ کیے جانے اور ان کے تئیں سماج میں پنپنے والے منفی احساسات نے غیر حکومتی تنظیموں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ماضی میں ان کے موثر کردار اور لیاقت پر سوالات اٹھتے رہے ہیں۔ سوسائٹی فار پارٹیسی پیٹری ریسرچ ان ایشیا (PRIA) اور جانس ہاپکنس یونیورسٹی کے سینٹر فار سول سوسائٹی اسٹڈیز نے سال 2000 میں کی گئی اپنی ایک مشترکہ تحقیق میں پایا کہ بظاہر مربوط و مبسوط نظر آنے والی ہندوستانی غیر حکومتی

تنظیمیں اصل زندگی میں چہار طرفہ چیلنجز کا سامنا کرتی ہیں۔ وہ کم اسٹاف، محدود وسائل، حکومتی تعاون کی کمی، اندرونی طور پر کمزور مینجمنٹ اور عدم اندراج کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اس میں کہا گیا کہ ڈیولپمنٹ سیکٹر میں بڑے پیمانے پر اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس تحقیق نے بیرونی مالی امداد بہم پہنچانے والی تنظیموں اور ایجنسیوں، حکومتی اداروں اور سنجیدہ غیر حکومتی تنظیموں کو ڈیولپمنٹ سیکٹر کے تئیں سوچنے پر آمادہ کیا۔ یہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر ڈیولپمنٹ سیکٹر کے تعلق سے کی جانے والی اپنی نوعیت کی پہلی تحقیق تھی۔

2003 میں حکومت ہند نے قومی پالیسی کے ڈرافٹ کو تنظیموں کے پاس بھیج کر ان سے صلاح ومشورہ مانگا۔ 2007 میں قومی پالیسی برائے والنٹری سیکٹر کو پلاننگ کمیشن کے والنٹری ایکشن سیل نے جاری کیا۔ پالیسی کے چار مقاصد بیان کیے گئے جہاں دو میں تنظیموں کے لیے اعتماد و بھروسہ اور دو میں ان کی کمزوریاں بتائی گئیں۔ تمہید میں کہا گیا کہ یہ پالیسی ایک آزاد، موثر اور تخلیقی والنٹری سیکٹر کی بااختیاری کے لیے کمربستہ ہے۔ یہ اعتراف کیا گیا کہ اس سیکٹر نے غربت، امتیازی سلوک، ناانصافی، محرومیت اور سماجی اخراجیت کو دور کرنے میں سماجی بیداری، خدمات کی فراہمی، تحقیق اور مشاورت کی حکمت عملی اپنائی۔ پالیسی کے مقاصد میں غیر حکومتی تنظیموں کو فروغ دینا اور ان کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا شامل ہے۔ ساتھ ہی ان سے یہ امید کی گئی کہ وہ اپنے کمزور مینجمنٹ میں درستگی لائیں اور وسائل وذرائع کا صحیح استعمال کریں تاکہ انھیں مالیات سے متعلق کسی قسم کی دقت نہ پیش آئے۔ ان سے حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اپیل کی گئی۔ پالیسی کے اصل حصے میں تین وعدوں کا ذکر ہے کہ (1) والنٹری سیکٹر کے لیے سازگار فضا قائم کی جائے گی، (2) قومی ترقی کے پروجیکٹ میں پارٹنرشپ ہوگی اور (3) والنٹری سیکٹر کے ساتھ منفرد قسم کی پارٹنرشپ سے دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت ملے گی۔ یہ یقین دلایا گیا کہ سیکٹر کی خودمختاری اور تخلیقی سرگرمیوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں کھڑی کی جائے گی۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ 2006 کے فارن کانٹریبیوشن ریگولیشن بل کو مزید لچیلا بنانے، پرائیویٹ سیکٹر کو فلاحی کاموں کے لیے آمادہ کرنے اور تنظیموں کی ٹریننگ پر زور ہوگا۔ قومی ترقی میں پارٹنرشپ کے لائحہ عمل کے تحت پنچایتی راج کے اداروں، تعلیمی اداروں، بلدیہ اور پرائیویٹ سیکٹر کی تنظیموں کے ساتھ غیر حکومتی تنظیموں کو مربوط کرنے کی بات کی گئی۔ مملکت کی جانب سے ڈیولپمنٹ سیکٹر کے سامنے اس طرز کی بہت ساری تجاویز اور معاہدات کی پیشکش سامنے آئی۔ تنظیموں کے حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ قومی پالیسی مواخذہ، جواب دہی اور اشتراک کے تین اصولوں سے عبارت ہے۔ ہندوستان میں سال 2000 میں سوسائٹی فار پارٹیسپیٹری ریسرچ ان ایشیا کے تحقیقی سروے، 2007 کی قومی پالیسی برائے والنٹری سیکٹر اور 2010 کے فارن کانٹریبیوشن ریگولیشن ایکٹ کے بیچ میں گہرا ربط ہے۔

ترقی کے کسی بھی سماجی امر کو انجام دینے میں وسائل وذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ عموماً غیر حکومتی تنظیمیں اپنے کام کی لاگت کو مختلف ذرائع سے حاصل کرتی ہیں۔ بعض دفعہ وہ ایسے کام کرتی ہیں جن میں انھیں کسی کی مالیاتی مدد نہ لینی پڑے۔ بہت سی ایسی تنظیمیں ہیں جو عوامی چندے پر چلتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں واقع تقریباً ہر چھوٹی بڑی غیر حکومتی تنظیم کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اسے کسی نہ کسی بین حکومتی یا بین الاقوامی تنظیم کا تکنیکی اور مالی تعاون حاصل ہو۔ ہندوستان سے باہر ایسے کئی حکومتی شعبہ جات اور تنظیمیں ہیں جو یہاں کی تنظیموں کے ساتھ ساتھ قومی وصوبائی حکومتوں کو مالی اور دیگر تنظیمی نوعیت کی مدد فراہم کرتی ہیں۔ فورڈ فاؤنڈیشن، ایکشن ایڈ، آغا خان فاؤنڈیشن، دی ایشین فاؤنڈیشن، ایشین ڈیولپمنٹ بینک، امریکن انڈیا فاؤنڈیشن، پلان انٹرنیشنل انڈیا، آکسفام، کیئر، راک فلر فاؤنڈیشن، یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ، سویڈش انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ کوآپریشن اور یو کے ڈپارٹمنٹ فار انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ اس کی چند مثالیں ہیں۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ اور اس کی ذیلی ایجنسیوں کو اس قانون کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا ہے۔ ملک میں ایمرجنسی سے پہلے غیر ملکوں سے ملنے والی مدد کے لیے کسی قسم کا قانون نہیں تھا جو بیرونی امداد کی آمدورفت پر نظر رکھتی۔ تنظیمیں نسبتاً ایسی سرگرمیوں کے لیے آزاد تھیں۔ لیکن سال 1976 میں فارن کانٹریبیوشن (ریگولیشن) ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے تحت ہر وہ تنظیم جو بیرون ملک سے فنڈ حاصل کرنا چاہتی ہے، اسے وزارت برائے امور داخلہ سے لائسنس یافتہ ہونا لازمی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ فنڈ کے ذرائع کی معلومات رکھی جائیں اور حاصل کیے گئے فنڈ کے 'صحیح استعمال' کے لیے تنظیموں کو پابند کیا جائے۔ جس مد میں فنڈ حاصل کیا گیا ہے اسے اسی مد میں خرچ کرنا، علاحدہ بینک اکاؤنٹ، ضروری کاغذات تیار کرنا اور سالانہ ریٹرن (کتنا فنڈ حاصل کیا گیا، کس طرح اور کس مقصد کے تحت فنڈ حاصل کیا گیا اور کیسے خرچ کیا گیا) درج کرنا، اس قانون کی لازمی شرائط ہیں۔ کسی بین الاقوامی تنظیم، بیرونی ملک کی کمپنی، حکومتی ادارے، فنڈنگ ایجنسی، فاؤنڈیشن یا سوسائٹی کی طرف سے دیے گئے پیسے، سامان، سیکورٹی، مشین اور تحفے کے سامان کو بیرونی مالی امداد کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ اس قانون کی دو کلیدی اصطلاحات بیرونی ذرائع (فارن سورس) اور بیرونی امداد (فارن کانٹریبیوشن) ہیں۔ امداد کی اہلیت وشرائط کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا کہ کم سے کم تین سال پرانی تنظیمیں بیرونی امداد کے لیے سرٹیفکیٹ حاصل کرسکتی ہیں۔ جب کہ کوئی تنظیم اس کے بغیر بھی وزارت داخلہ سے پیشگی اجازت لے کر بیرونی فنڈ حاصل کرسکتی ہے۔

اس قانون میں بڑی تبدیلی 2010 میں آئی اور ہر پانچ سال میں لائسنس کی تجدید لازمی قرار دی گئی اور قانون کی کئی دفعات کا اضافہ ہوا۔ 2020 میں ایک ترمیم شدہ قانون کو پورے ملک میں نافذ کیا گیا ہے۔ اس بار ایکٹ کے بنیادی ڈھانچے میں کئی بڑی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ قانون کے سیکشن 3 میں کسی پبلک سرونٹ کو بیرونی امداد لینے کی ممانعت کردی گئی ہے حالاں کہ یہ قید پہلے حکومتی افسران کے لیے تھی۔ جو لوگ بیرونی امداد نہیں لے سکتے ہیں ان میں سیاسی لیڈران، سیاسی جماعتیں، جج صاحبان، اخبار اور نیوز چینل کے مالکان، کارٹونسٹ اور صحافی قابل ذکر ہیں مگر نئے قانون کی رو سے اس تعداد میں مزید اضافہ کردیا گیا ہے۔ سیکشن 17 کے تحت باہر سے آنے والا ہر فنڈ سب سے پہلے نئی دہلی میں واقع اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں جمع ہوگا، جہاں سے فنڈ کو متعلقہ تنظیم کے اکاؤنٹ میں منتقل کیا جائے گا۔ سیکشن 7 کے مطابق کوئی لائسنس یافتہ تنظیم اپنی جیسی کسی دوسری تنظیم کے ساتھ کسی بھی قسم کا مالیاتی لین دین نہیں کرسکتی۔ سیکشن 8 میں یہ گرہ لگائی گئی ہے کہ اب تنظیم کے اندر بیس فیصدی سے زیادہ انتظامی امور (بشمول تنخواہ اور مشاورتی اعزازیہ) میں خرچ نہیں کیا جاسکتا، پہلے اس کا دائرہ پچاس فیصدی تک تھا۔ سیکشن 13 میں ترمیم شدہ قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں جرمانے کی مدت 180 دن سے بڑھ کر 360 دن ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام شرائط صرف اسی فنڈ سے تعلق رکھتی ہیں جو بطور امداد بیرون ملک سے لیے گئے ہیں۔

■

Abu Osama
Asst. Prof., Dept of Social Work
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 50032 (Telangana)
Mob.:9718925457

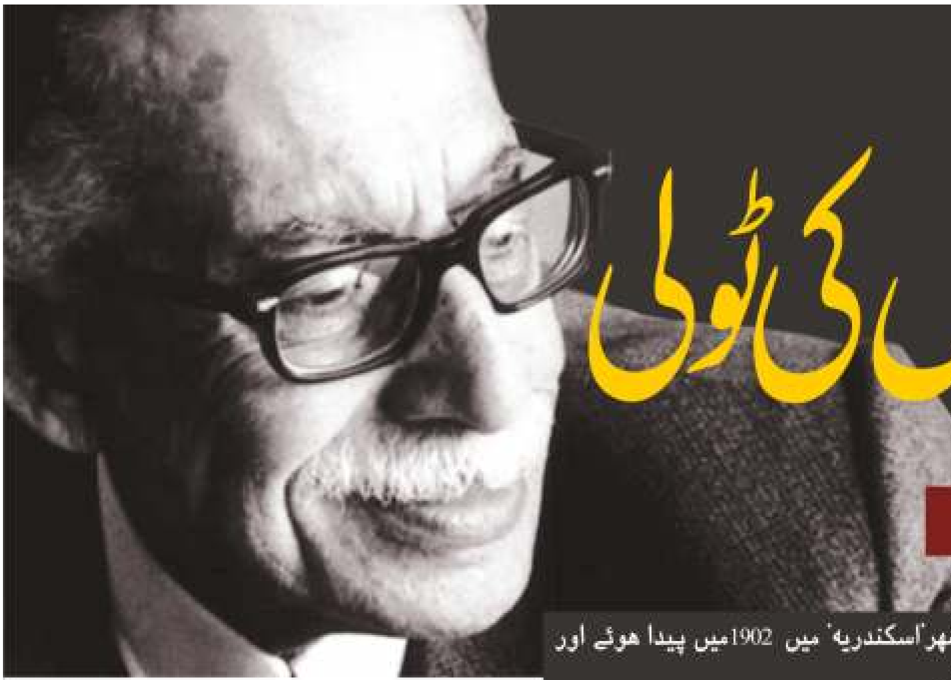

احمقوں کی ٹولی

مصنف: توفیق الحکیم
مترجم: محمد قطب الدین

عربی کہانی

توفیق الحکیم مصر کے مشہور تاریخی شہر 'اسکندریہ' میں 1902میں پیدا ہوئے اور 26جولائی 1987کو اس دار فانی سے کوچ کرگئے۔

موصوف معاصر عربی ادب کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی ادبی تخلیقات سے نہ صرف مصری سرزمین پر اپنا پرچم لہرایا بلکہ عالم عرب سے باہر بھی عالمی ادب میں اپنا ایک مقام بنایا۔یوں تو توفیق الحکیم اپنی ڈرامائی تخلیقات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے مگر انھوں نے ناول اور افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور اس میں بھی کامیاب رہے۔انھوں نے اپنی تمام تر ادبی تخلیقات میں مشرقی اور بطور خاص مصری سماج کے مسائل کو موضوع بحث بنایا اور انوکھے انداز میں پیش کیا۔ ان کے شاہ کار ڈراموں میں اہل الکھف، رحلة الی الغد، شہر زاد، السلطان الحائر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ناولوں میں الرباط المقدس، عصفور من الشرق اور 'عودة الروح' وغیرہ ناول نگاری کے بہترین نمونے کے طورپر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

توفیق الحکیم نے ڈرامہ اور ناول نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی خوب نام کمایا۔ مدرسة المغفلین، الشیخ البلبیسی، ابلیس ینتصر، لیلة الزفاف، طرید الفردوس" اور 'الدنیا روایة' جیسے افسانوں نے عرب قارئین کا دل جیت لیا۔اول الذکر افسانہ کا اردو ترجمہ قارئین کے پیش خدمت ہے۔

آدھی رات کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے وہ اپنے بستر سے اٹھا اور دروازہ کھولنے کے لیے کھڑا ہوا۔ وہ نیند میں مدہوش تھا۔وہ جس گھر میں تن تنہا رہتا تھا،اس کے دروازے کی طرف اس طرح بڑھا جیسے اپنی بے داری کا یقین نہ ہو۔پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر اس نے دروازہ کھولا۔ اچانک ایک نوجوان داخل ہوا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:

''مجھ پر رحم کرو... مجھ پر رحم کرو...!!''

وہ تیزی سے ہال کی طرف گیا،تمام لائٹس کو آن کیا، شان دار صوفے پر جا کر بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا اور زور زور سے پڑھنے لگا:

''مجھ پر رحم کرو... مجھ پر رحم کرو...!!''

صاحب خانہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور جمائی لیتے ہوئے پوچھا:

''کیا معاملہ ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا:

''معاملہ بہت سنگین ہے۔ یہ پیار کا معاملہ ہے۔ یہ بے خوابی کا معاملہ ہے۔ یہ جدائی کا معاملہ ہے۔رات بھر میں یہ شعر پڑھتا رہا۔شاید کہ وہ نرم پڑ جائے اور مجھ پر رحم کردے۔ میں نے اس کے لیے اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا۔ تاکہ شعر کے ہر لفظ میں ان ٹکڑوں کو پرو دوں۔ آپ بیٹھیں اور میری پریشانی سنیں۔''

صاحب خانہ نے اس کی بات ماننا ضروری سمجھا، کیونکہ مہمان دوست ہوتا ہے جسے ناراض نہیں کیا جاسکتا۔ سلیقہ اور تہذیب کا تقاضہ ہے کہ وہ مہمان کی عزت کرے اور اسے خوش رکھے۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بیٹھ گیا۔

اس کے اوپر نیند غالب آرہی تھی لیکن وہ صبر کررہا تھا، وہ غنودگی کو شکست دیتے ہوئے اپنے آپ کو کنٹرول کیے ہوئے تھا تاکہ رات کے اس حصے میں اس کا شعر سنے۔

نوجوان نے اپنے ہاتھ کا پرچہ کھولا اور گنگنانے لگا:

''مجھ پر رحم کرو... مجھ پر رحم کرو...!! میری نیند اُڑ چکی ہے۔''

صاحب خانہ چونک گیا اور اپنی سُرخ پلکوں کو ملتے ہوئے پوچھا: ''کس کی آنکھوں سے نیند اڑگئی؟''

نوجوان نے کہا: ''میری آنکھوں سے!''

صاحب خانہ نے کہا...: ''افسوس کی بات ہے...''

نوجوان شعر پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد جب اس نے گنگنانے کی کوئی آواز بازگشت نہیں پائی اور نہ ہی اپنی نرم وگداز آواز پر کوئی تبصرہ سنا تو اس نے صاحب خانہ کی طرف دیکھا وہ جھوم رہا تھا اور لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ پسندیدگی اور خوشی میں نہیں جھوم رہا تھا۔

نوجوان نے شعر سنانا بند کردیا اور زور سے بولا:

''معاف کیجیے...لگتا ہے آپ تھک چکے ہیں۔ اچھا ہوگا آپ کھڑے ہوجائیں۔

نیند میں مدہوش صاحب خانہ کو اپنی رہائی کا یقین ہوگیا اور وہ فوراً اپنی سیٹ سے اس طرح اچھل پڑا گویا وہ کوئی غلام ہو جسے آزاد کردیا گیا ہو، یا کوئی قیدی ہو جسے رہا کردیا گیا ہو۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ مگر نوجوان نے کہا:

''ہاں! بہتر ہے کہ آپ کھڑے ہوکر اپنے سر پر تھوڑا ٹھنڈا پانی انڈیل لیں۔ اس سے آپ کی نیند بھاگ جائے گی اور چاق وچوبند ہوکر باقی اشعار سن سکیں گے۔ اس لیے کہ قصیدہ تھوڑا طویل ہے۔

صاحب خانہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ مہمان نوازی کا پاس ولحاظ کیے بغیر عشق اور عاشق، شعروشاعری، نغموں اور آہ وبکا کے قصیدوں اور کرۂ ارض کی تمام عورتوں کو کوسنے لگا۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر پڑ کر سو گیا۔

اس رات کو کئی مہینے گزر گئے مگر اسے اپنے اسیر عشق دوست کی کوئی خبر نہ ملی۔ پھر اسے پتا چلا کہ وہ عشق جس کی شان میں اس نے آدھی رات کے بعد قصیدے پڑھے

تھے، اسے ایک بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اس کی محبوبہ خانہ کعبہ کے دروازے پر معلق قصیدوں کی طرح اس کی گردن سے لٹک گئی ہے اور شادی کے لیے اسے مجبور کررہی ہے۔ لیکن وہ اس سے شادی کیسے کرے گا؟ کیونکہ نوجوان اس دوشیزہ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ وہ ایک تفریح باز لڑکی ہے۔ یہ ان لڑکیوں میں سے ہے جو حد درجہ مستی کے لیے مشہور ہیں اور عشق ومعاشقہ میں بے پردگی کا مظاہرہ کرنے والی ہیں، اس نے بہت دل لگی اور اٹھکیلیاں کی ہیں۔ کتنوں کو اپنا گرویدہ بنایا اور کتنوں پر اپنا جادو چلایا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ٹیلی فون کے تار کو قوت گویائی بخشے تو وہ اس کے عشق ومعاشقے کی کہانی سنانے لگے۔ اگر ساحل سمندر کی ریت اور نائٹ کلب کے ریستوراں بولنے لگیں تو وہ اپنی بے شمار اشارے بازیوں، مسکراہٹوں اور نظر عنایت کا اعتراف کر لے۔

کل تک جو عاشق تھا وہ اب اپنی جان بچانے لگا اور اسے اپنے نام وعزت پر غیرت آئی۔ اس لڑکی سے شادی کے علاوہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ پیار کرنا اور بات ہے اور شادی کرنا دوسری بات ہے۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ پیار ومحبت کی بات کو اپنے مستقبل سے جوڑ دے۔ نہیں، بالکل نہیں، دوشیزہ کی جادوئی خوب صورتی اور اعلا خاندان کے باوجود وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔

اُدھر دوشیزہ نے خود اور مڈیٹر کی زبانی بھی کہلوایا کہ شادی سے پہلے کی مستی کا کوئی اور مطلب نہیں نکالا جاسکتا۔ یہ تو ہمارے زمانے میں عام بات ہے۔ یہ زمانہ آزادی اور روشن خیالی کا زمانہ ہے۔ بہت ساری کامیاب عورتوں نے شب زفاف سے پہلے عشق ومعاشقے کا مزہ چکھا ہے۔ یہ بے کار کی باتیں ہیں۔ کسی سنجیدہ آدمی کو ان سب چیزوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے...

آخر کار دوشیزہ ہمیشہ کی طرح اپنے مشن میں کامیاب ہوگئی اور وہ شخص شادی کے جال میں اس طرح پھنس گیا گویا کسی گڑھے میں گر گیا ہو۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ کیسے نرم پڑ گیا اور حکم بجالاتے ہوئے حامی بھردی۔ اسے بالکل یاد نہیں کہ اس کے قدم دلدل میں کیسے پھنس گئے... بہر حال وہ اپنے آپ کو تسلی دینے لگا اور یہ کہہ کر اطمینان دلانے لگا کہ میرے علاوہ دوسروں کے ساتھ شاید سارے اندیشے سچ ثابت ہوں۔ مگر میرے یا میرے جیسوں کے ساتھ یہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ میں اس کو جنم دینے والی اس کی ماں سے بھی زیادہ بہتر اسے جانتا ہوں اور وہ بھی مجھے میری سخت طبیعت، میری خودداری، بے انتہا غیرت اور میری بے خواب آنکھوں کو پہچانتی ہے۔

یہ تو اس عاشق مہمان کا حال تھا۔ جہاں تک صاحب خانہ کی بات ہے تو وہ نہ تو شعروشاعری سے واقف تھا اور نہ ہی پیار ومحبت سے اس کا کوئی واسطہ۔ اس کو صرف اپنے گھر کی تنہائی گراں گزر رہی تھی۔ کیونکہ گھر بغیر عورت کے ایسا ہی ہے جیسا کہ جسم بغیر روح کے۔ گھر کے ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں جانا ہی اس کا مشغلہ تھا۔ زبان حال سے وہ پرانا لوک گیت یوں گنگناتا تھا: ''طویل عرصے سے کنوارا ہوں، میری ماں میرے لیے کوئی خوب صورت اور مال دار لڑکی ڈھونڈ دا'' مگر اس کی ماں زندہ نہیں تھی جو اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کرتی، وہ خوب صورت اور مال دار کی شرط پر بھی اڑا ہوا نہیں تھا۔ وہ ایک درمیانی حل چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک شریف اور قناعت پسند آدمی تھا۔ لیکن اس کے لیے کون لڑکی تلاش کرے گا؟

اس وقت اسے فیملی کی سہیلیوں میں سے ایک خاتون یاد آئی، جو ادھیڑ عمر کی خاتون اور ایک باعزت شخص کی شریک حیات تھی اور وہ ترقی یافتہ سوسائٹی کے حالات سے باخبر تھی۔ اس شخص نے ٹیلی فون کے ذریعے اس سے رابطہ کیا اور شادی کی خواہش ظاہر کی۔ اس خاتون نے ہنستے ہوئے کہا: ''کیا تم میری ایک نصیحت مانو گے؟ موجودہ زمانے میں شادی اس طرح ہوتی ہے جیسا کہ کہاوت عام ہے کہ ''کوئی چیز خریدنے سے پہلے اسے اچھی طرح دیکھ لو'' زمانہ کے رسم ورواج کے مطابق مختلف محفلوں اور پارٹیوں میں جاؤ اور جو دوشیزہ تمھیں پسند آئے اسے منتخب کرلو اور اس سے پوچھو۔ یہی ایک سنہری موقع ہے۔ آئندہ ہفتے قاہرہ کے مشہور ریستوراں 'اریزونا' میں ایک چیریٹی پارٹی ہونے والی ہے جہاں تمھاری ملاقات قاہرہ کی خوب صورت دوشیزاؤں اور خواتین سے ہوسکتی ہے۔ وہاں جاؤ، دیکھو اور مجھے بتاؤ، پھر میں تمھاری رہ نمائی کروں گی.....

اس چیریٹی پارٹی کا وقت آن پہنچا۔ وہ ایک خوب صورت شام تھی جہاں ستارے جگمگارہے تھے اور چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے پارٹی کا لباس زیب تن کیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ آسمان، لائٹس اور عورتوں کی روشنی کے سمندر میں وہ غرق ہوگیا اور انسان اور درختوں کے باغ میں داخل ہوگیا۔ اس کے ارد گرد ٹہنیاں اور خوب صورت بانہیں پھیل گئیں۔ گلاب فروش کی شکل میں ابھرے ہوئے سینوں والی دل فریب حسیناؤں نے اس کا استقبال کیا اور دائیں بائیں ہر طرف سے گھیر لیا اور وہ اسیر حسن ہوگیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گلاب خود ہی گلاب کا پھول بیچ رہا ہو اور پھول اپنے ہاتھ میں پھول لیے ہوئے ہو۔ چنانچہ نادانستہ طور پر وہ اپنی جیب سے بھی پیسے نکال کر ادھر اُدھر پھینکنے لگا تاکہ ان کی مسکراہٹوں اور نظروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

اب وہ حسن کے بازار میں کھڑا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ کس دوشیزہ کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے؟ کسے پسند کرے اور کسے ناپسند؟ کس کا انتخاب کرے اور کسے انکار کرے؟ اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور آنکھیں چوندھیا گئیں۔ وہ مشکل اور حیرانی میں پڑ گیا۔ پھر اسے ایک آواز نے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ وہاں وہ تجربہ کار خاتون ہے جس نے اس کی رہ نمائی کی تھی، وہ اس کے پاس آئی اور ایک ماہر ناخدا کی طرح کھانے کے ٹیبل پر اور حسن کے جلوس میں اس کی رہ نمائی کرنے لگی۔ خاتون نے اس شخص کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا:

''کیا کوئی تمھیں پسند نہیں آئی؟''

اس نے فوراً جواب دیا: ''مجھے سب پسند آئیں۔ میں اس گلابی کپڑے والی دوشیزہ کو پسند کرتا ہوں۔ وہ نارنگی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس دوشیزہ بھی پسند ہے۔ وہ کتھئی رنگ کے کپڑوں والی بھی اچھی ہے۔ وہاں وہ سرمئی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس لڑکی بھی پسند ہے۔ اس ہیزل نٹ کے رنگ والے کپڑوں میں ملبوس ہنستی ہوئی دوشیزہ کو میں پسند کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی پسند ہے، وہ بھی پسند ہے بلکہ تمام لڑکیاں پسند ہیں۔

خاتون ہنس پڑی اور بولی:

''اس پارٹی میں موجود تمام دوشیزاؤں سے شادی کرنا نامعقول بات ہے۔ تمھیں اس حسن کے بازار میں سے کسی ایک کو پسند کرنا ہوگا۔

اس شخص نے کہا: ''اس چیریٹی پارٹی کو آپ موجودہ زمانہ کا 'غلام مارکیٹ' کہہ سکتی ہیں جو ایسے سامان سے بھرا ہوا ہے، جس سے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مجھے پتا نہیں چل سکا کہ اس بازار میں میری حیثیت بیچنے والے کی ہے یا خریدار کی؟ میں ادھر اُدھر بھٹک رہا ہوں۔ برائے مہربانی آپ اپنی حکمت اور وسیع تجربے کی بنیاد پر میرے لیے کوئی پسند کردیں....

خاتون نے چمکتی ہوئی دوشیزاؤں کے جھرمٹ کی طرف اشارہ کیا جن کے سامنے سورج کی روشنی بھی مدھم پڑ رہی تھی اور کہا:

''ان لڑکیوں پر ایک نظر ڈالو!''

اس شخص نے پوچھا: ''کیا وہ سب شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

خاتون نے جواب دیا: ''بالکل... تم جن دوشیزاؤں کو یہاں دیکھ رہے ہو وہ سب شادی کرنا چاہتی ہیں اور اگر کوئی شادی شدہ ہے تو وہ طلاق چاہتی ہیں...''

اس شخص نے آنکھیں کھول کر ان تمام دوشیزاؤں کو دیکھا جن کا گلا اور چھاتی کھلی ہوئی تھی۔ ان کے لبوں پر قاتلانہ مسکراہٹ تھی اور نظریں دل فریب۔ اس شخص نے من ہی من

میں کہا: وہ زمانہ کہاں گیا جب عورتوں کو محفوظ اور پوشیدہ زیورات سمجھا جاتا تھا؟ آپ ہی بتائیں آج انھیں ہم کیا کہیں؟

وہ مزید سوچنے لگا کہ انھیں کس نام سے، کس لقب سے یا کس صفت سے موسوم کیا جائے۔ مگر اچانک اس کی سوچ کا سلسلہ رُک گیا... اس نے دور سے ہی اپنے مہمان دوست کو دیکھا، وہ دروازے سے اندر آیا اور ہمیشہ کی طرح گلاب فروش دوشیزاؤں نے اسے گھیر لیا، اسی وقت مڈیٹر خاتون نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہتے ہوئے بدبدایا: ''تمھارا دوست!''

اس شخص نے کہا: ''ہاں!... ''عجیب بات ہے، وہ تنہا ہی آیا ہے۔ تو اس کی بیوی کہاں ہے؟ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے ہی ان دونوں کو ملوایا تھا اور شادی کروانے میں بھی آپ ہی مڈیٹر تھیں۔''

خاتون نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ''ہاں! شوشو نام کی لڑکی میری سہیلی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ شادی کے بعد اپنی عقل سے کام لے گی۔ لیکن یہ راز کی بات ہے۔ میں اب اس کی ذمے دار بننا نہیں چاہتی۔ میں جانتی ہوں کہ بیوی کو مستی کرنے کا پورا حق ہے... لیکن اسے بہت محتاط رہنا چاہیے تاکہ اس پر کوئی الزام نہ آئے اور بہت دھیان سے کام کرنا چاہیے تاکہ اس کی چال چلن پر کوئی شک نہ کرے۔ جہاں تک میری دوست شوشو کا تعلق ہے تو پتا نہیں آج کل اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے... باوجود یکہ سب کو معلوم ہے کہ بیک وقت اس کے چار یا پانچ عاشق رہ چکے ہیں، وہ اپنے معاملات کو ٹھیک کرنا نہیں چاہتی یا اپنے کرتوتوں کو نہیں چھپاتی۔

سوچو! وہ دن دہاڑے اپنی کار سے مشہور و معروف ہوٹل کے سامنے اترتی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھیلا ہوتا ہے جس میں ریشمی پائجامہ رکھتی ہے اور یہ سب ڈرائیور کی نظروں کے سامنے اور ہر گزرنے والے جان پہچان والے اور اجنبی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے جو ممکن ہے گاڑی اور گاڑی کے مالک کو جانتے ہوں۔ میں اس کی ان حرکتوں کو دیکھتی ہوں اور اپنے من میں کہتی ہوں: ''یا خدا! راز فاش مت کیجیے... اب ہر شخص اس کی چال چلن کو جان گیا ہے۔ نہیں... شوشو آج کل ضرورت سے زیادہ ہی لاپروا ہو چکی ہے۔ اس کا معاملہ بالکل عام ہو چکا ہے اور اس کی خوش بو ہر جگہ پھیل چکی ہے۔'''' اور اس کا شوہر؟ کیا وہ اس خوش بو کو محسوس نہیں کر رہا ہوگا؟ لگتا ہے اکثر شوہروں کی طرح وہ بھی مذکوم ہو چکا ہے۔

اس وقت شوشو کا شوہر گلاب فروش دوشیزاؤں سے فرصت پا کر بھیڑ کو دیکھنے لگا گویا وہ کسی کو تلاش کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان دونوں کے پاس آیا۔ ان دونوں کے پاس سے ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اس نے بھی ان دونوں کو دیکھا۔ وہ ان کے پاس بھاگ کر گیا اور آداب بجا لایا۔ اس نے اپنے دوست صاحب خانہ کی پرسکون طریقے سے ملامت کی جس میں مذاق بھی شامل تھا۔ کیونکہ گھر پر اس نے اس رات جب اس کی شاعری پھوٹ پڑی تھی، بے توجہی کا سامنا کیا تھا۔ اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی تھی، نہ تو منگنی میں اور نہ ہی شادی کی تقریب میں اسے بلایا۔ اس وقت وہ اس خاتون کی طرف متوجہ ہوا اور جلدی اور شوق کے لہجے میں بولا:

''...کیا آپ نے شوشو کو یہاں پر نہیں دیکھا؟ اس نے مجھے آگے چلنے کو یہ کہتے ہوئے کہا کہ وہ پہلے اپنی کچھ سہیلیوں سے ملے گی۔ اسی لیے میں بھی کچھ کام سے چلا گیا جس کی وجہ سے مجھے تاخیر ہو گئی اور ابھی ابھی آیا ہوں یہ سوچ کر کہ میں اُسے پالوں گا۔ یقیناً اس کو سہیلیوں کے ساتھ گفتگو نے وقت پر پہنچنے نہیں دیا ہوگا... یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں آپ سے مل رہا ہوں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کا یہ ایک اچھا موقع ہے۔ مجھے شادی کیے ہوئے چھے مہینے ہونے والے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ میں احمق تھا۔ تب میں پس و پیش میں تھا اور ڈرا ہوا تھا۔ آپ کو کیا یاد نہیں کہ آپ نے مجھے مطمئن کرنے کی کتنی کوشش کی تھی؟ آخر کار جیت آپ کی ہی ہوئی۔ اب شوشو فرشتہ صفت لڑکی ہے۔ اس کی غیر سنجیدگی کے بارے میں اپنے سابقہ خیال پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ آج آپ نے محسوس کیا کہ وہ کتنی بدل چکی ہے اور سمجھ دار ہو چکی ہے۔ میرے خدشات بے جا تھے۔ میں نے اس بے چاری پر ظلم کیا۔ وہ تو واقعی ایک اچھی، مخلص اور عدیم المثال بیوی ہے۔

وہ بولتا ہی رہا اور اس کا صاحب خانہ دوست کان لگا کر منھ کھولے سنتا رہا۔ اپنے کانوں پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا کہ اس کے کانوں نے اسے دھوکہ نہیں دیا ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا۔

تھوڑی ہی دیر میں شوشو کے شوہر کے ایک جاننے والے شخص نے اپنے ہاتھ سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر اس کے ساتھ چل پڑا اور اس کھانے کے ٹیبل کی طرف گیا جو دوستوں سے آباد تھا۔ اس کا صاحب خانہ دوست اور مڈیٹر خاتون وہیں دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ بالآخر خاتون نے زبان کھولی اور بولی:

''خدا کی قسم وہ بہت چالاک نکلا!''

چالاک؟! کیا میرا انجام بھی ایسا ہی ہونے والا ہے؟ کیا میرے لیے بھی آپ کی نصیحت یہی ہے؟

خاتون نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''نہیں ہم ڈرومت... تمھارے حالات بالکل مختلف ہیں اور تم نے ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنے کانوں سے سنا ہے، اس لیے میں تمھیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ کیا تم صاف صاف جاننا چاہتے ہو؟ تو پھر میری رائے سنو: یہ تمھاری نئی نسل ہے اور یہ تمھارا زمانہ ہے۔ حالات کے مطابق ہی کام کرو اور اپنے آپ کو دھوکہ مت دو۔ جان لو کہ یہاں اکثر و بیشتر خاتون کے دو یا تین عاشق ہیں۔ وہ لڑکی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نیک نام اور پاک باز ہے، اس کا صرف ایک ہی عاشق ہے۔ لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں کسی مغالطے میں رکھوں یا تمھیں اپنے آپ کو مغالطے میں رکھنے پر ہمت افزائی کروں، تو یہ دوسری بات ہے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ابھی کے حالات کو حقیقت پسندانہ نگاہوں سے دیکھو۔''

خاتون خاموش ہو گئی، اس لیے کہ وہاں پر رقص کرنے والیوں کی میوزک گونج رہی تھی۔ ہر کھانے کے ٹیبل پر سے جوڑے اٹھ گئے اور ڈھول تاشے بجنے لگے اور سیکسوفون (Saxophone) کی آواز گونجنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا کوئی بھوکا جانور چیخ رہا ہو۔ جسم جسم سے ٹکرائے، آنکھیں سرخ ہو گئیں، لب تر ہو گئے اور آنکھیں پھیل گئیں اور شادی کے طلب گار کا ذہن منتشر ہو گیا۔ کیا کرے؟ کیا کہے؟ اور کس چیز پر اعتبار کرے؟

جب تک ڈانس ہوتا رہا اور ڈانس کرنے والے اور دیکھنے والوں کے دلوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں ہوتی رہیں، وہ اپنی سوچ اور فیصلہ میں حیران و پریشان رہا۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اور مڈیٹر خاتون شادی کرنے والے اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی:

''ابھی تک مجھے تمھارا کوئی جواب نہیں ملا... تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

وہ تھوڑی دیر تک سر نیچے جھکائے رہا، پھر اوپر اٹھاتے ہوئے بولا:

''میں اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اب تو میرے لیے کوئی شریف اور پاک دامن لڑکی ہی ڈھونڈ دیجیے، جو نیک نام ہو اور میرے سوا اس کا کوئی عاشق نہ ہو۔''

■

Dr. Md. Qutbuddin
Associate Professor of Arabic
Centre of Arabic and African Studies
School of Language, Literature and Culture Studies (New Building)
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067
Mob.: 9999912655
Email.: basmaqutb@gmail.com

تمنا شاہین

بنارس میں فارسی ادب

بنارس میں فارسی ادب کی ایک صحت مند روایت رہی ہے۔ قدیم زمانے کے بعض فارسی ادبی آثار آج بھی باشندگان بنارس کے ذاتی کتب خانوں کے علاوہ قلعہ رام نگر اور کلا بھون بی۔ایچ۔یو کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ اس بات سے ادب کے تقریباً تمام طالب علم بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کو مغلوں کے دور میں زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔مغلیہ حکومت کے زمانے میں بے شمار فارسی کتب وجود میں آئیں اور اس زبان کو ملک کی سرکاری زبان کی حیثیت بھی حاصل ہوئی

بنارس میں فارسی ادب کی ایک صحت مند روایت رہی ہے۔قدیم زمانے کے بعض فارسی ادبی آثار آج بھی باشندگان بنارس کے ذاتی کتب خانوں کے علاوہ قلعہ رام نگر اور کلا بھون بی۔ایچ۔یو کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔اس بات سے ادب کے تقریباً تمام طالب علم بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کو مغلوں کے دور میں زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔مغلیہ حکومت کے زمانے میں بے شمار فارسی کتب وجود میں آئیں اور اس زبان کو ملک کی سرکاری زبان کی حیثیت بھی حاصل ہوئی لیکن بنارس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنارس میں فارسی زبان مغلوں کی آمد سے قبل آچکی تھی۔ہندی زبان کے مشہور شاعر کبیر داس اردو اور سنسکرت کے علاوہ فارسی بھی جانتے تھے۔عبد الرحیم خانخاناں بنیادی طور پر ہندی کے شاعر تھے لیکن انھیں فارسی زبان سے گہری رغبت تھی۔ان کی ہندی شاعری میں عربی وفارسی الفاظ کی خوبصورت آمیزش ان کی فارسی دانی کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ہندی زبان کے مشہور شاعر تلسی داس صرف ہندی اور سنسکرت کے عالم ہی نہیں تھے بلکہ عربی وفارسی بھی جانتے تھے۔ان کی شاعری میں ہندی کے ساتھ فارسی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام بنارس میں گزارے اور یہیں اسّی گھاٹ پر وفات پائی۔

شاہجہاں کے بڑے بیٹے دارا شکوہ نے عربی و فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔پنڈت راما نند ترپاٹھی جو سنسکرت اور فارسی کے اچھے عالم تھے 1632 میں بنارس آئے۔ان کے علم وکمال کی شہرت جب شاہ جہاں تک پہنچی تو انھوں نے اپنے بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو ان کی شاگردی میں دے دیا۔ان کے زیر سایہ دارا شکوہ نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کی چونکہ دارا شکوہ کو سنسکرت علوم سے خاصی دلچسپی تھی لہٰذا انھوں نے بنارس کے کئی پنڈتوں سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔انھوں نے اپنشدوں اور علم وید کی کئی اہم کتابوں کا فارسی ترجمہ کرایا اور اس کام کے لیے 150 پنڈت مقرر کیے۔دارا شکوہ نے اپنشدوں کے ترجمے کا نام 'سرا کبر' رکھا۔دراصل انھوں نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کر کے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد مستحکم کرنے کی کوشش کی۔دارا شکوہ سے متاثر ہوکر کئی ہندو دانشوروں نے سنسکرت کے ساتھ فارسی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کیا۔چونکہ دارا شکوہ ایک اچھے شاعر تھے اور انھیں شعر وادب سے گہری رغبت تھی۔اس لیے شعرا وادبا کی قدر بھی کرتے تھے اور انھیں اعزاز واکرام سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ دارا شکوہ نے یہ زبان فارسی کئی قطعات لکھے۔ان کی فارسی دانی اور سنسکرت سے دلچسپی نے فارسی زبان و ادب کے ارتقامیں اہم کردار ادا کیا۔اسی زمانے میں فارسی کے ادبی افق پر منشی چندر بھان برہمن کا نام لہرایا جو ایک عظیم المرتبت شاعر ہونے کے ساتھ ایک بہترین انشا پرداز بھی تھے۔وہ دارا شکوہ کو بے حد عزیز تھے۔بنارس کے پروردہ چندر بھان کا درج ذیل شعر آج بھی ادبی حلقوں میں مشہور ہے۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں یار
بکعبہ بزم بازش برہمن آوردم

(تحقیقی مقالہ: مسلم الحریری اور ان کے تلامذہ: مسرت شاہین، ص 15)

ترجمہ: ''میرا دل ایسا کفر آشنا ہے کہ میں نے چند بار کعبہ کی زیارت کی اس کے باوجود میں برہمنیت سے چھٹکارا نہ پاسکا۔''

دارا شکوہ کے ایک منشی بنواری داس تھے انھیں فارسی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ صرف ایک مترجم ہی نہیں تھے بلکہ اچھے شاعر بھی تھے اور صوفیانہ شعر کہتے تھے انھوں نے نثر میں راجہ ولی، رام گپت اور بودھ چند اودے کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ تقریباً اسی زمانے میں مرزا فطرت موسوی نے اپنی مشہور مثنوی 'در ماجرائے بنارس' تصنیف کی تھی جس میں انھوں نے عشقیہ داستان پیش کرتے ہوئے گنگا کے حسن اور پاکیزگی کو انتہائی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ شاعر بھی بنارس کی مٹی سے نمودار ہوا اور یہیں کی خاک کا پیوند بنا۔ دارا شکوہ کے زمانے میں ہی ملا طغرائی مشہدی بنارس تشریف لائے۔ ہندوستان کے مختلف خطوں کی سیاحت کرتے ہوئے جب وہ بنارس پہنچے تو یہاں کی خوشگوار فضا اور رنگینی کو دیکھ کر ان کی زبان سے بے ساختہ حسب ذیل اشعار نکل پڑے:

ز بنگالہ تا احمدآباد و سندھ
شدم کوچۂ پیمائی ہر شہر ہند
صف آرا می باغ است گنگ بنارس
ارم چو کند طرح چنگ بنارس
حسن بت را سیر کردم ذوقہا در دیر کردم
نقد ایماں خیر کردم پیش دربان بنارس

(ایضاً، ص 16)

ترجمہ: ''بنگال سے احمدآباد اور سندھ ہوتے ہوئے میں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کی یعنی ہندوستان کے کئی شہروں میں گھوما۔

بنارس کی گنگا ندی اور یہاں کے باغوں کی صف آرائی کا مقابلہ کوئی دوسرا شہر نہیں کر سکتا جنت بھی اس کو دیکھ کر رشک کرتی ہے۔

میں نے بنارس کے بت خانوں کی سیر کی۔ مندروں میں جا کر بھی اپنا شوق پورا کیا اور اپنے ایمان [اس کی قیمت] کو بھی بنارس کے دربانوں کے سامنے پیش کر دیا۔''

گزرتے وقت کے ساتھ بنارس میں کئی ایسے شاعر و ادیب پروان چڑھے جنھوں نے فارسی شعر و ادب سے دلچسپی کے تحت ایک نئی ادبی روایت کو استحکام بخشا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہاں فارسی زبان و ادب کے کئی جید علما موجود تھے جن میں بعضوں نے فارسی شاعری کو عروج تک پہنچایا اور بعضوں نے نثر نگاری میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے۔ شیخ علی حزیں، لالہ متن لال آفریں، ملا عمر سابق بنارسی اور مخلص بنارسی وغیرہ نے شہر بنارس کے باشندوں میں فارسی زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ شیخ علی حزیں کی بنارس آمد اور سکونت سے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بنارس کی ادبی روایت سے متعلق جتنے بھی مضامین تحقیقی مقالے اور کتابیں راقمۃ السطور کی نظر سے گزرے ہیں ان سب میں حزیں کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے کیونکہ ان کے پائے کا کوئی دوسرا فارسی شاعر اس زمانے میں نہیں تھا۔ وہ نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جسے پیش کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ حزیں کے زمانے میں کئی شعرا و ادبا بنارس میں رہ کر علم و ادب کی آبیاری کر رہے تھے جب کہ کچھ شعرا ایسے بھی تھے جو حزیں کے رنگ میں اشعار کہتے تھے۔ ان میں ملا عمر سابق بنارسی کا نام سرفہرست ہے۔ ملا کے اجداد کا تعلق بخارا سے تھا لیکن ان کی پیدائش بنارس میں ہوئی۔ انھوں نے محلہ کتوا پورہ میں اپنا ذاتی مکان بنوا کر مستقل رہائش اختیار کی۔ شعر و شاعری سے انھیں گہرا شغف تھا۔ چونکہ شیخ علی حزیں اپنی صلاحیت سے بخوبی واقف تھے اور اپنے علم و کمالات پر انھیں حد درجہ زعم تھا جس کے سبب وہ ہر کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن یہ بھی ایک مستند حقیقت ہے کہ وہ ملا کی ذہانت و فطانت سے متاثر تھے۔ ان کی علم فہمی اور پرہیزگاری نے حزیں کو ان سے رشتہ استوار رکھنے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ ملا کے استاد سراج الدین علی خاں آرزو سے حزیں کے تعلقات اچھے نہ تھے، اس کے باوجود انھوں نے ملا سے دوستانہ مراسم رکھے اور زندگی کے آخری ایام تک دونوں کے درمیان باہمی روابط اور محبت و خلوص کی فضا برقرار رہی۔ دونوں ایک دوسرے کے کلام سے نہ صرف محظوظ ہوتے بلکہ ستائش بھی کرتے تھے۔ ملا نے حزیں کے رنگ میں بھی اشعار کہے بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حزیں کوئی غزل سناتے اور ملا دوسرے ہی دن اسی طرح میں غزل کہہ کر حزیں کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ حزیں انتہائی شوق سے نہ صرف ان کا کلام سنتے بلکہ داد و تحسین سے نواز کر عزت افزائی بھی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ای وای براسیری کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

(حزیں)

ترجمہ: ''افسوس ہے ایسے قیدی پر جس کی یاد جاتی رہے کہ دام میں پڑا رہے اور صیاد اسے چھوڑ کر چلا جائے۔''

جانش چساں بہ حسرت ناشاد رفتہ باشد
کز ہجر بر دل او بیداد رفتہ باشد

(ملا سابق)

ترجمہ: ''اس کی روح حسرتوں سے دوچار رہی اور وہ ناشاد ہی چلا گیا اس کے دل پر جدائی کا بوجھ رہا اور پھر بھی وہ ظالم چلا گیا۔''

ملا عمر سابق نے کئی مثنویاں بھی لکھیں۔ بنارس کے مشہور قصے 'قصۂ عاشق معشوق' پر انھوں نے ایک طویل مثنوی تحریر کی۔ اس میں انھوں نے شہر بنارس کی تعریف اس طرح کی ہے۔

چہ شہر آنکہ از حسن سر انجام
زلطف حق بنارس یافتہ نام
چہ شہری انتخاب ہفت کشور
زروم و مصر وبردہ رونق و فر

(اوراق پریشاں: پروفیسر شمیم اختر، ص 58)

ترجمہ: ''اپنے حسن و زیبائش کی وجہ سے بالآخر ایک شہر خدائے لطف سے بنارس نام سے موسوم ہو گیا۔

کیا ہی حسین شہر ہے کہ ہفت کشور سے انتخاب کیا گیا ہے اور اس کے جاہ و جلال اور رونق کو روم و مصر سے لیا گیا ہے۔''

امیر الحق مخلص بنارسی کا تعلق بھی اسی زمانے سے تھا۔ حالانکہ ان کے تخلص کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔ بعضوں نے ان کا تخلص 'اسد' تحریر کیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے 'مخلص' تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بارہا اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ وہ صرف ایک بلند پایہ صوفی شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ عربی و فارسی زبان پر مہارت کے ساتھ مروجہ علوم سے بھی انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ انھوں نے بھی حزیں کے رنگ بلکہ اسی بحر میں اشعار کہے ہیں۔ حزیں اور ملا سابق کے مذکورہ شعر کی طرح پر مخلص کا درج ذیل شعر دیکھیے۔

عمری کہ بی گل و مل ناشاد رفتہ باشد
فصل بہار رنگیں برباد رفتہ باشد

ترجمہ: ''ایک عمر بغیر شراب و شباب کے ناشاد ہی چلی گئی اور فصل بہار کی رنگینیاں بھی بیکار چلی گئیں۔''

اس کے علاوہ ان کا اپنا مخصوص رنگ تھا جن میں صوفیانہ افکار و خیالات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ مثلاً

رندان مئی پرست زکونین فارغ اند
کر دند صرف بادہ کثیر و قلیل را

(ایضاً،ص64)

ترجمہ:''شراب کا رسیا قلیل و کثیر یعنی تمام شراب کو ختم کر کے اب دونوں جہاں سے فارغ ہو چلا ہے۔''

اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے مختلف خطوں کے شعرا و ادبا نے بنارس میں سکونت اختیار کی جن میں سے بعض اہل علم تا عمر اسی شہر کے ہو کر رہے۔لالہ متن لال آفریں بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔ان کا تعلق الہ آباد سے تھا لیکن جوان بیٹے کی موت کے بعد وہ بنارس آگئے اور یہیں مستقل طور پر رہنے لگے۔ فارسی زبان وادب سے انھیں گہری رغبت تھی۔انھوں نے بنارس کی تعریف میں تین ہزار اشعار پر مشتمل ایک فارسی مثنوی بہ نام 'کاشی استت' تحریر کی جو اس زمانے میں بے حد پسند کی گئی۔

نواب علی ابراہیم خاں 'حاکم بنارس' نے جب یہاں مستقل سکونت اختیار کی تو یہاں کے ادبی ذخیرے میں قابل قدر اضافے ہوئے۔ انھوں نے اپنے قیام کے دوران کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ان کی تصانیف میں تذکرہ شعرا، وقائع جنگ مرہٹہ، خلاصۃ الکلام اور گلزار ابراہیم زیادہ مشہور ہوئیں۔دراصل خلاصۃ الکلام فارسی گو شعرا کا ایک تذکرہ ہے جس میں 188 مثنویات کا انتخاب بھی شامل ہے۔

فارسی چونکہ مغلوں کی مادری زبان تھی اس لیے انھوں نے اس کی سرپرستی اور حفاظت کی پوری کوشش کی اور مملکت کا نظم و نسق کچھ اس طرح قائم کیا کہ بلا امتیاز قوم وملت اور بلا تفریق ذات وبرادری ہندوستانیوں نے فارسی زبان سیکھی۔کسی نے مصلحت کے تحت فارسی زبان میں مہارت حاصل کی تو کسی نے ذاتی ذوق وشوق کی بنیاد پر اس زبان میں کمال حاصل کیا۔چونکہ مغلوں کے دور حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی مکتب میں ایک ہی استاد سے عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔اس لیے دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں خلوص ومحبت اور اشتراک وتعاون کا جذبہ بھی پرورش پا رہا تھا لیکن انگریزوں کو یہ تال میل اور باہمی اتفاق بری طرح کھٹکتا تھا۔اس لیے انھوں نے ہندوستان میں کئی ایسے ادارے قائم کیے جہاں ہندوستانی زبانوں کی مشترکہ تعلیم دی جاتی تھی۔اس سلسلے میں بنارس میں بھی ایک اسکول قائم ہوا۔ڈاکٹر ابوالحسن اختر لکھتے ہیں:

''بنارس اسکول 1818 میں قائم ہوا تھا۔اس مدرسے کے ابتدائی اخراجات کے لیے جے کشن گوپال نے 1814 میں 20000 کی رقم عنایت کی تھی۔اس میں انگریزی، فارسی اور بنگلہ زبان کی درس وتدریس کا معقول انتظام تھا۔''

(فارسی ادب بعہد بہادر شاہ ظفر: ڈاکٹر ابوالحسن اختر،ص88)

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں ملک کے سیاسی وسماجی حالات انتہائی فتنہ خیز تھے۔یہی وہ زمانہ ہے جب مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی زبان وادب بھی تنزلی کا شکار ہو رہا تھا لیکن بنارس کے ذی علم طبقے میں فارسی ادب کا وقار باقی تھا۔انیسویں اور بیسویں صدی میں بھی یہاں فارسی داں موجود تھے۔ انیسویں صدی کے نصف میں امیر بیگ بنارسی نے 'حدائق الشعرا' کے نام سے ایک تاریخ رقم کی۔وہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے اور انھیں نثر نگاری پر بھی عبور حاصل تھا۔مرزا غالب نے کلکتہ جاتے ہوئے جب بنارس میں قیام کیا تو 108 اشعار پر مشتمل ایک مثنوی 'چراغ دیر' تحریر کی۔اس مثنوی میں غالب جیسے خود پسند شاعر نے بنارس کی تعریف دل کھول کر کی ہے۔مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور
بنارس را کسے گفتا کہ چین است
ہنوز از گنگ چینش بر جبین است
بخوش پرکاریٔ طرز وجودش
زدہلی می رسد ہر دم درودش
بنارس را مگر دیدست در خواب
کہ می گردد زنہرش در دہن آب

(آثار بنارس: مفتی عبدالسلام نعمانی،ص28)

ترجمہ:''سبحان اللہ بنارس کو بری نظر نہ لگے یہ ایسی جنت ہے جہاں خوشی کے شادیانے بجتے ہیں اور یہ بھرا پُرا فردوس ہے۔

کسی نے جب کہا کہ بنارس حسن وزیبائش میں چین کی طرح ہے [یہ بات بنارس کو بری لگی] اسی وجہ سے آج تک بنارس کے ماتھے پر شکن پڑی ہوئی ہے۔

اس کے وجود کا ناز و انداز ایسا بھلا اور خوش گوار ہے کہ اس پر دہلی ہمیشہ درود بھیجتا رہتا ہے۔

چونکہ [دہلی] نے بنارس کو خواب میں دیکھ لیا ہے اس لیے اس کے منھ میں نہر کا پانی بھر آیا ہے۔''

بنارس کے معروف شاعر ذاکر بنارسی کے چھوٹے بھائی 'مولوی پناہ علی' عربی وفارسی کے جید عالم تھے۔ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر مہاراجہ ایشوری پرساد نرائن سنگھ نے انھیں اپنے بچوں کا استاد مقرر کر دیا تھا۔وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور خود پناہ علی بھی اپنے فرائض ایمانداری سے ادا کرتے تھے۔اس زمانے میں رجب علی بیگ سرور بھی بنارس میں مقیم تھے۔وہ مہاراجہ بنارس کے خاص مہمان تھے۔سرور نے مہاراجہ کی فرمائش پر 'محمد رضی تبریزی' کی فارسی تصنیف 'حدائق العشاق' کا ترجمہ 'گلزار سرور' کے نام سے کیا جو ان کی اردو اور فارسی دانی کا بہترین نمونہ ہے۔'پنڈت دیا رام عاشق' عربی وفارسی لسانیات کے ماہر تھے ان کا قریبی تعلق دلّی سے تھا لیکن وہ مستقل طور پر بنارس میں ہی رہتے تھے۔فارسی زبان وادب میں 'لالہ بشیشر پرساد' کا نام محتاج تعارف نہیں۔وہ بیک وقت کئی صفات کے مالک تھے۔وہ ایک بلند پایہ مصنف اور مترجم ہونے کے ساتھ ایک بہترین شاعر بھی تھے۔ فارسی زبان وادب پر مہارت کے ساتھ رموز شعر گوئی سے بھی انھیں گہری واقفیت تھی۔ان کی تمام تصنیفات وتالیفات کا علم تو نہ ہو سکا البتہ 'تحفۃ الاحباب بنارس' (یہ ان کی اہم تصنیف ہے) میں انھوں نے اپنے احوال درج کیے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے بھی عربی وفارسی کے عالم تھے۔پھر بھی انھوں نے سنسکرت اور فارسی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے عوام کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ڈاکٹر بھگوان داس ہندی، سنسکرت اور بنگلہ کے ساتھ عربی وفارسی کے بھی عالم تھے۔حافظ رحمت اللہ رحمت بنارسی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔منشی آفاق بنارسی، فائز بنارسی، مسلم الحریری اور مولانا کریم الدین احمد وغیرہ نے بھی فارسی زبان وادب کی خدمت کی۔ان کے علاوہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ میں مولوی سلیمان عباس، امرت لعل عشرت، حنیف نقوی اور شمیم اختر کو بھی فارسی زبان وادب سے گہری وابستگی تھی۔موجودہ دور میں فارسی زبان وادب کی خدمت کرنے والوں میں یونیورسٹی کے اساتذہ خصوصاً پروفیسر سید حسن عباس اور پروفیسر محمد عقیل کے نام قابل ذکر ہیں۔اس سلسلے میں مزید تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہر بنارس میں فارسی زبان وادب کا ماضی جتنا شاندار اور تابناک تھا اس کا حال اتنا ہی ابتر ہے۔فارسی جاننے والے آج بھی یہاں کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن زبان پر مہارت اور ادب سے اصل واقفیت رکھنے والوں کی شدید کمی ہے لہٰذا بنارس میں اس کے مستقبل سے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

■

Dr. Tamanna Shaheen
Guest Faculty, Department Of Urdu
DAVPG College,
Varanasi- 221001 (UP)
Mob:9389201652.
Email: tamannashaheen@yahoo.com

نوشاد عالم ندوی

پروفیسر صادق سے انٹرویو

پروفیسر صادق مختلف جہتوں میں کام کرنے والے شاعر، ادیب، مصور اور ڈرامہ نگار ہیں۔ وہ گزشتہ پچاس پچپن برسوں سے شاعری، تنقید، تحقیق، ڈرامہ نگاری، طنزومزاح اور مصوری کے میدانوں میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی زبان میں بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ اردو اور ہندی میں ان کے کیے ہوئے کاموں پر کافی لکھا جاچکا ہے۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا میں انھوں نے جو کام کیا ہے، اس کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں کیے گئے ان کے کاموں کا جائزہ لینے کی غرض سے ان کے ساتھ لیا گیا ایک انٹرویو یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

نوشاد عالم ندوی: آپ کو الیکٹرانک میڈیا میں کام کرنے کا خیال کب اور کیوں آیا؟

صادق: میں جب دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر تھا، ان دنوں وہاں ماس میڈیا کے عنوان سے ایک ڈپلومہ کورس بھی ہوا کرتا تھا۔ مجھے یہ کورس پڑھانے کے لیے دیا گیا، خود میری بھی اس میں دلچسپی تھی، کیونکہ میرے بڑے بھائی جناب محمود زکی ایک صحافی بھی تھے اور روزنامہ 'نیا سماج' نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ لہٰذا مجھے بھی اخبار نویسی سے دلچسپی ہوگئی، اس تجربے کی وجہ سے میں نے ڈپلومہ کورس پڑھانے کے لیے اخبار نویسی کا پیپر لے لیا، اور پڑھانے لگا۔ حیات اللہ انصاری سے میرے تعلقات تھے، ان سے بہت سی باتیں میں نے معلوم کیں اور اپنے لیکچروں میں ان کا استعمال بھی کرتا رہا۔

ن ع ن: آپ اخبار نویسی سے الیکٹرانک میڈیا کی طرف کیسے آئے؟

صادق: ڈپلومہ کورس میں دو سال پڑھانے کے بعد مجھے ڈاکیومینٹری پڑھانے کے لیے ایک نیا پیپر دے دیا گیا، جس کا مجھے کوئی عملی تجربہ نہ تھا۔ میں نے اس کام کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور ڈاکیومینٹری فلموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مختلف کتابوں اور اس فیلڈ سے متعلق جانکاری رکھنے والے احباب جناب کملیشور اور جناب دیویندر اسّر وغیرہ سے ملاقاتیں کر کے بہت سی کام کی باتیں معلوم کیں۔

ن ع ن: لیکن یہ دونوں تو ادیب حضرات ہیں، الیکٹرانک میڈیا سے ان کا کیا تعلق رہا ہے؟

صادق: کملیشور دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل تھے، اور دیویندر اسّر یوروپ میں 'گوریلا ٹی وی' پر تحقیقی کام کر چکے تھے اور دستاویزی فلموں سے متعلق بہت اہم معلومات رکھتے تھے۔

ن ع ن: دستاویزی فلم بنانے کا آپ کا پہلا تجربہ؟

صادق: اتفاقاً سنیما گرافرس نامی ایک کمپنی سے میرا تعلق ہوگیا جس کا دفتر رانی جھانسی روڈ پر واقع تھا، یہ کمپنی دوردرشن کے لیے دستاویزی فلمیں اور سیریل بنائی تھی۔ سنیما گرافرس کے دفتر میں ایک دن میری ملاقات رما پانڈے سے ہوئی جو دوردرشن پر نیوز ریڈر تھیں اور ڈاکیومینٹری فلمیں بنانے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھیں۔ میں نے ان کے لیے بسنت بہار کے موضوع پر ایک ڈاکیومینٹری فلم کی اسکرپٹ لکھی۔ یہ دستاویزی فلم اسکرپٹ لکھنے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔

ن ع ن: آپ نے صرف اسکرپٹ ہی لکھی یا اس کی شوٹنگ میں بھی حصہ لیا؟

صادق: میں نے صرف اسکرپٹ لکھی تھی، شوٹنگ دہلی، جے پور، چنڈی گڑھ اور شری نگر وغیرہ میں ہوئی، یہ سارا کام رما پانڈے نے خود انجام دیا، انھیں کافی تجربہ بھی تھا، لہٰذا بہت اچھی ڈاکیومینٹری فلم بنی اور کچھ عرصے بعد جب دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ کی گئی تو ملک بھر میں بے حد پسند کی گئی۔ اس زمانے میں دوردرشن ہندوستان کا واحد ٹی وی چینل تھا، لہٰذا دوردرشن کی نشریات کو پورے ملک میں خصوصی دلچسپی سے دیکھا اور سنا جاتا تھا۔

ن ع ن: بسنت بہار کے بعد آپ نے اور بھی دستاویزی فلمیں بنائی ہوں گی، ان کے بارے میں بھی کچھ بتائیے؟

صادق: بسنت بہار کی اسکرپٹ لکھنے کے بعد مجھے یہ تجربہ ہوا کہ پہلے اسکرپٹ لکھ کر پھر اس کی شوٹنگ کی جائے تو پروڈیوسر کو بہت زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں، اور دوردرشن سے بہت بڑی رقم نہیں ملتی، لہٰذا میں نے اپنے طریقہ کار پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی اور پھر نیا طریقہ اختیار کیا۔

ن ع ن: یہ نیا طریقہ کیا تھا؟ وہ بھی بتا دیجیے؟

صادق: میں نے جو نیا طریقہ اختیار کیا تھا اس کے لیے خود مجھے بھی شوٹنگ کے کام میں شامل ہونا پڑا۔

ن ع ن: کیا مطلب؟

صادق: مطلب یہ کہ سنیما گرافرس کے مالک اشوک راول سے ڈاکیومینٹری کی شوٹنگ کے لیے ایک کیمرہ مین اور دو تین معاون لے کر شوٹنگ کے لیے نکل جاتا۔ پہلے مختلف مناظر اور متعلقہ چیزیں، انٹرویو، اور متعلقہ لوگوں کے لیے بیانات وغیرہ کی شوٹنگ کر لیتا تھا اور پھر سنیما گرافرس کی ایڈیٹنگ یونٹ کے ساتھ بیٹھ کر اسکرپٹ لکھتا اور اس کی ایڈیٹنگ کراتا جاتا تھا۔ یہ طریقہ مجھے بہت اچھا لگا اور سنیما گرافرس کے مالک کو بھی سودمند نظر آیا۔

ن ع ن: آپ نے کتنی ڈاکیومینٹری فلمیں بنائیں؟

صادق: ان کی صحیح تعداد تو مجھے یاد نہیں، لیکن کثیر تعداد میں بنائیں، ہاں، اتنا ضرور یاد ہے کہ اس سلسلے کی ایک اور مقبول ڈاکیومینٹری جو راون بنانے والوں سے متعلق تھی۔ دشہرہ کے موقع پر ہر سال دہلی کے مختلف علاقوں میں راون کے پتلے جلائے جاتے تھے۔ یہ پتلے لکڑی اور کاغذ سے بنائے جاتے تھے، جن کے درمیان پٹاخے وغیرہ بھی لگائے جاتے تھے، جن کی وجہ سے جلانے کے موقع پر دھماکہ ہوا کرتا تھا جسے سن کر لوگ خوش ہوتے تھے۔

میں ان دنوں وکاس پوری میں رہا کرتا تھا اور راستے میں ٹیگور گارڈن سے گزرتے ہوئے سڑک کے ایک کونے

پر راون بنانے والے ایک بوڑھے آدمی کی دکان تھی، جسے آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ کیوں نہ اسی پر ایک ڈاکیومینٹری فلم بنائی جائے۔ لہٰذا ایک دن میں ٹیگور گارڈن پہنچا اور اس دکان پر بیٹھے ہوئے بوڑھے سے بات چیت کی۔ پتہ چلا کہ راون والا بابا مسلمان ہے اور بیس بائیس برسوں سے راون بنانے کا کام کرتا ہے۔ راون والے بابا نے یہ بھی بتایا کہ اسی کے بنائے ہوئے راون پوری دہلی میں سپلائی کیے جاتے اور جلائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کا یہ کام سیزنل ہے، بقیہ دنوں میں وہ کوئی اور کام کرتا ہے۔ دشہرہ آنے سے پہلے وہ راون بنانے کے لیے کئی لوگوں کو ہائر کرلیتا اور بڑھتی ہوئی ڈیمانڈس پوری کرتا ہے۔ بابا کے شاگردوں میں سلطان سنگھ نامی ایک نوجوان بھی تھا جو بابا کا بڑا چہیتا تھا اور اس کے کاموں کو سنبھالتا بھی تھا۔ لہٰذا میں نے ایک بار دشہرہ کے موقع پر راون والے بابا پر ایک ڈاکیومینٹری فلم بنائی جس میں راونوں کو بنانے کا پورا پروسیس بھی دکھایا گیا تھا۔ بابا نے مجھے بتایا کہ یہ سیزنل کام ہے، لیکن میں پورے سال کی کمائی اسی سیزن میں کرلیتا ہوں۔ بابا کے شاگرد سلطان سنگھ نے بتایا کہ ایک بار دشہرہ کے موقع پر جب راون تیار کیے جاچکے تھے تو اچانک زوردار بارش ہوگئی جس کی وجہ سے سارے راون تباہ و برباد ہوگئے۔ اس سال بابا کو بہت بڑا خسارہ ہوا تھا، جسے وہ برسوں تک نہیں بھلا پائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ راونوں کو بارش سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ راون بہت بڑے بڑے ہوتے تھے اور مختلف حصوں میں بنائے جاتے تھے اور قریبی پارکوں میں اور سڑکوں پر راون کے جسم کے حصے رکھ دیے جاتے تھے۔ سر کہیں، پیر کہیں، بازو کہیں، سینہ کہیں اور کمر کہیں، اور لوگ اسی شکل میں خرید کر راون کے جسم کے مختلف حصوں کو ٹرکوں میں لدوا کر لے جاتے تھے اور جہاں اسے جلانا ہوتا تھا وہاں ان سارے حصوں کو جوڑ کر ایک بہت اونچا راون تیار کردیا جاتا تھا۔ یہ ڈاکیومینٹری فلم ملک کے طول و عرض میں بڑی دلچسپی سے دیکھی گئی۔

ن ع ن: راون بنانے والوں کے علاوہ کچھ اور لوگوں پر بھی تو آپ نے ڈاکیومینٹری فلمیں بنائی ہوں گی۔

صادق: اس سلسلے کی ایک بیحد مفید اور یادگار ڈاکیومینٹری فلم میں نے سانپوں پر بنائی تھی۔

ن ع ن: سانپوں پر! وہ کیسے؟

صادق: ہوا یہ کہ ایک بار میں اپنے ہوم ٹاؤن گیا ہوا تھا، وہاں ایک دن کسی دوست کے ساتھ 'کالیا دہ محل' جانے کا اتفاق ہوا۔ محل کے قریب ہی ایک روڈ سائڈ چائے خانے کی بینچ پر اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا کہ اتنے میں وہاں ایک نوجوان آیا۔ یہ نوجوان بیس بائیس برس کا ہوگا۔ سر پر رنگین صافہ، کالی جیکٹ جس کے بٹن آگے سے کھلے ہوئے تھے اور جسم نظر آرہا تھا۔ ایک میلی کچیلی پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے کاندھے پر دائیں طرف ایک جھولا لٹک رہا تھا جس میں سانپوں کی پٹاری تھی، اس لڑکے کے ہاتھ میں بھی ایک سانپ تھا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس گیا اور پھر اس سے بات چیت شروع کردی، اس کا نام گلاب ناتھ تھا اور وہ کالیا دہ محل اور بھیرو گڑھ کے درمیان واقع ایک چھوٹے سے گاؤں کالو ہیڑی کا رہنے والا تھا۔ کالو ہیڑی کے نام سے میں واقف تھا۔ کالو ہیڑی سپیروں کا گاؤں تھا۔ گلاب ناتھ سے باتیں کرتے ہوئے میں نے سانپوں اور ان کی مختلف قسموں کے بارے میں چند سوالات کیے۔ جن کے جوابات گلاب ناتھ اپنی معلومات کے مطابق دیتا رہا۔ وہ عام سپیروں کی طرح گپیں نہیں ہانک رہا ہے، بلکہ صحیح معلومات دے رہا ہے۔

ن ع ن: آپ کو اس بات کا اندازہ کیسے ہوا کہ وہ صحیح معلومات دے رہا ہے؟ کیا سانپوں سے متعلق آپ کو بھی جانکاری تھی؟

صادق: اس کا بھی ایک قصہ ہے۔ جب میں ناندیڑ کے پیوپلس کالج میں لیکچرر تھا اسی زمانے میں حسن اتفاق اور کالج سوسائٹی کی مہربانی سے مجھے رہنے کے لیے کالج کیمپس ہی میں ایک بنگلہ مل گیا جس میں پہلے کالج کے پرنسپل رہا کرتے تھے، اپنا ذاتی مکان بنوالینے کے بعد وہ اس میں منتقل ہوگئے تھے، بنگلہ خالی ہوگیا تھا۔ کالج سوسائٹی کے سکریٹری کی مہربانی سے وہ بنگلہ مجھے رہنے کے لیے مل گیا۔ میں بہت خوشی خوشی اس میں منتقل ہوگیا۔ لیکن وہاں منتقل ہونے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس علاقے میں اکثر سانپ نکلتے رہتے ہیں لیکن زہریلے نہیں ہوتے۔ میں نے سائنس کالج کی لائبریری جاکر سانپوں سے متعلق جو دو تین کتابیں وہاں موجود تھیں، انھیں پڑھا۔ سانپوں کی تصویریں بھی دیکھیں، زہریلے اور غیر زہریلے سانپوں کو پہچاننے کی جانکاری بھی حاصل کی۔ اس طرح سانپوں سے متعلق مجھے خاصی معلومات تھیں۔

ن ع ن: ان کے علاوہ کن کن موضوعات پر آپ نے دستاویزی فلمیں بنائیں؟ چند یادگار فلموں کے بارے میں بھی بتائیے؟

صادق: مرزا غالب کے یوم ولادت اور یوم وفات پر میں نے دو الگ الگ ڈاکومینٹری فلمیں بنائی تھیں، جن کے ذریعے اردو کے اس عظیم شاعر کو دوسری ہندوستانی زبانوں کے قارئین اور شائقین تک پہنچانے کا کام کیا تھا۔ علاوہ ازیں 'قلم کا سلطان' عنوان سے ایک ڈاکومینٹری معروف خطاط خلیق ٹونکی پر بنائی تھی۔ ایک ڈاکومینٹری پنواڑی ساہتیہ کار عنوان سے لکشمن راؤ نامی ایک پنواڑی پر بنائی تھی، جو افسانے لکھتا تھا اور انگریزی کے اخبار ٹائمس کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا تھا۔ اجین شہر پر ایک ڈاکومینٹری 'پراکتھاؤں کی نگری'' عنوان سے بنائی تھی اسی طرح اور بھی کئی دلچسپ دستاویزی فلمیں بنائی تھیں جن کے عنوانات اب مجھے یاد نہیں رہے۔

ن ع ن: دوردرشن کے لیے آپ نے ایک سیریل بھی تو بنایا ہے؟

صادق: جی ہاں، 2014 میں انداز شاعرانہ عنوان سے اردو کے تیرہ مشہور شاعروں پر آدھے آدھے گھنٹے کے تیرہ ایپی سوڈ بنائے تھے جواب بھی گاہے بگاہے دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں اور یوٹیوب پر موجود ہیں۔ ان میں امیر خسرو، ولی دکنی، محمد تقی میر، مرزا غالب، مومن وغیرہ سے لے کر فراق گورکھپوری اور مجاز لکھنوی تک چند اہم شاعروں کی زندگی اور شاعری کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ میں نے یہ تمام ایپی سوڈ منفرد طور پر بنانے کی کوشش کی ہے۔

ن ع ن: کیا مطلب؟

صادق: مطلب یہ کہ ان کے لیے میں ڈاکیوڈرامہ ٹیکنک استعمال کی تھی، جن میں ڈاکیومینٹری اور ڈراما دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔

ن ع ن: آپ نے پہلے آل انڈیا ریڈیو کے لیے بھی تو کچھ کام کیے تھے؟

صادق: جی ہاں، ان میں سب سے بڑا اور یادگار کام ایک ریڈیو سیریل کا تھا۔ یہ ریڈیو سیریل 'یہ بھی خوب رہی' عنوان سے ہر سنیچر کی شام ہندوستان بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے 12 زبانوں میں نشر کیا جاتا تھا۔

ن ع ن: بارہ زبانوں میں! کیا آپ اتنی زبانیں جانتے ہیں؟

صادق: ہوتا یہ تھا کہ بنیادی اسکرپٹ میں ہندی زبان میں لکھتا تھا، جسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانے کے بعد ان زبانوں کے ریڈیو فنکاروں کے ساتھ ریکارڈ کرلیا جاتا تھا اور پورے ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کیا جاتا تھا۔

ن ع ن: کیا ابھی بھی آپ ریڈیو کے لیے کچھ لکھتے ہیں؟

صادق: وقت کے ساتھ ساتھ بہت ساری چیزیں بدل جاتی ہیں۔ اب یہ سلسلہ ختم ہوچکا ہے۔ اب میں صرف ادبی کاموں میں مصروف ہوں اور اپنے ادھورے کام پورے کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

ن ع ن: صادق صاحب آپ نے انٹرویو کے لیے مجھے وقت دیا اور قارئین کے لیے بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں بتائیں، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔

■

Mohd Naushad Alam Nadvi
E-167/1, 4th Floor, Shaheenbagh
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی تحقیقات عالیہ

سجاد احمد صوفی

جموں وکشمیر ہمیشہ علم وادب کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ یہ وادی جس طرح حسین اور خوبصورت ہے ٹھیک اسی طرح یہاں کے ادیبوں کے قلم سے حسین اور دل کش تحریریں ابھرتی ہیں۔ برصغیر میں اردو کے محققوں اور مفکروں میں شمار کیے جانے والے محقق پروفیسر اکبر حیدری کشمیری اسی خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ جموں وکشمیر کے جن اردو ادیبوں کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ان میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ وہ صرف محقق ہی نہیں، بلکہ ادیب، قلمکار، تذکرہ نویس، نقاد، مولف، استاد اور ادبی صحافت میں اپنے ان گنت نقوش مرتسم کرنے والے شخص تھے۔ میدانِ تحقیق میں ان کی شہرت کے حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اکبر حیدری کی موت اردو میں تحقیق کی موت ہے۔ قاضی عبدالودود، عرشی رام پوری، مالک رام، جعفر علی خان اثر اور مشفق خواجہ کے بعد اگر جمیل جالبی کا نام نامی الگ کر دیں تو اکبر حیدری کے سوا کس کا نام لیا جائے کہ جس نے اردو میں تحقیق کی آبرو بچائے رکھی ہو۔''

(شیرازہ، گوشہ پروفیسر اکبر حیدری، مضمون 'اردو تحقیق کی روشن شمع' از پروفیسر احمد قدوس جاوید، ص 30)

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انھوں نے اپنی مسلسل محنت اور لگن سے اردو کے کلاسیکی ادبی سرمائے کی تحقیق میں نمایاں اضافے کیے ہیں، جس میں میر تقی میر، میر ببر علی انیس، مرزا سلامت علی دبیر، مرزا اسداللہ خان غالب، علامہ سر محمد اقبال اور اسی پائے کی شخصیات کی حیات اور کارناموں کے کتنے ہی پوشیدہ گوشوں کو واضح کیا۔ اکبر حیدری کشمیری کی کلاسیکی اردو ادب پر خاص نظر تھی اور ان کی توجہ سے بہت سا ادبی سرمایہ وقت کی گرد کے نیچے دفن ہونے سے بچ گیا، جس سے آنے والی نسلوں کے لیے انھوں نے فکر و تحقیق کا سامان فراہم کیا۔ تحقیق، تصنیف و تالیف میں وہ اعلا معیار کے قائل تھے۔ وہ جو بھی تحقیقی بات کرتے اسے ٹھوس شواہد سے ثابت کرتے ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری بحیثیت محقق اپنی تحقیق کے موضوعات کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق محض مردہ پروری نہیں ہوتی۔ کیونکہ تحقیقی شعور رکھنے والا محقق اپنی ہر بات دلیل اور شہادت کی بنیاد پر رکھتا ہے۔ محقق کا کام جہاں ایک طرف کسی موضوع سے متعلق اصلیت کو پیش کرنا ہے وہیں اس موضوع سے متعلق غلط بیانیوں کو رد کرنا بھی اور اصل حقیقت کو پیش کرنا بھی ہے۔ اکبر حیدری نہ صرف موضوعات کی اصلیت کا پتہ لگا کر انھیں منظر عام پر لاتے ہیں۔ بلکہ عام طور پر محققین کی غلطیوں کی تردید کرکے ان کا متبادل بھی پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں شاید عصر حاضر میں اردو کے ایسے محقق کم ہی ملیں گے۔ تحقیق کے دوران انھیں اپنے آپ کا بھی پتہ نہیں رہتا اتنے گہرے مطالعے اور مطالعے کی چاشنی میں گم ہو جاتے تھے کہ وقت کی خبر نہیں رہتی، اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''رام پور کی رضا لائبریری میں انھیں پتہ ہی نہ چلا کہ دن کب گزرا۔ رات کب ہوئی۔ وہ مصروف مطالعہ رہے جب کہ چوکیدار نے لائبریری کو مقفل کیا تھا اور اگلے دن موصوف کو مصروف مطالعہ پا کر بتایا کہ 'جناب آپ رات بھر پڑھتے رہے ہیں'!''

(شیرازہ، گوشہ پروفیسر اکبر حیدری، مضمون 'اک شمع تھی دلیل سحر' از ناصر مرزا، ص 43)

اکبر حیدری کی بے مثل محنت کے پیش نظر ہی نورالحسن ہاشمی نے ان کو 'تحقیق کا بھوت' کہا ہے۔ اور ڈاکٹر شبیہ الحسن اور ڈاکٹر نیر مسعود نے 'فنافی التحقیق' بھی کہا ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے اگر کسی صنف میں زیادہ تحقیقی کام کیا ہے تو وہ اردو مرثیہ ہے۔ مرثیہ نگاری میں انھوں نے بہت سارے مرثیہ نگاروں کے غیر مطبوعہ کلام کا انکشاف ہے گرچہ مرثیہ کی تحقیق کے ضمن میں یوں تو کئی محققین کے نام آتے ہیں۔ جن میں مسعود حسن خان رضوی ادیب، پروفیسر شبیہ الحسن، ڈاکٹر نیر مسعود، محمد زماں آزردہ اور کاظم علی خان وغیرہ شامل ہیں لیکن ان تمام محققوں کے ساتھ ساتھ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں پر بہت اچھا کام اکبر حیدری نے بھی کیا ہے۔ ان کی کئی تصنیفات ایسی ہیں جس میں مرثیے، مرثیہ کے ارتقا اور گمنام مرثیہ نگاروں کے بارے میں قیمتی خیالات اور نادر تحقیقی انکشافات ملتے ہیں۔ چند کتابیں درج ذیل ہیں:

میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا، باقیات انیس، مراثی میر خلیق، منظومات دلگیر، انتخاب مراثی دبیر، انیس کی منظر نگاری، باقیات دبیر، مرثیہ اصلاحی معنی میں، میر ضمیر لکھنوی

پروفیسر اکبر حیدری کا دوسرا خاص موضوع اقبالیات رہا ہے۔ اس میں بھی انھوں نے اہم کتابوں کا اضافہ کیا ہے جیسے اقبال: نادر معلومات، اقبالیات کے نئے گوشے، اقبال اور علامہ شیخ زنجانی، اقبال کی صحت زبان، کلام اقبال قدیم رسالوں کے آئینے میں، زمانہ کانپور اور اقبالیات، اقبال: احباب وآثار، معنی ذبح عظیم: اقبال کا شعر

یہ کتابیں اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہیں اور علامہ اقبال کے پوشیدہ خزانوں کا عکس بھی ہیں۔ اکبر حیدری نے رسالہ 'حکیم الامت' نکالا جس میں اقبال پر زیادہ مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اکبر حیدری نے مرزا غالب پر بھی کچھ تحقیقی مقالے قلم بند کیے ہیں۔ ان کتابوں کو انعام کے ساتھ ساتھ قدر کی نگاہوں سے بھی دیکھا جاتا ہے ان میں 'نوادر غالب' اور 'غالبیات' کے نام شامل ہیں۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے دیوان، تذکرے اور شخصیتوں پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ ان میں دیوان میرتقی میر، دیوان ذوق، دیوان قائم، دیوان ترقی وغیرہ ہیں۔ تذکروں میں تذکرۂ بہار بے خزاں، تذکرۂ شعرائے ہندی، تذکرۂ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویاں، تذکرۂ قدیم شاعرات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہاں پر ہم صرف پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی ایک تحقیقی کتاب 'مقالات حیدری' پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ کہ ان کی تحقیق کس حد تک منفرد و مستند ہے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ان کی تحقیق میں امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اس کتاب میں شامل مقالات سب کے سب تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ آیئے اس کتاب پر نظر ڈالتے ہیں۔

مقالات حیدری

'مقالات حیدری' فروری 1977 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو نظامی پریس لکھنؤ نے شائع کیا۔ اکبر حیدری نے اس کتاب کو مرحوم راجہ صاحب محمد امیر احمد خان سے منسوب کیا ہے۔ 'مقالات حیدری' سات تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے اس تحقیقی کام کے لیے اکبر حیدری کو راجہ صاحب محمود آباد کے نادرالوجود کتب خانے سے کئی برسوں تک استفادہ کرنا پڑا۔ اس کتاب میں جو مقالات درج ہیں وہ اس طرح سے ہیں۔

1 **دیوان میر کا قدیم ترین مخطوطہ: (مع میر کے گمشدہ غیر مطبوعہ اشعار)**

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں دیوان میر کے کئی نادر و نایاب اور کارآمد نسخے موجود ہیں ان ہی نسخوں میں سے ایک نسخہ قدیم ترین ہے جو 1213ھ مطابق 1786 میں میر سوز کے شاگرد موتی لال حیف کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے۔ اس کے سنہ کتابت کے بعد میر 22 سال تک زندہ رہے۔ اکبر حیدری کہتے ہیں کہ دیوان کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں سیکڑوں غیر مطبوعہ اشعار درج ہیں۔ جس سے میر کے حزن ویاس، درد وغم کا پتہ چلتا ہے۔

اکبر حیدری نے اس مقالے میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی درج کیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی بھی جانکاری دی ہے کہ ان اشعار کو کلیات میر میں کہاں درج ہونا چاہیے تھا۔ اس نسخے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں میر کی مشہور مثنوی 'مورنامہ' بھی موجود ہے۔ یہ مثنوی نسخۂ کلکتہ (1811)، نسخۂ نول کشور (1868) اور نسخۂ آسی (1940) کے نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے 'کلیات میر' کو 1958 میں شائع کیا جس میں یہ مثنوی موجود ہے۔ اکبر حیدری کا دعوا ہے کہ یہ مثنوی پروفیسر گیان چند جین کو حیدرآباد میں کلیات میر کے ایک نسخے میں ملی اور انھوں نے اسے 1957 میں رسالے میں شائع کیا۔ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسی مثنوی کو 'کلیات میر' میں شامل کر کے شائع کیا۔ اکبر حیدری کا ماننا ہے کہ ان دونوں نے یہ مثنوی غلط متن کے ساتھ چھاپی ہے۔ اس حوالے سے اکبر حیدری کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں میر کے دیوان پنجم کا ایک نادر اور نایاب قلمی نسخہ ہے۔ یہ مطبوعہ دیوان پنجم سے مختلف ہے۔ اس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی درج ہے۔ دیوان میں مثنوی مورنامہ بھی ہے۔ یہ مثنوی نسخۂ کلکتہ، نسخۂ نول کشور اور نسخۂ آسی میں شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر جین صاحب کو یہ مثنوی حیدرآباد میں کلیات میر کے ایک نسخے میں دستیاب ہوئی ہے۔ انھوں نے اسے اردو ادب مطبوعہ، جون 1957 میں شائع کیا۔ اس کے ایک سال بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے کلیات میر میں شامل کر کے شائع کیا۔ دونوں حضرات نے یہ مثنوی غلط چھاپی ہے۔ غالباً جین صاحب کے پیش نظر خط شکستہ میں کوئی ناقص نسخہ رہا ہوگا۔ راقم کو اس مثنوی کا بالکل صحیح اور خوشخط نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ کیونکہ یہ مثنوی بہت عمدہ، سبق آموز اور مزاج میر کا آئینہ دار ہے اس لیے یہ صحت کے ساتھ پہلی مرتبہ شائع کی جاتی ہے۔''

مذکورہ اقتباس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر کی مثنوی 'مورنامہ' صحیح متن کے ساتھ اکبر حیدری کی ہی تحقیق ہے۔ لیکن اکبر حیدری نے جو پروفیسر گیان چند جین کے حوالے سے کہا کہ انھیں یہ نسخہ حیدرآباد میں ملا ہوگا یہ غلط ہے کیوں کہ گیان چند جین نے اپنی کتاب 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' میں لکھا ہے کہ یہ مخطوطہ کلیات میر اسٹیٹ لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ (ص 229) اکبر حیدری نے اس مقالے میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آسی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ظل عباس عباسی نے یہ غلط کہا ہے کہ ان کے پیش نظر نسخۂ کلکتہ تھا کیوں کہ نسخۂ کلکتہ نایاب ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مقدمہ کلیات میر میں جو غلط بیانی سے کام لیا ہے ان کا کہنا حقیقت سے کوسوں دور ہے کہ انھوں نے حیدرآباد، علی گڑھ، رام پور اور محمود آباد کے کتب خانوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان دونوں نے کلیات میر کو نسخۂ آسی کی بنیاد پر مرتبہ کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''دراصل مرتبین نے کلیات میر کو نسخۂ آسی کی بنیاد پر بغیر کسی محنت و تحقیق کے نقل راجہ عقل کے طور پر جوں کا توں شائع کیا ہے۔ ان کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ انھوں نے نسخۂ کلکتہ سے استفادہ کیا ہے۔ اگر ان لوگوں نے نسخۂ آسی کے علاوہ اور کوئی قلمی نسخہ دیکھنے کی زحمت کی ہوتی کم از کم فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ درج کرتے۔''

پروفیسر اکبرحیدری کشمیری نے دیوان، تذکرے اور شخصیتوں پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ ان میں دیوان میرتقی میر، دیوان ذوق، دیوان قائم، دیوان ترقی وغیرہ ہیں۔ تذکروں میں تذکرۂ بہار بے خزاں، تذکرۂ شعرائے ہندی، تذکرۂ گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویاں، تذکرۂ قدیم شاعرات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ نسخۂ محمود آباد وہی دیوان ہے جس پر میر کو بڑا فخر تھا اور جس کے بارے میں میر نے پیش گوئی کے طور پر یہ شعر کہا تھا:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اکبر حیدری کے زیر نظر نسخۂ کلکتہ بھی رہا ہے۔ جس سے انھوں نے اس مقالے کے لیے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نسخۂ کلکتہ میں میر کا سارا کلام موجود نہیں ہے۔ جب انھوں نے نسخۂ کلکتہ کو نسخۂ محمود آباد کے نسخے سے ملایا تو معلوم ہوا کہ بعض غزلوں کی تعداد اشعار میں نمایاں فرق ہے یعنی نسخۂ کلکتہ اور دیگر مطبوعہ نسخوں میں تعداد کم اور نسخۂ محمود آباد میں زیادہ ہے۔

میرتقی میر کے کلام کے بارے میں اکبر حیدری نے لکھا ہے کہ عام مشہور ہے کہ میرتقی میر کے کلام میں بہتر نشتر ہیں لیکن اکبر حیدری کا ماننا ہے کہ کلیات میر میں

صرف بہتر (72) نشتر کا تعین کرنا میر کے ساتھ ناانصافی ہے کیونکہ نسخۂ محمود آباد میں میر کے سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں سے ایک ایک شعر نشتر سے تیز تر ہے اور یہ سب اشعار غیر مطبوعہ ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنی کتاب میں کچھ اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ دوسری بات نسخۂ کلکتہ میں مثنوی 'جنگ نامہ' بھی موجود نہیں ہے۔

نسخۂ محمود آباد میں بہت سارے اشعار غیر مطبوعہ موجود ہیں جو میر کے مزاج اور افتادِ طبع کے آئینہ دار ہیں۔ اکبر حیدری نے ہر غزل کے فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ کے علاوہ ان تمام غیر مطبوعہ اشعار کی نشاندہی کی جو پہلی مرتبہ دریافت کیے گئے ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں اگر کسی شعر کے متن میں اغلاط ہیں تو فٹ نوٹ میں اس کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اکبر حیدری نے نسخۂ محمود آباد کو میر کا قدیم نسخہ بھی دلائل سے ثابت کر دیا ہے جو میر کی حیات میں لکھا گیا نسخہ ہے۔

مختصراً اکبر حیدری کی اس تحقیق سے ایک تو میر تقی میر کا غیر مطبوعہ کلام سامنے آیا۔ دوسری بات جن مرتبین نے کلیات میر کو شائع کیا ان کی غلط بیانی کا ازالہ ہوا اور مثنوی مور نامہ کا صحیح متن بھی سامنے آیا۔ یہ ساری باتیں اکبر حیدری کی تحقیق سے وجود میں آئی۔

2 کلیات میر حسن کا قدیم ترین مخطوطہ مکتوبہ بہ قبل 1192ھ اور میر حسن کا غیر مطبوعہ کلام

کلیات میر حسن کا قدیم ترین نسخہ موتی محل کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس نسخے کو فیض آباد میں 1192ھ میں کسی کاتب نے لکھا تھا۔ اکبر حیدری نے جو مخطوطہ محمود آباد کتب خانے میں دیکھا ہے وہ موتی محل کے نسخے سے بھی پہلے 1183ھ میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے نسخۂ موتی محل کے حوالے سے کہا کہ اس میں جو تین مثنوی رموز العارفین (1188ھ)، گلزار ارم (1192ھ)، سحرالبیان (1199ھ) ہیں وہ نسخۂ محمود آباد میں درج نہیں ہیں۔ نسخۂ محمود آباد میں غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ دو مثنویاں ہیں ایک مثنوی قصر جواہر اور دوسری مثنوی در کتخدائی (شادی) نواب آصف الدولہ بہادر ہے۔ قصر جواہر کا سال تصنیف معلوم نہیں ہو سکا لیکن دوسری مثنوی آصف الدولہ بہادر کی شادی کے موقعے پر 1183ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ آصف الدولہ بہادر کی شادی کی تاریخ اودھ کی تاریخوں سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ آصف الدولہ کی شادی اسی سال ہوئی تھی۔

گلزار ارم اور سحرالبیان میر حسن کے بعض نسخوں میں درج ہیں۔ ان میں دیباچہ مصنف بھی شامل ہے۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ کلیات میر حسن نسخۂ محمود آباد 1192ھ سے قبل کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ اس میں دیباچہ مصنف موجود نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میر حسن نے مثنوی قصر جواہر 1192ھ سے پہلے ہی فیض آباد میں تصنیف کی تھی۔ یعنی اس مثنوی (قصر جواہر) کا زیر نظر نسخے میں شامل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مصنف نے اسے فیض آباد میں لکھنؤ جانے سے پہلے ہی تصنیف کیا تھا۔ کلیات میر حسن کے کئی نسخے ہندستان اور باہر کے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

کلیات میر حسن کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ ایک نسخہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔ یہ نسخہ پہلے نواب حبیب الرحمن خان شروانی صدر یار جنگ کی ملکیت میں تھا۔ ایک نسخہ لکھنؤ میں خاندان انیس کے ایک فرد میر محمد ہادی لائق کے پاس موجود ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے اسی نسخے سے استفادہ کیا اور کلیات میر حسن پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے۔

جو نسخہ کلیات میر حسن کا محمود آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس میں نہ کاتب کا نام اور نہ ترقیمہ کہیں درج ہے۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ جہاں تک معلوم ہوتا ہے کلیات کا یہ نسخہ بہت پرانا ہے اور فیض آباد میں 1192ھ سے پہلے مصنف نے خود ہی مرتب کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔

3 کلیات انشا: دو نادر نسخے مع انشا کا غیر مطبوعہ کلام

کلیات انشا کے چند مخطوطے رام پور، علی گڑھ، پٹنہ اور حیدر آباد کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے۔ کلیات انشا کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ جو ہے وہ مولوی محمد حسین آزاد کے اہتمام سے 1671ھ مطابق 1855 میں دہلی اردو اخبار میں چھپا تھا۔ اس کے بعد دوسرا ایڈیشن 1293ھ مطابق 1876 میں لکھنؤ نول کشور میں شائع ہوا۔ پھر 1312ھ مطابق 1894 لکھنؤ میں، آخر میں مرزا محمد عسکری نے 1951 میں 'کلام انشا' کے عنوان سے بڑی کاوش و محنت سے مختلف قلمی و مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا جسے ہندستانی اکادمی الہ آباد نے 1952 میں شائع کیا۔

جہاں تک محمود آباد کتب خانے کا تعلق ہے اکبر حیدری کا کہنا ہے کہ محمود آباد کتب خانے میں کلیات انشا کے دو قدیم اور نادر الوجود مخطوطے اچھی حالت میں موجود ہیں۔ دونوں نسخے اہم اور مکمل ہیں اہم اس لیے کہ ان میں انشا کا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔

کتب خانہ محمود آباد میں کلیات انشا کا نسخۂ اول 1242ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس نسخے میں پہلے انشا کا فارسی کلام ہے ایک مثنوی 'شیر برنج' کے نام سے درج ہے۔ یہ مثنوی 1205ھ میں تصنیف کی گئی ہے پھر قصائد ہیں اور فارسی اور اردو میں کہی گئی رباعیاں بھی درج ہیں رباعیوں کے بعد کچھ تاریخیں بھی موجود ہیں۔ نیز فارسی میں نواب سعادت علی خان کی تعریف میں مثنوی 'شکار نامہ' بھی درج ہے جو 1220ھ میں تصنیف کی گئی تھی۔ نسخۂ ثانی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مصنف کے مسودہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اسی کتب خانے میں 'مثنوی شیر برنج' بھی ہے جو مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہے۔ اکبر حیدری نے انشا کا غیر مطبوعہ کلام بھی اس کتاب میں درج کیا ہے۔

کلیات انشا کے قدیم نسخے میں مثنوی 'مرغ نامہ' کے چھیالیس شعر درج ہیں۔ 'کلام انشا' میں مرزا حسن عسکری نے بیالیس شعر نقل کیے ہیں۔ جب کہ اکبر حیدری کہتے ہیں کہ نسخۂ محمود آباد میں دو سو انتالیس (239) شعر موجود ہیں۔ دوسری بات پروفیسر گیان چند جین کی رائے ہے کہ انشا کی طویل ترین اور مفصل مثنوی 'فیل' ہے لیکن اکبر حیدری کا کہنا ہے کہ جو محمود آباد کے 'کلیات انشا' کا نسخہ ہے اس کے مطابق 'مرغ نامہ' طویل ترین مثنوی ہے۔ بقول اسپرنگر یہ مثنوی 1210ھ میں تصنیف کی گئی ہے۔ اکبر حیدری کہتے ہیں کہ انشا کی تمام مثنویوں میں بس صرف یہی ایک مثنوی ہے جو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے لگ بھگ ایک سو پچانوے شعر غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ پوری مثنوی اکبر حیدری نے اپنی اس کتاب میں شامل کی ہے۔

4 ناسخ اور کلیات ناسخ: مع غیر مطبوعہ کلام

دیوان ناسخ کے تین مخطوطے لکھنؤ یونی ورسٹی میں موجود ہیں۔ کچھ محقق دیوان ناسخ کی پہلی اشاعت 1262ھ کہتے ہیں۔ دراصل پہلی مرتبہ دیوان ناسخ 404 صفحات پر مشتمل ناسخ کے مشہور شاگرد رشک لکھنوی کی نگرانی میں 1258ھ میں شائع ہوا۔ اس دیوان میں رشک کا مرتب کیا ہوا غلط نامہ بھی موجود ہے۔ دیوان کے صفحہ 399 پر ناسخ کی وفات درج ہے۔ لیکن اکبر حیدری کا دعوا ہے کہ جو نسخہ ان کو ملا ہے وہ اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اکبر حیدری نے اس مقالے میں ناسخ کے حالات زندگی تفصیل سے معتبر ذرائع سے اخذ کر کے قلم بند کیے ہیں۔ ان کی نظروں سے بہت سے نسخے گزرے ہیں۔ جن میں سے نسخۂ محمود آباد سب سے پرانا اور مستند مخطوطہ ہے۔ جس کی کتابت 1239ھ سے پہلے کی گئی ہے۔ جس میں 1238ھ تک ناسخ کا کلام درج ہے۔ اکبر حیدری کہتے ہیں کہ اس دیوان میں ناسخ کے مشہور شاگرد نواب حسین علی خان تخلص اثر کی مہریں موجود ہیں اور ان میں 1244ھ کی تاریخ نمایاں ہے۔ دیوان بڑا ہی دیدہ زیب اور شاندار خط میں لکھا گیا ہے۔ اس میں 1238ھ تک کی اہم تاریخیں بھی درج ہیں۔ جو مطبوعہ نسخوں میں موجود نہیں ہیں۔ اس نسخے میں ناسخ کا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے اس کے علاوہ دیوان ناسخ

کے مطبوعہ نسخے 1258ھ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نسخۂ محمود آباد کا تیسرا مخطوطہ ناقص الطرفین ہے۔ اکبر حیدری نے نسخوں کا سائز اور دوسری جانکاری بھی اس کتاب میں دی ہے۔

5 شاہ نامہ فردوسی کا قدیم ترین مخطوطہ: نسخۂ بایُسنغر مکتوبہ 868ھ

شاہ نامہ فردوسی پہلی مرتبہ کلکتہ سے قدیم اور مستند نسخوں سے مرتب کیا گیا۔ یہ کپتان ترنرمکان نے 1245ھ مطابق 1829 میں مولوی سعید رام پوری کے اہتمام سے چار جلدوں میں شائع کی تھی۔ ابتدا میں دیباچہ بایُسنغر بھی شامل ہے۔ اس میں محمود غزنوی کے خلاف 105 ہجو یہ اشعار بھی درج ہیں۔ کتاب شاہ نامہ فردوسی دوسری مرتب 1275ھ مطابق 1858 میں بمبئی میں تین جلدوں میں چھپی تھی۔ اس میں دیباچہ بایُسنغر کے علاوہ دیباچہ مطیع محمد ابراہیم الطباطبائی الاصفہانی کا لکھا ہوا بھی شامل ہے۔

اکبر حیدری کو کتب خانہ محمود آباد میں 'شاہ نامہ فردوسی' کا قدیم ترین مخطوطہ نسخۂ بایُسنغر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ نسخہ مرزا شاہ رخ کے بیٹے اور صاحب قرآن امیر تیمور کے پوتے مرزا بایُسنغر نے 868ھ مطابق 1425 اپنے درباری شعرا سے متعدد نسخوں سے تصحیح کرا کے مرتب کرایا تھا اور بایُسنغر نے اس پر ایک مبسوط اور معلوماتی دیباچہ بھی لکھوایا تھا۔ ابتدا میں شاہ نامہ کا دیباچۂ قدیم سال تصنیف 346ھ مطابق 957ء بھی درج ہے۔

اکبر حیدری نے کل چار قلمی نسخے دیکھے۔ دو نسخے محمود آباد کتب خانے میں اور دو ریاست جموں وکشمیر کے محکمۂ ریسرچ سری نگر میں۔ ان میں سے وہ مخطوطہ قدیم ترین ہے جو مرزا بایُسنغر 828ھ مطابق 1425 کا ہے۔ یہ مخطوطہ جو اب نسخۂ بایُسنغر کے نام سے راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کتب خانے میں اس کا دوسرا نسخہ بھی 963ھ کا مکتوبہ موجود ہے۔ اکبر حیدری کی تحقیق کے مطابق نسخۂ دوم فردوسی کے شاہ نامے کا قدیم ترین مخطوطہ ہے جو راجہ محمود آباد کے کتب خانے کی زینت بن چکا ہے۔ مخطوطے کی جلد بڑی خوبصورت ہے اور اس پر کشمیری پیپر ماشی کا کام کیا ہوا ہے۔

شاہ نامے کے کئی قلمی اور پرانے نسخے لندن، کیمبرج، پیرس اور برلن کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سب سے قدیم نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے جس کا سال تصنیف 841ھ مطابق 1438 ہے۔

اکبر حیدری نے پاکستان کے حکیم شمس اللہ قادری سے اختلاف رائے کیا ہے کہ انھوں نے 'شاہ نامہ فردوسی' کے جس نسخے سے استفادہ کیا وہ ہندستان کا واحد نسخہ نہیں ہے۔ دوسری بات پروفیسر شیرانی کہتے ہیں کہ شاہ نامے کا

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی تحقیقی نظر نے بے شمار پوشیدہ ادبی سرمایے کی کھوج کی۔ اکبر حیدری کی خدمت یاد رکھے جانے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے پردہ خفا میں کئی شعرا کا کلام اردو دنیا سے متعارف کرادیا۔ برصغیر کے اہم محققوں میں بھی ان کا نام گناجاتا ہے۔ انھوں نے جو مرثیہ یا دوسری شخصیات پر تحقیقی کام انجام دیا ہے وہ تا ابد انھیں زندہ جاوید رکھے گا۔

دیباچۂ قدیم کم وبیش دوصدی کے بعد تصنیف کیا گیا تھا۔ جب کہ شمس اللہ قادری کی تحقیق ہے کہ یہ 306ھ میں لکھا گیا تھا۔ نسخۂ بایُسنغر کے علاوہ نسخۂ محمود آباد اور نسخۂ سری نگر میں اس کا سال تصنیف 346ھ درج ہے اسے علامہ قزوینی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ دیباچہ قدیم کے شان نزول کے بارے میں نسخۂ بایُسنغر میں لکھا گیا ہے کہ 301ھ تا 912ھ تک ابومنصور محمد بن عبدالرزاق طوسی نے اپنے وزیر ابومنصور المعمری سے نثر میں شاہ نامہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ ابومنصور المعمری نے 346ھ میں اسے مکمل کیا تھا۔

6 تذکرۂ مخزن الغرائب کا قدیم ترین نسخہ

تذکرۂ مخزن الغرائب شیخ احمد علی ہاشمی سندیلوی کا لکھا ہوا تذکرہ ہے اس میں فارسی کے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تذکرے کے کچھ نسخے پٹنہ، رام پور اور اعظم گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس تذکرے کا سال تصنیف 1218ھ مطابق 1803 ہے۔ اکبر حیدری نے محمود آباد کتب خانے میں اس تذکرے کے دو قدیم ترین نسخے دیکھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں مکمل ہیں اور 1219ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں نسخے غیر مطبوعہ ہیں۔ اس مقالے میں اکبر حیدری نے ان نسخوں کو قدیم ترین نسخے ثابت کیے ہیں۔

تذکرۂ مخزن الغرائب کے دونوں نسخے کئی کاتبوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن دونوں کا ترقیمہ ایک ہی کاتب نے لکھا ہے۔ مخطوطے میں بعض مقامات پر کاتب شاعر کا نام اور تخلص لکھنا بھول گیا ہے۔ اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ اس تذکرے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ غالباً شیخ احمد علی ہاشمی پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے کشمیری فارسی شعرا کی اچھی خاصی تعداد میں ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے مخزن الغرائب کا نام 'مجمع الغرائب' لکھا تھا لیکن دیباچے میں مصنف نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قطعہ تاریخ میں مخزن الغرائب ہی لکھا ہے۔ دوسرے جو بھی مخطوطے ہیں وہ سب نامکمل ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اودھ کیٹلاگ میں مخطوطہ نمبر 27 کے تحت اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ اسپرنگر نے تذکرے کا سال تصنیف نہیں لکھا اور شعرا کی تعداد قیاساً 3061 بتائی ہے۔ لیکن جو مخطوطہ محمود آباد کا ہے اس میں کل شعرا کی تعداد 3075 ہیں۔ بقول اکبر حیدری مخطوطے میں خامی یہ بھی ہے کہ فہرست میں جن شعرا کے نام کے ساتھ صفحے درج ہیں وہ بھی غلط ہیں۔

7 میر غلام علی آزاد بلگرامی اور غالب الہ آبادی کی بعض نایاب تحریریں بخط مصنفین

اکبر حیدری نے محمود آباد کے کتب خانے میں ایک 'بیاض غالب' کا مخطوطہ، غالب الہ آبادی کے ہاتھ کا لکھا دیکھا ہے۔ یہ بیاض قدیم ترین ہے۔ اس میں میر غلام علی آزاد بلگرامی اور غالب الہ آبادی دونوں بزرگوں کی تحریریں موجود ہیں جو 1147ھ میں لکھی گئی ہے۔ اکبر حیدری نے اپنے اس مقالے میں ان دونوں کے حالات زندگی اور ان کی تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے۔ مقالے میں ان کی تحریروں کا عکس بھی شامل ہے۔ یہ 'بیاض غالب' اس لیے بھی اہم ہے اس میں مصنف نے غزلوں کے ساتھ تاریخیں بھی لکھیں ہیں۔

الغرض اس کتاب 'مقالات حیدری' میں جو بھی مقالات ہیں۔ وہ سب اردو ادب میں اضافے کے طور پر ہیں۔ اس میں انھوں نے دیوان میر کا قدیم ترین مخطوطہ، کلیات میر حسن کا قدیم ترین مخطوطہ، کلیات انشا کے دو نادر نسخے، ناسخ اور کلیات ناسخ، شاہ نامہ فردوسی کا قدیم ترین مخطوطہ، تذکرہ مخزن الغرائب کا قدیم ترین نسخہ اور میر غلام آزاد بلگرامی اور غالب آلہ ابادی کی بعض نایاب تحریروں کا جو تحقیقی جائزہ لیا وہ قابل اعتبار ہے۔ تحقیقی دعوا کرنا کوئی سہل بات نہیں ہے اس کو دلائل سے ثابت کرنا پڑتا ہے جس میں اکبر حیدری کھرے اترتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب اردو کی تحقیق میں ایک اضافہ اور انمول حیثیت رکھتی ہے۔

مختصراً پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی تحقیقی نظر نے بے شمار پوشیدہ ادبی سرمایے کی کھوج کی۔ اکبر حیدری کی خدمت یاد رکھے جانے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے پردہ خفا میں کئی شعرا کا کلام اردو دنیا سے متعارف کرادیا۔ برصغیر کے اہم محققوں میں بھی ان کا نام گنا جاتا ہے۔ انھوں نے جو مرثیہ یا دوسری شخصیات پر تحقیقی کام انجام دیا ہے وہ تا ابد انھیں زندہ جاوید رکھے گا۔

■

Sofi Sajad
Research Scholar
University of Hyderabad
Hyderabad - 500046 (Telangana)
Mob.:6005000136

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنون لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطور خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

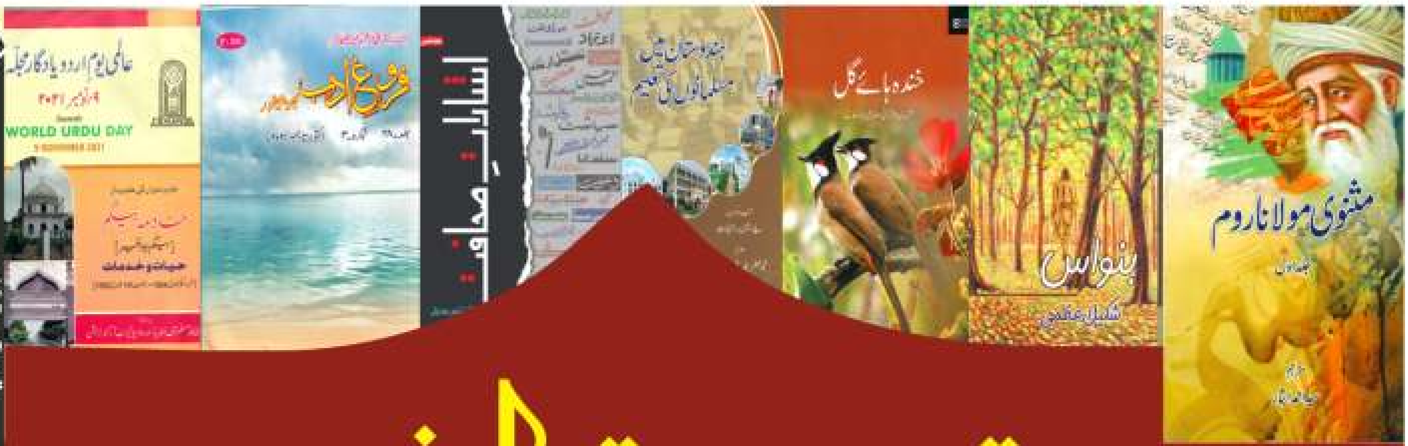

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

مثنوی مولانا روم

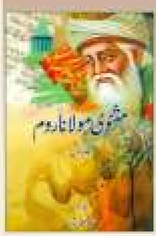

مترجم: سید احمد ایثار

صفحات: جلد اوّل: 251، جلد دوم: 215، جلد سوم: 281

جلد چہارم: 228، جلد پنجم: 266، جلد ششم: 282

قیمت فی جلد 788، مجموعی قیمت: 4680

مبصر: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مثنوی مولانا روم صرف فارسی ہی نہیں، بلکہ ادبیات عالم میں اپنی ایک شناخت رکھتی ہے۔ مولانا کی زندگی، شخصیت اور افکار نے دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور مفکروں کو متاثر کیا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس مثنوی نے کسی مخصوص زبان، تہذیب، مذہب یا علاقہ سے اوپر اٹھ کر انسانی زندگی اور ادبیات عالم میں نفوذ کیا ہے۔ اس کے اثرات بلاتفریق مذہب وملت سب پر مرتب ہوئے ہیں۔

مثنوی کے کئی تراجم اردو میں ہوئے ہیں، لیکن زیر تبصرہ منظوم ترجمہ ہے، اس لیے اس پر گفتگو ہوسکتی ہے۔ دراصل نثری ترجمہ تو پھر بھی آسان ہے لیکن منظوم ترجمہ کرنا اور وہ بھی مولانا روم کے افکار و خیالات کے تحفظات کو برقرار رکھتے ہوئے، کوئی آسان نہیں تھا۔ سید احمد ایثار صاحب نے مولانا کی چھ جلدوں پر مشتمل مثنوی کا منظوم ترجمہ کرڈالا، اس کے لیے ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ ترجمے سے پہلے 14 صفحات پر مشتمل انھوں نے مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں مولانا روم کے سوانحی و تعلیمی کوائف کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شمس تبریز سے مولانا کی ملاقات اور دونوں کے درمیان جو قرب کی انتہا تھی، اس کا ذکر کیا ہے۔ 'فیہ مافیہ' جو کہ مولانا کے ملفوظات پر مشتمل ہے اس کا بھی ذکر آیا ہے۔

مترجم نے مثنوی کا ترجمہ کرنے کی توجیہ یوں پیش کی ہے:

''ایک یہ کہ سب سے پہلا فارسی شعر جو اتفاقاً مجھے ازبر ہوگیا وہ مولانا کی مثنوی کا ہی شعر تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ علامہ اقبال جن کی ساتوں فارسی کتابوں کا میں نے منظوم اردو ترجمہ کیا ہے، وہ خود کو مولانا کا مرید معنوی تصور کرتے تھے۔ اسی باعث میں علامہ کے ترجمے کے بعد 1982 میں مثنوی کی طرف متوجہ ہوا۔'' (ص xxviii)

سید احمد ایثار صاحب نے قاضی سجاد حسین کے ترجمے اور مولانا محمد نذیر صاحب نقشبندی کی مفتاح العلوم سے اکتساب کیا ہے۔ دس بارہ برسوں کی محنت شاقہ سے جناب ایثار صاحب نے چھ جلدوں کی مثنوی کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے، یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن انھوں نے علامہ اقبال کی بھی ساتوں فارسی تصانیف کا منظوم ترجمہ کیا تھا، لہٰذا ان کی مشق سخن سے کام کچھ آسان ہوگیا۔ یہاں نمونے کے طور پر جلد دوم کے آغاز سے پانچ اور جلد ششم کے اواخر سے چند اشعار کے منظوم تراجم دیکھیے۔ میں نے فارسی اشعار بھی لکھ دیے ہیں تاکہ قارئین زیادہ لطف اندوز ہوسکیں۔ پہلے فارسی متن پھر منظوم ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

مُدتے ایں مثنوی تاخیر شُد   مُہلتے بایست تا خوں شِیر شُد
تا نزاید بختِ تو فرزندِ نو   خوں نگردد شِیر شیریں خوش شنو
چوں ضیاء الحق حُسام الدین عِناں   باز گردانید ز اَوجِ آسماں
چوں بمعراجِ حقائق رفتہ بُود   بے بہارش غُنچہا نشگفتہ بُود
چوں ز دریا سوئے ساحِل بازگشت   چنگِ شعرِ مثنوی باساز گشت

سُوِی دوزخ میرود آں ردِّ باب   بے عذابِ بحر در نار و عذاب
پیش ازانکہ کارِ تو آنجا رسَد   ہر دَمے غفلت ترا واپس بَرد
رَو بُسوِیِ اصلِ خود ہمچوں خلیلؑ   بگذر از اِستارہ و چرخِ چونیل
پائے ہمّت برخورد بَرماہ نہ   سَر براں ایوان و آں درگاہ نہ
ایں خُودی را خرج کُن اندر خُدا   تانمانی ہمچو ابلیسے جُدا
آبِ جاں را ریز اندر بحرِ جاں   تا شوی دریائے بیحدّ و کراں

اب ذرا ان فارسی اشعار کے منظوم تراجم ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ مترجم نے مولانا کی فکری جہتوں کو اور ان کے تخلیقی اسالیب کو کس خوبصورتی سے پیش کردیا ہے۔

مثنوی روکے بہت دن ہوگئے   دودھ بننے خوں کو مدت چاہیے
بخت سے جب تک جنم بچہ نہ لے   خون میٹھا دودھ بننے سے رہے
جب ضیاء الحق حسام الدین نے   باگ موڑی ہے ادھر افلاک سے
وہ تھے معراجِ حقائق سے دوچار   غنچے کھل سکتے نہ تھے قبل از بہار
وہ جو دریا سے کنارے آگیا   چنگ شعر مثنوی بجنے لگا

سوئے دوزخ جائے ہوکر ردِّ باب   بحرِ شیریں سے سوئے نار و عذاب
اس سے پہلے کہ تو پہنچے اُس جگہ   ہر گھڑی واپس ہی ہوتا جائے گا
اصل کی جانب تو چل مثلِ خلیلؑ   ترک کرتے تو ستارہ چرخ نیل
چاند اور سورج کو یونہی روندتے   رکھ سر اپنا آگے اس درگاہ کے
چھوڑ دے اپنی خودی پیشِ خدا   تا نہ ہو ابلیس کی صورت جدا
بحرِ جاں میں ڈال دے تو اپنی جاں   تا بنے دریائے بے حد و کراں

جہاں مناسب سمجھا ہے وہاں لفظوں کو ویسے ہی رہنے دیا اور محض فعل کو بدل دیا ہے۔ فارسی کے پہلے نمونے کے آخری شعر کا دوسرا مصرع دیکھیے: چنگِ شعرِ مثنوی باساز گشت میں صرف آخر کا فقرہ 'بجنے لگا' کردیا ہے۔ غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ 'چنگِ شعرِ مثنوی' کو تبدیل کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔

مثنوی مولانا روم کا حسنِ فکر بلیغ کے ساتھ اس کے اسلوب فصیح میں بھی پوشیدہ ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ جسے فارسی زبان کی شُد بُد ہے اسے نثری یا منظوم ترجمہ میں سے کسی میں بھی مزہ نہیں آتا، اسے تو فارسی متن میں ہی مولانا کی پرخلوص اور پرنور فکر کی گردش نظر آتی ہے جو روحانی رقص میں مبدل ہوجاتی ہے۔ ترجمہ تو دراصل افکار اور معانی تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ اصل لطف تو اصل متن میں ہی پوشیدہ ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی زبان کا اصل متن ہو۔ فارسی کی اس مثنوی کو تو مولانا عبدالرحمٰن جامی نے 'قرآن در زبان پہلوی' کہا تھا۔

مثنوی مولوی معنوی   ہست قرآں در زبانِ پہلوی

مترجم نے انھی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "نیست پیغمبر ولے دارد کتاب" (ص xxvii)۔ حالاں کہ یہ نکتہ علامہ اقبال نے کارل مارکس کے بارے میں بیان کیا تھا

وہ کلیمِ بے تجلّی وہ مسیحِ بے صلیب   نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

(ارمغان حجاز — اقبال)

کتاب کی طباعت خوبصورت ہے اور فارسی و اردو ادبیات نیز ترجمہ نگاری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ چھ جلدوں پر مشتمل منظوم ترجمہ ایک قیمتی اور دیدہ زیب تحفہ ہے۔ ایک جلد کی قیمت 780 روپے ہے، اس طرح چھ جلدوں کی قیمت ہوئی 4680 روپے۔ یہ قیمت اردو قارئین پر قدرے بھاری ہے۔

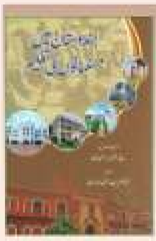

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

ترتیب وتدوین: جے ایس راجپوت، مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی
صفحات: ، 484، قیمت: 245 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: عشرت جہاں، محلہ ٹنڈولہ ٹانڈہ رامپور، یوپی

جے ایس راجپوت کی مرتب کردہ کتاب 'ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم' اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف عصر حاضر کے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے بلکہ ماضی میں مسلمانوں نے جو تعلیمی کارنامے انجام دیے، ان کو بھی روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ وہ مسلمان جنھوں نے تعلیمی سطح پر دنیا بھر میں انقلاب برپا کیا اور علم کی قندیلیں روشن کیں، آج وہی مسلمان تعلیمی سطح پر اس قدر پچھڑے ہوئے کیوں ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزادی کے بعد مسلمان جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں پسماندگی سے دوچار ہوئے، وہیں وہ تعلیمی سطح پر بھی پسماندگی کے شکار ہوئے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں کئی اہم شخصیات کی تحریروں کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ پیش لفظ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے لکھا ہے۔ 'تقدیم' کے عنوان سے ایک مختصری تحریر پروفیسر اختر الواسع کی بھی کتاب میں شامل ہے۔ سراج الدین قریشی نے ابتدائیہ لکھا ہے۔ مولفِ کتاب کی بھی متعدد تحریریں شامل اشاعت ہیں، البتہ ان کا تحریر کردہ مقدمہ بہت جامع اور محققانہ ہے۔ اس میں انھوں نے تعلیمی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے تعلیمی میدان میں عہد رفتہ کے مسلمانوں کی کوششوں اور کارناموں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس کے بعد ایک ذیلی عنوان 'اب کیا کیا جاسکتا ہے؟' قائم کرکے نئے حالات میں تعلیم کے نئے طریقوں کی جستجو بھی کی ہے اور مفید مشورے دیے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کی فہرست کے مندرجہ ذیل عنوانات پر ہی ایک نظر ڈالنے سے ہوجاتا ہے۔ مثلاً: اسلام کی روح، اسلام میں روحانیت، ہندوستان میں مسلم بچوں کی تعلیم: حقائق اور چیلنج، اشاعت علم کے سلسلے میں قرآن کی اپروچ، اسلام میں حصول علم، مدارس کا آغاز وارتقا اوران کی اہمیت، جدید دور میں مدرسوں کی معنویت، استاد اورشاگرد کی صفات کا اسلامی تصور، اسلام میں علم کے حصول کی آبیاری، سیکولرزم: اس کی اسلامی تعبیر اور تعلیم سے اس کا تعلق، دینی تعلیم اور سیکولر تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلمان کا حصہ: ایک جائزہ، ہندوستان میں صوفی خانقاہیں اور جدید تعلیم، تعلیم اور اعلیٰ انسانی اقدار: اسلامی تناظر میں اور اسلامی تعلیم میں ماحولیات کی شمولیت وقت کی ضرورت وغیرہ۔

'اسلام کی روح' پروفیسر الاختر الواسع کا تحریر کردہ مضمون ہے جس میں انھوں نے اسلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے عقائد سے بھی بحث کی ہے اور اسلامی ارکان سے بھی، نیز تعلیم، معاملات، اخلاقیات وغیرہ کو بھی اس مضمون میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ مختصراً اسلام کو جاننے کے لیے یہ مضمون جامع اور اہم ہے۔ فریدہ خانم کے مضمون 'اسلام میں روحانیت' کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح طور سے سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں روحانیت کا کیا مقام ہے۔ 'ہندوستان میں مسلم بچوں کی تعلیم: حقائق اور چیلنج، مسلم بچوں کی تعلیم کے حوالے سے بہت اہم مضمون ہے، اس میں مسلم بچوں کی تعلیم کی صحیح صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مسلم بچوں کو جو چیلنجز پیش آرہے ہیں، ان کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ 'اشاعت علم کے سلسلے میں قرآن کی اپروچ' بھی بہت عمدہ مقالہ ہے۔ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی نے اپنے مضمون 'اسلام میں حصول علم' میں حصول تعلیم کی بابت اسلامی تعلیمات کو پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے تعلیم حاصل کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے حوالے سے پروفیسر عبدالعلی کا مضمون 'سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلمانوں کا حصہ' گراں قدر مضمون ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کے فروغ میں جہاں مدارس اور دیگر تعلیمی اداروں نے اہم کردار ادا کیا ہے، وہیں خانقاہوں اور صوفیا حضرات نے بھی تعلیم کو آگے بڑھانے میں اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ اس تناظر میں محمد ارشد کا مضمون 'ہندوستان میں صوفی خانقاہیں اور جدید تعلیم' اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ اسلام، مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ، اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی صورت حال کو جاننے کے لیے یہ کتاب بلاشبہ بہت مفید ہے۔ تعلیم سے رغبت رکھنے والے افراد، اساتذہ اور طلبا کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

پیش نظر کتاب کے مرتب پروفیسر جے ایس راجپوت کا نام تدریسی، تعلیمی اور تحقیقی حوالوں سے بہت اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ تعلیمی حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس کے علاوہ جن شخصیات کے بھی مضامین کتاب میں شامل کیے گئے ہیں وہ سب تعلیمی، تدریسی اور تحقیقی میدان میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی نے کیا ہے جن کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ وہ ایک اچھے مترجم ہونے کے ساتھ ایک اچھے قلم کار بھی ہیں، ان کا طرز نگارش رواں اور سادہ ہوتا ہے۔ ترجمے میں انھوں نے ترجمہ کے اصولوں وضابطوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ترجمہ شدہ اس کتاب کو پڑھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ کی ہوئی کتاب ہے بلکہ اصل کتاب محسوس ہوتی ہے۔ اس سے کتاب کی خوبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً یہ مترجم کا کمال ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ایک عمدہ موضوع پر ایک عمدہ کتاب شائع کرکے قارئین کے لیے تعلیم کے تعلق سے قیمتی مواد پیش کیا ہے۔ کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے بھی کتاب معیاری ہے۔

تحقیق و تنقید

اذکار ادب

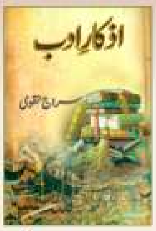

مصنف: سراج نقوی
صفحات: 226، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، N-93، ٹاپ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

سراج نقوی ہمارے عہد کے ان صحافیوں میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی صحافتی زندگی میں ادب و سیاست دونوں کو جگہ دی ہے۔ ان کا تعلق علم و ادب کی روحانی بستی امروہہ (یوپی) سے ہے۔ اور انھیں اپنے امروہوی ہونے پر بجا طور پر بڑا فخر بھی ہے۔

پیش نظر کتاب 'اذکار ادب' ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ اگرچہ عموماً سیاسی مضامین قلم بند کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی ان کے قلم سے بقول ان کے تاثراتی، نیم تنقیدی مضامین یا تبصرے بھی راشٹریہ سہارا، عالمی سہارا اور بزم سہارا کے صفحات پر نظر آتے تھے۔ پروفیسر عبدالحق نے درست ہی لکھا ہے کہ "ماضی کی طرح حال میں بھی چند اہل قلم صحافتی مصروفیات کے باوجود علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور بڑے انہماک وخلوص کے ساتھ تخلیق وتہذیب کو سنوارنے میں ہمہ تن کوشاں ہیں۔ ان معتبر قلمکاروں میں سراج نقوی کی ان تحریروں سے اعراض نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے مضامین، کالم اور انداز تحریر کی دلکشی نے ایک امتیاز قائم کیا ہے، جس میں سوز وساز اور غور وفکر کے وافر سامان بھی ہیں۔"

'اذکار ادب' کے سبھی مضامین بہت اچھے ہیں، لیکن ان میں اقبال بانگ درا کی روشنی میں، محمد حسین آزاد کی انشاپردازی، ساحر کی نظموں میں ڈرامائی عناصر، مخمور سعیدی، گفتنی سے، رستہ اور میں تک، ڈاکٹر امیر اللہ خاں مضامین مقدمہ سیر المصنفین کی روشنی میں، انور جلال پوری کی منظوم ترجمہ نگاری، نئی شاعری چند معروضات، اردو نثر میں طنز ومزاح، کیفی اور سوشلزم کا خواب، جون ایلیا: جانے والا یہاں کا تھا ہی نہیں، معراج فیض آبادی: سنا ہے بند کرلیں اس نے آنکھیں اور سلیم صدیقی کا شعری وصحافتی سفر وغیرہ بہت وقیع مضامین ہیں۔

'نئی شاعری: چند معروضات' میں سراج نقوی نے شعرا کے ایک گروہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نئی شاعری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف اپنے زمانے کے مسائل کی عکاسی کرے اور غیر طبقاتی معاشرے کی تشکیل میں حصہ لے۔ انھوں نے بعض شعرا کے اس خیال کو ایک انتہاپسندانہ رویہ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ شاعری محض نظریے کی ترسیل نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ کام شاعری سے بھی زیادہ بہتر طور پر اشتہار سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ترسیل وتبلیغ کا بہترین ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی نئی شاعری کے لیے سراج نقوی نے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ روح عصر سے ہم آہنگ ہو، جس زمانے کی تخلیق شدہ ہو وہ زمانہ بھی بہ اعتبار تغیر وتبدیلی نیا ہو، نئے مزاج اور ذہن سے مطابقت رکھتے ہوئے کہیں روایتوں سے انحراف کرتی ہو اور کہیں ان روایتوں کی خوب صورت توسیع کرتی ہو۔

سراج نقوی کے مضامین میں تنوع ہے اور ایک سبک روی ان کی تحریروں کو دوسرے قلمکاروں سے منفرد بناتی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں نہایت سلجھے ہوئے انداز میں لکھنے کی سعی کرتے ہیں اور اس پر پھر ان کا جداگانہ انداز پیش کش ان کی تحریروں کو کچھ خاص بنا دیتا ہے۔

عموماً صحافیوں کی تحریریں کہیں کہیں تجلک ہوجاتی ہیں، لیکن سراج نقوی کے یہاں یہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی سادہ تحریر میں اپنے ادبی شعور سے پختگی پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ ان کے خیالات سے جزوی اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن کلی طور پر ان کے مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب ان کی قابل قدر استعداد کے باوصف ہی ممکن ہوسکا ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس میں ڈوبنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر ان کی تحریروں کا اتار چڑھاؤ اپنی تلاطم خیزیوں کے سبب دلوں میں جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔

خندہ ہائے گل

مصنف: ذاکر حسین ذاکر

صفحات: 223، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: براؤن پبلی کیشنز، علی گڑھ، یوپی

مبصر: امیر حمزہ اعظمی، مرزا ہادی پورا ضلع مئو ناتھ بھنجن، یوپی

ڈاکٹر ذاکر صاحب کی اس کتاب میں جہاں ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین ہیں وہیں کچھ خاکے بھی ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اس کا مصنف ایک صحافی بھی ہے یا ایک صحافی ہی ہے جس نے اگر منشی پریم چند کے ناولوں میں مسلم کردار تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس تجسس کے ساتھ کہ اگر منشی پریم چند نے اپنے ناولوں میں کچھ مسلم کردار پیش کیے ہیں تو انھیں کس زمرہ میں رکھا ہے یا ان کا کردار ناول میں کس حیثیت کا حامل ہے اور اس کے لیے ظاہری بات ہے کہ انھوں نے منشی پریم چند کے ناولوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے صحافتی تیور کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ منشی پریم چند نے اپنے ناولوں میں مسلم کردار بس یونہی ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیے ہیں یعنی ان کے ناولوں میں مسلم کردار بس نام کے ہی ہیں لیکن انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس کمی کی وجہ سے منشی پریم چند کو فرقہ پرستی کے زمرہ میں نہیں رکھا جاسکتا۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب نے چونکہ اپنی کتاب کا نام مرزا غالب کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے اس لیے انھوں نے 'غالب شخص اور شاعر' کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون بھی اس میں شامل کیا ہے اور اپنے تجزیاتی نچوڑ کو اس طرح بیان کیا ہے "غالب کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ محمد بن تغلق کی طرح اپنے وقت سے سو سال قبل پیدا ہو گئے تھے۔ نابغہ Genius کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے کی سوچتا ہے اپنے حال سے ناآسودہ اور خوش آئند مستقبل کا خواہاں ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عہد کی ناآسودگی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے مخالفین کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر نے کیفی اعظمی کی شخصیت اور ان کی فنی اور فکری انفرادیت کو بھی نگاہ میں رکھا ہے اور ان کی مختلف تخلیقات کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایک رومان پرست انقلابی شاعر ہیں کیونکہ ان کی زیادہ تر نظمیں رومانی لفظیات سے پر ہیں جن نظموں میں اشتراکیت اور ہنگامی واقعات کی عکاسی کرتے ہیں ان میں غنائیت اور روانی بہت زیادہ ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نے ساحر لدھیانوی کو ادب کا قلندر قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ساحر نے پوری زندگی تمام تر محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود کبھی شکست کا اعتراف نہیں کیا کسی سے خوف زدہ نہیں ہوئے اور نہ ان کے دل و دماغ میں دنیا و جاہ و حشمت کے لیے کوئی حرص و طمع تھا جو کچھ ملا اسے لٹا دیا اور جو کچھ نہیں ملا اسے پانے کے لیے کبھی کوئی چال نہیں چلی۔

ڈاکٹر ذاکر نے اپنی کتاب میں صرف پھولوں کی مسکان سے ہی لوگوں کو متعارف نہیں کرایا ہے بلکہ قلم اور اہل قلم کی سسکیوں اور کراہوں کو بھی جگہ دی ہے۔ تیس سال بعد دوبارہ غبار خاطر میں چھپے ہوئے حقائق اور ان کی بصیرت افروزیوں کو حالات حاضرہ کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی اور بڑی شد و مد سے غبار خاطر سے کچھ کشید کیا اسے مولانا ابوالکلام آزاد کے اس جملے میں سمونے کی کوشش کی ہے کہ "دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر انھیں کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں بے ہمتوں کے لیے تو ترک عمل اور تعطل کا حیلہ بن جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر ذاکر کا سیماب خوذ ہن اور ان کا صحافتی اور ادبی تجسس انھیں اردو ادب کے جولاں گاہ کی جانب مائل کرتا ہے اور وہ حال ہی میں اس دنیا کو الوداع کہنے والے شمس الرحمٰن فاروقی کے تاریخی، تحقیقی اور دستاویزی ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں اور باذوق لوگوں کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ مشورہ بھی رقم کرتے ہیں کہ "یہ تاریخی ناول نہیں ہے اسے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسان اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہے۔"

خندہ ہائے گل میں افسانہ نگاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور ڈاکٹر ذاکر کی جولانی طبع نے انھیں موسیٰ مجروح کی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے کی بھی ترغیب دی اور یہ ترغیب اس لیے بھی دی کہ موسیٰ مجروح خود ان کے دیار دیوریا کے ہی سپوت تھے اور انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شعر و شاعری سے کی تھی وہ فن برائے فن اور ادب برائے ادب دونوں ہی نظریے کے یکساں طور پر قائل تھے اور بہ قول ڈاکٹر ذاکر ان کے افسانوں میں ان کے اس مسلک کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔

خندہ ہائے گل کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ کتاب کے مصنف کی جولانی طبع انھیں اہل تصوف کی جنوں خیزیوں کی بھی سیر کراتی ہے اور وہ اس سیر کے دوران جو مناظر آنکھوں میں بسا کے لاتے ہیں انھیں اپنے نوک قلم کے حوالے کرتے ہوئے اپنے قارئین کے روبرو بھی اس کی تصویر کشی کرتے ہیں وہ 'سماع اور اہل تصوف' کے عنوان سے لکھی ہوئی اپنی تحریر میں رقم طراز ہیں کہ "صوفیہ نے سماع کو وسیلہ قرب الٰہی اور باعث تصفیہ نفس وتزکیہ باطن تسلیم کیا ہے، حضرت نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ سماع اہل طریقت اور ذوق و شوق والوں پر وارد ہوتا ہے، یہ ذوق کی انتہا ہے۔"

'خندہ ہائے گل' میں ہمیں جہاں بہت سارے صوفیا کے تذکرے ملتے ہیں وہیں ایک باغی صوفی کا بھی ذکر ملتا ہے اور اس باغی صوفی کی خاکہ نگاری بھی بہت کچھ واضح کرتی ہے۔

اس کتاب کے سبھی مشمولات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک صحافی کا ذہن کسی ایک موضوع کا ہی اسیر نہیں رہتا بلکہ ایک سچے صحافی کا ذہن جہاں گشت ہوتا ہے وہ مختلف گلستانوں کے پھولوں کو دیکھنا چاہتا ہے ان کی خوشبوؤں سے آشنا ہونا چاہتا ہے۔

حاصل سطور یہ ہے کہ اگر کسی کو مختلف موضوعات کا ایک ساتھ مطالعہ کرنا ہو تو وہ خندہ ہائے گل سے مستفید ہوسکتا ہے اور بہت کچھ کشید کرسکتا ہے۔ اس کتاب کو براؤن بک پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے، ہماری تمنا ہے کہ اسے اردو ادب میں مناسب مقام حاصل ہو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی قلمی روانی یوں ہی بہتے ہوئے پانی کی طرح رواں دواں رہے اور شگفتگی اور تازگی کا احساس دلاتی رہے۔

ظفر کمالی کی گیارہ طنزیہ نظمیں

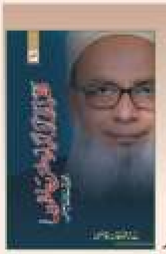

ایک تجزیاتی مطالعہ مع متن
مصنف: عبدالوہاب قاسمی
صفحات: 213، قیمت 350 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: حامد حسین ندوی، گرام ڈومریا، تھانہ: رانی گنج، ضلع ارریا، بہار

دنیائے تنقید میں اچھے لکھنے والوں کی قلت ہمیشہ رہی ہے۔ یہ قلت آج جس تیزی سے بڑھ رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ زیادہ تر تنقیدیں متن کی گہرائی میں اتر کر لکھنے کے بجائے رسمی تعریف و توصیف تک محدود ہوتی جارہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بطور خاص نئی نسل میں ایسے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں جو کتاب کے متون کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرکے اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ عبدالوہاب قاسمی کا نام انھیں چند لوگوں میں لیا جاسکتا ہے۔

اردو تنقید کا یہ بھی المیہ رہا ہے کہ اس میں سنجیدہ ادب کے بالمقابل ظریفانہ ادب پر کم توجہ دی گئی ہے اور اس کو دوسرے درجے کا ادب سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے لیکن 'ظفر کمالی کی گیارہ طنزیہ نظمیں: تجزیاتی مطالعہ مع متن' کو اس حوالے سے ایک خوش آئند قدم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس کتاب میں ظفر کمالی کے حالات زندگی اور شخصیت، گیارہ نظموں کے علاوہ ابتدائیہ اور اختتامیہ بھی شامل ہے۔ آخر میں منتخب نظموں کو شامل کرکے اصل متن کے مطالعے کی راہ بھی ہموار کردی گئی ہے تاکہ قاری کو کسی نتیجے تک پہنچنے میں آسانی ہوسکے۔

ابتدائیہ میں کتاب کی غرض و غایت پر ایک اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے جس کو پڑھ کر کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں مبصر نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب ایک طالب علمانہ ریاضت کے طور پر لکھی ہے لیکن کتاب کا باریک بینی سے مطالعہ کیجیے تو اس طالب علم کی تنقیدی اور فکری صلاحیت کا عمدہ احساس ہوتا ہے۔ اس نے یہاں اپنے تجزیاتی طریقۂ کار پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بقول ان تجزیوں میں تعبیر و تفسیر سے زیادہ شاعر کی فکری حسیات اور بین السطور سے پیدا ہونے والی بصیرت افروزی کو مطمح نظر بنایا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔ ظفر کمالی کی شخصیت پر لکھے مضمون پر بھی مبصر نے عمدہ وضاحت پیش کی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ ظفر کمالی جو ایک شخص، ایک انسان ہیں اور انسانوں کی طرح جس کی زندگی میں دیکھے اندیکھے بہت سے پہلو ہیں، انھیں دکھادوں۔ کیوں کہ غفلت کے پردے کبھی کبھی اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ جب تک انھیں چاک نہ کیا جائے تو قریب، بہت قریب کی قیمتی چیزیں بھی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ امید ہے اس مضمون کی روشنی سے غافل نگاہوں کے پردے چاک ہوں گے اور ظفر کمالی کو ان کے ظاہری و باطنی خد و خال کے ساتھ بہتر طور پر سمجھا جاسکے گا۔''

اس ابتدائیے میں انھوں نے ایک بڑی سچائی کی نشاندہی بھی کی ہے کہ تقریباً چار دہائیوں سے ایک شاعری خاموشی سے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اب اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں سے شاعر کی انفرادی، فکری اور نظریاتی شعور کی تجسیم ہوتی ہے اور اس کی اپنی آواز بن جاتی ہے اس کے باوجود لوگوں کی نظریں اس پر جتنی اٹھیں وہ اس کے اعتراف میں بہت کم ہیں۔ مبصر کے اس دبے دبے شکوے کی معنویت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مبصر نے اوپر جس ظفر کمالی کو دکھانے کی بات کہی ہے اس حوالے سے 51 صفحات میں تحقیقی اور تاثراتی انداز میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ یقیناً ظفر شناسی کے باب میں پہلی اور بنیادی کوشش کہی جائے گی۔ کیونکہ ظفر کمالی پر اس نوعیت کی تحریریں اب سے پہلے نہیں لکھی گئی ہیں۔ اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ دورِ تشکیل پر مشتمل ہے جس میں خاندانی پس منظر اور سوانحی حالات درج ہیں۔ دوسرا حصہ شخصیت کا احاطہ کرتا ہے جس میں مبصر نے اپنے برسوں کے ذاتی مشاہدات کا ایماندارانہ اور مخلصانہ تذکرہ کیا ہے۔ ان کی شخصیت کے چھوٹے بڑے پہلوؤں، پسند و ناپسند، افکار و خیالات، سیوان کے ادبی ماحول اور استادی و شاگردی کے تذکرے غرض شخصیت سے جڑی بہت سی معلومات یہاں جمع کردی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر کمالی کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون اساسی حیثیت کا حامل ہے جس میں ظفر کمالی کی تصویر بہت حد تک قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

مبصر کی تنقیدی بصیرت کا اصل جوہر تو ان کے تجزیوں میں سامنے آتا ہے۔ نظموں کے انتخاب سے لے کر تجزیاتی مرحلے تک جس دانشمندی کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل داد ہے۔ یہاں ادب، سیاست، معاشرت اور شخصیت پر نظموں کی شمولیت مبصر کے حسنِ انتخاب کی دلیل ہے۔ تجزیہ طویل سے طویل تر ہونے کے باوجود دلکش اور دلچسپ ہے۔ مبصر نے دوران تجزیہ اس بات کو بخوبی ذہن میں رکھا کہ تکرار کی صورت پیدا نہ ہو جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ ہر تجزیے میں گہرائی اور گیرائی اور خوش اسلوبی کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔ نظموں کے خصائص، فکری ابعاد، فنی تہہ داری اور اسلوب کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے مبصر نے ہر جگہ محنت، جانفشانی اور جانکاہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یوں تو ہر تجزیہ اپنی مثال آپ ہے لیکن 'اے ارض فلسطین'، 'دادائے اعظم'، 'ماڈرن رخصتی' اور 'ظفر کمالی' جیسی نظموں پر کیا گیا تجزیہ بہت عمدہ اور قابل مطالعہ ہے۔

اس کتاب کے اختتامیے میں تجزیہ کی گئی نظموں پر مبصر نے ایک مجموعی گفتگو کی ہے۔ ظفر کمالی کی شاعری، ان کی تخلیقی قوت، طویل تر نظموں میں ان کے احساسات، کیفیات اور جذبات سے مربوط بامعنی اور پُر تاثیر کل کی عمدہ تشکیل کی موجودگی کو بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی موضوعاتی زاویوں سے ظفر کمالی کے یہاں جو تنوع اور ایک ہی موضوع کو الگ الگ زاویوں سے پیش کرنے اور بڑے اور گمبھیر موضوعات پر خاص توجہ دینے کا جو رویہ ہے اس کا بھی عمدہ اظہار کیا ہے۔ ظرافت کے میدان میں ظفر کمالی کس ہنرمندی سے اپنی بات رکھتے ہیں، ان کا طریقۂ کار کیا ہے، ظرافت میں وہ لطافت کیسے پیدا کرتے ہیں ان سب پہلوؤں پر بہت جامع گفتگو کی گئی ہے۔

بحیثیت مجموعی 'ظفر کمالی کی گیارہ طنزیہ نظمیں: تجزیاتی مطالعہ مع متن' اردو کی ظرافتی تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے۔ امید ہے کہ ابھرتے ہوئے اس قلم کار کی اس پہلی کاوش کو دنیائے تنقید میں نہ صرف سراہا جائے گا بلکہ قبولیت بھی عطا ہوگی۔

شاعری

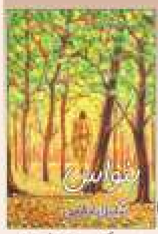

بنواس

شاعر: شکیل اعظمی
صفحات: 200، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ابراہیم اعظمی، جمال پورہ، مئوناتھ بھنجن۔ 275101 (یوپی)

شکیل اعظمی عصری شعری منظر نامے کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کی اپنی شعری

کائنات ہے۔ انھیں اپنے منفرد اسلوب کے سبب یہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ عہد حاضر کا اگر جائزہ لیا جائے تو ایسے تخلیق کار بہت شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے جنھوں نے عوام و خواص میں اپنی شعری تخلیقات، جیسے غزل، نظم، گیت، رباعی، قطعات، شہر آشوب کے علاوہ فلمی گیتوں اور مشاعروں کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ شکیل اعظمی نے فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنی ادبی زندگی سے سمجھوتہ نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر تازہ مجموعۂ کلام میں جدیدیت اور مسلسل ارتقائی منازل نظر آتی ہیں۔

ان کا تازہ مجموعہ کلام 'بنواس' ہے۔ یہ مجموعۂ کلام شکیل اعظمی کی شاعری کے کمال فن اور تخلیقی جوہر کا بہترین نمونہ ہے۔

'بنواس' انسان اور فطرت کے درمیان پوشیدہ ایک جہاں کا روشن ستارہ ہے، یعنی ایک ایسا جنگل جو کہ اپنے اندر چھپے ہوئے خزانے کی کنجی ہے۔ اس مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح سے انسانی زندگی کی ایک دنیا آباد ہے۔ ٹھیک اسی طرح جنگل کی بھی ایک دنیا ہے جو کہ مناظر فطرت سے معمور ہے۔ 'بنواس اردو کی نظمیہ شاعری میں ایک غیر معمولی اضافہ ہے۔ وہ اضافہ یہ ہے کہ ہماری شعری روایات اور منظری شاعری کا ایک الگ مقام و مرتبہ ہے۔ اگر منظری شاعری کی بات کی جائے تو اس میدان میں نظیر اکبرآبادی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی کے ساتھ ساتھ شکیل اعظمی کا نام بھی نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔

'بنواس' میں شکیل اعظمی نے ہندوستان کے قدیم مذہب کے دیوی دیوتاؤں پر بھی نظمیں لکھیں ہیں۔ اس مجموعے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ رامائن کے تمام کرداروں پر شکیل اعظمی نے نظمیں لکھی ہیں۔ جیسے رام، سیتا، لچھمن، راون، سگریو، اہلیا، کیوٹ، سورپ نکھا، جٹایو، شبری، بالی، جامنت، پون پتر، تری جٹا، بھیشن، انگد، مندودری، کمبھ کرن، میگھ ناد، اور سشین وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں شکیل اعظمی نے نظم، غزل، آزاد نظم، معریٰ نظم اور پابند نظمیں بھی لکھی ہیں۔

اس مجموعے میں جنگل کی زندگی سے تعلق رکھنے والے ان تمام اشیا کا ذکر ہے جہاں تک ہماری نگاہ نہیں پہنچتی ہے۔ جنگل میں متعدد اقسام کے پیڑ پودے ہیں۔ جو کٹنے کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، بس ان پر مختلف انواع کے رنگ چڑھ جاتے ہیں۔ جو بعد میں دیمک کی خوراک بن جاتے ہیں۔ اس میں جن پیڑوں پر نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں ببول، بیر، آم، مہوا، جامن، املی، برگد، پیپل، پاکڑ، گولر، تاڑ، نیم، شیشم اور بانس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام پیڑوں پر مبنی نظمیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ان سے حاصل شدہ لکڑیوں کا استعمال کر کے انسان اپنی زندگی کے تمام لمحات گذارتا ہے۔

'بنواس' میں شکیل اعظمی نے لفظ جنگل کا ردیف استعمال کر کے اٹھارہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ یہ تمام غزلیں منفرد لب و لہجہ رکھتی ہیں۔ عمدہ الفاظ کا انتخاب، بہترین خیالات، نغمگی سے بھرپور، دلکش ردیف و قافیہ کا استعمال اور اوزان و بحور کی لاجواب مثال ہیں۔

جنگل کی صبح، جنگل کی دوپہر، جنگل کی شام یہ نظمیں شکیل اعظمی کی اعلیٰ شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ ایسی نظمیں ہیں کہ آنے والی نسلیں کبھی انھیں فراموش نہیں کرسکتیں۔

جنگل میں لہلہاتے ہوئے پیڑ پودے چرند، پرند، پہاڑ، ندی اور جھرنے کی آوازوں کو شکیل اعظمی نے اس مجموعے میں یکجا کیا ہے کیونکہ ان کی سماعتوں اور بصیرتوں کو سمجھنے کے لیے مشکل تپسیا سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ تپسیا شکیل اعظمی نے بحسن وخوبی کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ پوری کتاب مختلف آوازوں کا مجموعہ کا ہے اور جنگل کو ایک کینوس کی طرح پیش کیا ہے۔ نقاشی اور مصوری کا ایک ایسا ہیولیٰ پیش کیا ہے کہ دور سے ہی قدرت کے مناظر متحرک نظر آتے ہیں۔ اساطیر اور دیومالائی کردار اور واقعات کے حوالے سے فطرت اور انسان کے تعلق کو نظموں کا جامہ پہنانا ایک مشکل کام ہے لیکن شکیل اعظمی نے اس مشکل کام کو آسان کر کے پیش کیا ہے۔

جنگل کی معصومیت، پراسراریت اور تمام تر مناظر فطرت کو بے حد دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دوسو صفحات پر مشتمل ہے اور مجموعے میں ستر 70 نظمیں ہیں اور غزلوں کی تعداد اکتیس 31 ہے، سب سے پہلی نظم بنواس ہے اور آخری نظم پیڑ کبھی نہیں مرتا ہے۔ کتاب کا سرورق بہت عمدہ اور جاذب نظر ہے۔ اس کتاب کے شروع میں پروفیسر شافع قدوائی کا عمدہ مقدمہ ہے۔ پوری کتاب میں ہر ایک شعر ان کی فنی صلاحیت کی مثال پیش کرتا ہے۔ آسان سے آسان الفاظ کا استعمال کر کے بڑی ہنرمندی سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں جس کو پڑھنے کے بعد عقل سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال یہ مختصر نظم ہے۔ املی''

بن کھائے ہی / دانت کے نیچے / دبی ہوئی ہے کھٹاس کوئی
کھٹاس میں ہے مٹھاس کوئی / منہ میں پانی بھرا ہوا ہے

ابلاغیات

اشارات صحافت (صحافتی مضامین)

مصنف: ڈاکٹر انیس صدیقی
صفحات: 164 قیمت: 200 روپے سنہ اشاعت: 2020
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس نئی دہلی
مبصر: سید مجتبیٰ نجم، نزد املی کا گودام طیب نگر
گیورائی ضلع بیڑ 431127 مہاراشٹر

ماحول سے آگاہی، تغیر پذیر سرگرمیوں سے واقفیت، حالات کے نشیب و فراز کی اطلاع اور ان سب کے ساتھ مافی الضمیر کی ترسیل کا سب سے عمدہ وسیلہ صحافت ہے۔ اس دنیا میں کئی انقلاب آئے اور طوفانوں کا رخ موڑ دیا جو صرف صحافت کے باعث ممکن ہوسکا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا، اور اس گردش کے دوران صحافت نے بھی کئی تبدیلیاں محسوس کی۔ صحافت کی موجودہ شکل کافی تبدیل شدہ ہے۔ آج جہاں صحافتی معیار آلودہ ہے، وہیں اس کے اصولوں کی پامالی بھی عام ہے۔ اصل صحافت کیا ہے؟... خبرنگاری کے گر کیا ہیں؟... اک کامیاب صحافی کے تقاضے کیا ہیں؟... ان اہم ترین نکات پر خامہ فرسائی ضروری ہے۔ ان سے متعلق رہنمائی لازمی ہے۔ اس عنوان پر یوں تو ہزاروں صفحات سیاہ کیے گئے۔ متعدد کتابوں نے کتب خانوں کا حجم بڑھا دیا۔ ان تصانیف میں چند تصانیف ایسی ہیں جو ایماندارانہ صحافت میں دلچسپی رکھنے والے ہر قاری کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان چنندہ کتب میں ڈاکٹر انیس صدیقی کی کتاب 'اشارات صحافت' اک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ زیر تبصرہ تصنیف نہ صرف صحافت کے طالب علم بلکہ اخبار و رسائل کے ہر قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس کتاب کے جملہ مشمولات کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں صحافت کے بنیادی تصورات اور خبرنگاری کے فن پر سلیس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اداریہ، کالم اور فیچر اور ترجمہ کی اصطلاحات کو دلنشیں پیرائے میں واضح کرتے ہوئے ان کے فنی تقاضوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ موضوعات ہر قلمکار کے لیے رہنما خطوط فراہم کرتے ہیں۔ آج پرنٹ میڈیا کا المیہ ہے کہ اک مضمون نگار بھی خود کو کالم نویس سمجھتا ہے۔ روزمرہ کی بات چیت کے انداز میں خبر لکھی جا رہی ہے اور خبروں پر تبصروں کو

اداریہ کہا جارہا ہے۔ خبریں یا مضمون کے تراجم میں متعدد مقامات پر ایک زبان کی کئی اصطلاحات اور محاورے دوسری زبان میں یا تو جوں کا توں آرہے ہیں یا لغوی اعتبار سے زبردستی ترجمہ کی چکّی میں پس کر قاری کے لیے تضحیک کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ اک نامہ نگار خود کو صحافی سمجھنے کی غلطی کر رہا ہے اور اک پروف ریڈر خود کو ایڈیٹر۔ اس میں ان کا قصور نہیں، صحافت کے بنیادی مفروضات و تقاضوں سے عدم واقفیت اسکی اصل وجہ ہے۔ 'اشاراتِ صحافت' میں ان بنیادی باتوں کو بڑی سادہ اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخری عنوان 'صحافی۔ نباضِ عصر' کے تحت مضمون میں سماج میں اک صحافی کے مقام، ملک و قوم کے تئیں اس کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کے مطابق اک کامیاب صحافی اپنے دور کے حالات کی نبض پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہوا کے بدلتے رخ کو سمجھ سکتا ہے۔ اور ممکنات سے قارئین کو خبردار کرتا ہے۔

دوسرے باب میں ریاستِ کرناٹک کا صحافتی منظرنامہ پیش کیا گیا ہے۔ نمائندہ اخبار کے طور پر ریاست سے شائع ہونے والے مشہور قاسم الاخبار کے صحافتی سفر، صحافتی مزاج اور اس کے مشمولات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ مزید برآں 'تحریکِ آزادی میں اردو صحافت کا کردار' اور 'قومی تعمیر میں ادب و صحافت کا رول' کے عنوانات پر معلومات سے لبریز مضامین بھی شامل ہیں۔

آخری باب کا طویل حصہ 'شب خون' کے کُل شماروں کے تحقیقی جائزہ پر مشتمل ہے۔ شب خون نہ صرف ہندستانی ادب بلکہ صحافت کی تاریخ میں اک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس رسالہ نے ادب میں نئے تجربات کو فروغ دیا۔ جدیدیت کو تیزی سے نمودار ہونے کے لیے ماحول فراہم کیا۔ شب خون کے جملہ شماروں کا تفصیلی جائزہ لینا کوئی آسان کام نہیں۔ انیس صدیقی صاحب نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی بدولت باریک بینی سے جائزہ لیا۔ یہ مفصل تجزیہ تحقیق کے میدان میں اک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی باب میں شب خون کے علاوہ عالمگیر ادب (اورنگ آباد) کے کتابی سلسلہ کی اک کڑی کے طور پر معروف جدید افسانہ نگار پروفیسر حمید سہروردی کے فن اور شخصیت پر شائع کردہ کتاب پر بھی عمدہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سالار، کے بی این ٹائمز اور غنچے جیسے ادبی جریدوں پر بھی عمدہ تبصرے شامل ہیں۔

انیس صدیقی کی یہ تصنیف ادبی صحافت اور صحافتی ادب دونوں میں امتیازی مقام رکھتی ہے۔ صحافت سے وابستہ قلمکاروں کے لیے رہنما دستاویز ہے۔ کتاب کا سرورق پرکشش ہے۔ پروفیسر محمد اعظم شاہد کا پیش لفظ اور پس ورق پر معروف صحافی معصوم مرادآبادی کا تحریر کردہ مصنف کے فن اور شخصیت کا مختصر لیکن جامع ترین تعارفی خاکہ کتاب کے مطالعہ کا شوق بڑھاتا ہے۔ طباعت دیدہ زیب ہے۔ اس اہم ترین تصنیف کی اشاعت پر ڈاکٹر انیس صدیقی صاحب دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

رسائل و جرائد

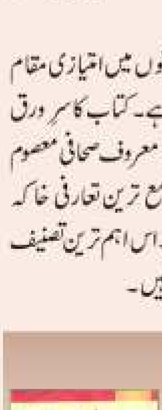

عالمی یوم اردو یادگار مجلہ

(خادمہ بیگم: حیات و خدمات)

اعزازی مدیر: ڈاکٹر سید احمد خاں

زیر اہتمام: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا / اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن

مبصر: حکیم فخر عالم، ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ

سید احمد خاں پیشے سے طبیب ہیں اور طب کی بقا و فروغ کے لیے جد و جہد اُن کی زندگی کا اہم مشن ہے، مگر اردو کی ترویج و اشاعت کے باب میں اُن کی جو خدمات ہیں وہ اردو سے پیشہ ورانہ وابستگی رکھنے والے کسی فرد سے کم ہرگز نہیں ہیں۔ سید احمد خاں اردو ڈے کی تیاری میں پورے سال لگے رہتے ہیں، اس موقع پر وہ ایک یادگاری مجلّہ بھی شائع کرتے ہیں، گزشتہ کئی برسوں کے مجلّے میرے مطالعہ میں رہے ہیں، ان مجلّوں کے بارے میں اختصار کا تو شکوہ تو کیا جاسکتا ہے، لیکن مشمولات اور محتویات کے لحاظ سے یہ بڑے وقیع ہوتے ہیں، خاص طور موضوعات کے اعتبار سے یہ بہت اہم ہوتے ہیں، یہ خصوصیت انھیں دستاویزی حیثیت عطا کر دیتی ہے۔ اردو ڈے کے انعقاد کا جتنا اہتمام حکیم سید احمد خاں کے یہاں ہے، اس کی مثال اردو والوں کے یہاں بھی نہیں ملتی، 1997 سے سید صاحب پابندی سے اردو ڈے منا رہے ہیں، 2000 سے وہ 'عالمی یومِ اردو یادگار مجلّہ' کے نام سے سوینیر بھی شائع کر رہے ہیں۔ پہلا یادگاری مجلّہ معروف مجاہد آزادی قاضی محمد عدیل عباسی کے نام موسوم تھا، یہ سلسلہ اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ گزشتہ بیس برسوں سے جاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ قاضی صاحب کے نام سے ابتدا کی برکت کا نتیجہ ہے، قاضی صاحب اردو کے سچے جاں نثار تھے۔ گزشتہ برس کا یادگاری مجلّہ منشی پریم چند کے نام معنون تھا، اب تک اسماعیل میرٹھی، پروفیسر جگناتھ آزاد، مولانا محمد مسلم، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، عثمان فارقلیط، علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، محفوظ الرحمان اور عبدالماجد دریادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری پر یہ مجلّے شائع ہوچکے ہیں۔

2021 کا پیش نظر مجلّہ حسب سابق ظاہری اور باطنی خوبیوں سے مزین ہے۔ یہ شمارہ تعلیم نسواں کی ایک علم بردار خادمہ بیگم عرف بیگم ابوالخیر کے نام معنون ہے۔ بیگم ابوالخیر کی تعلیم کے میدان میں بڑی اہم خدمات ہیں، لیکن یہ کارنامے اب تک خاطر خواہ انداز میں دنیا کے سامنے نہیں آسکے تھے، سید احمد خاں کی کوشش سے اس مجلّہ کے ذریعہ پہلی بار بیگم صاحبہ کی شخصیت اور خدمات سے لوگوں کو صحیح طور پر واقفیت ہوسکی ہے، بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ سید احمد خاں نے اس مجلّہ کے ذریعہ بیگم خیر کو تاریخ میں زندہ کرنے کا کام کر دیا ہے، ورنہ خدشہ تھا کہ یہ عظیم خاتون اتنے گراں قدر کاموں کے باوجود قعرِ گم نامی میں کھو جاتی۔ سید احمد خاں نے اس خادمۂ علم و ادب پر خود بہت تفصیل سے لکھنے کے ساتھ حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، حکیم سید محمد حسان نگرامی، حکیم وسیم احمد اعظمی، مونس فیضی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر منور حسن کمال، محمد حسان ندوی، نور قاسمی، عمران عاکف خاں، مفتی محبوب احمد قاسمی اور مولانا برہان احمد قاسمی جیسے پختہ قلم کاروں کی تحریروں سے بیگم خیر کی شخصیت کو اعتبار و وقار عطا کر دیا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ اس مجلّہ کے ذریعہ بیگم صاحبہ کی زندگی کے کچھ ایسے گوشے سامنے آئے ہیں، جن سے خواص بھی واقف نہیں تھے، تعلیم کے میدان میں کردار ادا کرنے والی خاتون کے طور پر بستی اور اس کے اطراف کے اضلاع میں وہ بہت مشہور ہیں، لیکن وہ عالمہ بھی تھیں اور قرآن کے ترجمہ کا انھوں نے فریضہ بھی انجام دیا ہے، بہتوں کو یہ اطلاع پہلی بار ہو رہی ہے، اسی طرح یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم تھی کہ ابوالخیر صاحب کا تعلق ضلع اعظم گڑھ سے تھا، جب کہ انھیں ضلع بستی کا سمجھا جاتا ہے۔

اس مجلّہ کی مجلس ادارت میں حکیم سید احمد خاں کے علاوہ ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی، ڈاکٹر محمد حسان نگرامی، سہیل انجم، محمد عارف اقبال اور جاوید اختر کے اسما درج ہیں، اس خوب صورت مجلّہ کی ترتیب و پیش کش میں ان سبھی کی عرق ریزیاں شامل ہیں، لہٰذا یہ سب لوگ اس کارنامے کے لیے تبریک اور تہنیت کے مستحق ہیں۔

فروغ ادب

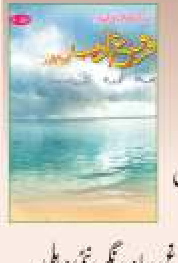

مدیر: ڈاکٹر سید مشیر عالم
صفحات: 64، قیمت: 25 روپے، زر سالانہ: 100 روپے
جلد: 28، شمارہ: 3 (اکتوبر تا دسمبر 2021)
رابطہ: سکریٹری، اڈیشا اردو اکادمی، سنسکرتی بھون، میوزیم کمپلکس
بی جے بی نگر، بھونیشور۔ 751014 (اڈیشا)
مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان کے قومی ترانہ ۔

جن گن من ادھینا یک جے ہے
بھارت بھاگیہ ودھاتا
پنجاب سندھ گجرات مراٹھا
دراوڑ اتکل بنگہ
وندھیہ ہماچل یمنا گنگا... الخ

میں جس 'اتکل' کا ذکر ہے یہ وہی سرزمین ہے جسے پہلے اڑیسہ اور اب اڈیشا کہا جاتا ہے۔ اتکل کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے۔ مشرقی ہندوستان کی اس ریاست کی ایک زریں تاریخ رہی ہے۔ اسی سرزمین میں کلنگا کی جنگ ہوئی تھی جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے تھے اور یہی جنگ اشوکا کے لیے ایک نقطۂ انقلاب ثابت ہوئی کہ اس نے جنگ کے خونریز مناظر کو دیکھ کر امن پسندی کی راہ اختیار کی اور بدھ مت کو قبول کر لیا۔

گو کہ یہاں کی اکثریتی آبادی کی زبان اڑیا ہے مگر اردو کے باب میں بھی یہ سرزمین بہت اہمیت کی حامل ہے۔ کہتے ہیں کہ ہردے رام جودت کی اس سرزمین سے عبدالقادر بیدل جیسے شاعر کا بھی تعلق تھا۔ یہیں امجد نجمی تھے جنھوں نے 'شاخسار' جیسے عہد ساز رسالے کے ذریعے اڈیشا کو افق ادب پر تابانی عطا کی۔ یہاں سے ادبی محاذ، ترویج اور دیگر ادبی رسائل شائع ہوتے رہے ہیں۔ اڈیشا میں اردو بولنے والوں کی معتد بہ تعداد ہے۔ یہاں کے اداروں میں اردو تعلیم و تدریس کا نظم و نسق بھی ہے۔ (اس کی پوری تفصیل حفیظ اللہ نیولپوری کی کتاب 'اڑیسہ میں اردو' میں دیکھی جاسکتی ہے۔) اڑیا اکثریتی علاقے میں کئی طرح کی علاقائی بولیاں بھی ہیں، مگر اردو زبان کی بنیاد بہت مضبوط ہے، اسی لیے 7 فروری 1987 کو اردو اکادمی کی تشکیل عمل میں آئی جہاں سے ادبی، ثقافتی سرگرمیوں کے علاوہ مطبوعات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ خاص طور پر اڈیشا کے حوالے سے کئی اہم مطبوعات شائع ہوئی ہیں جن سے وہاں اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کرامت علی کرامت کی آب خضر (تذکرہ شعرائے اڈیشا)، مطیع اللہ نازش کی 'اڈیشا میں اردو نثر نگاری'، سعید رحمانی کی 'اڈیشا میں اردو شاعری' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سے سہ ماہی 'فروغ ادب' کے نام سے ایک ادبی مجلّہ کئی برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور اس نے اڈیشا کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی اپنی ایک پہچان قائم کی ہے۔ اکتوبر تا دسمبر 2021 کے شمارے میں بھی مضامین، منظومات، افسانے اور غزلیات کا گوشہ ہے۔ اسلم جمشید پوری، ریاض توحیدی، زمرودہ محمد میر، اشفاق احمد عمر، نسیم احمد نسیم، ریحان احمد قادری، فرزانہ پروین کے مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر اشفاق احمد عمر کا مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ الیزابیتھ کورین مونا کی کتاب 'The Art and Science of Urdu Ghazal' کا مبسوط جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں شاید فن عروض پر یہ اہم کتاب ہے۔ اس سے قبل کیپٹن G.G Pybus کی کتاب 'Urdu Prosody and Rhetoric' منظر عام پر آئی تھی۔ مونا کی یہ کتاب بہت قیمتی ہے اور اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان کی مادری زبان ملیالم ہے۔ اس کے باوجود انھیں اردو زبان و ادب سے بے پناہ عشق ہے اور یہ اردو میں بھی شاعری کرتی ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نسیم احمد نسیم نے 'اردو اور نیپالی کا لسانی رشتہ' کے حوالے سے اچھا مضمون لکھا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے اقبال حسن آزاد کے افسانوں کی انفرادیت' پر روشنی ڈالی ہے۔ ریاض احمد توحیدی نے مشرف عالم ذوقی کے افسانے 'تواریخ سے پرے ایک دنیا کی جاسوسی' کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ فرزانہ پروین نے 'احمد کمال حشمی کی تضمین نگاری' اور ریحان احمد قادری نے شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت کے حوالے سے مضامین لکھے ہیں۔ یہ گوشہ قابل قدر ہے مگر ایک کمی یہ ہے کہ اس میں ریاست اڈیشا کی کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ اڈیشا کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے اگر مضامین کی شمولیت ہوتی تو رسالے کی معنویت بڑھ جاتی اور اس کی ضرورت بھی ہے کہ ہماری طرح بہت سے افراد ہیں جنھیں اڈیشا کے تاریخی ثقافتی اور ادبی منظرنامے سے صحیح طور پر واقفیت نہیں ہے۔ کلاسیکی زبان اڑیا بھی بہت اہمیت کی حامل ہے اور اڑیا ادب بہت قیمتی ہے، اس لیے اڑیا کے تراجم بھی اردو میں دیے جاتے تو اس سے اڑیا کے تخلیقی تموجات سے آگہی کی ایک اچھی صورت نکل آتی اور یہ سلسلہ اردو کے قارئین کے لیے بھی سودمند ثابت ہوتا۔ حصہ منظومات میں کرامت علی کرامت، شاداب، خالد رحیم، یوسف جمال، ایوب محمد خان، خلیل احمد پیکار، شمس الحق شمس، مطیع اللہ نازش وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح غزلیات میں نوشاد احمد کریمی، ظفر احمد صدیقی، سردار پنچھی، احمد نثار، کلیم سہسرامی، بدر محمدی، حسن امام فدائی، مسلم نواز، ولی اللہ ولی کی غزلیں ہیں۔ اس گوشے میں بھی صرف عبدالمجید فیضی، رفیق رضا اور محمد عارف ایسے ہیں جن کا تعلق اڈیشا سے ہے۔ شاکر کریمی، حنیف سید، ندیم راعی، منیر ارمان نسیمی، سالک ادیب کے افسانے بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر اختر آزاد کی کتاب 'تنویر اختر رومانی: شخص اور افسانہ نگار' پر نوجوان ناقد محمد غالب نشتر نے جامع تبصرہ کیا ہے۔ مدیر ڈاکٹر سید مشیر عالم نے مشاعروں کے زوال کے حوالے سے تلخ باتیں لکھی ہیں:

''زبان کی نزاکتوں سے آج کے مشاعرے باز شاید خود واقف نہیں ہیں۔ یہ بھلا اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کریں گے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ مشاعروں میں زبان بھی سیکھتے تھے اور ادب و آداب بھی، لیکن آج کے زیادہ تر مشاعرے بے ادبی کا اڈہ بن چکے ہیں۔''

اس رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر مشاعرے سے وابستہ بہت سے شعرا بھی اس طرح کے زوال کی شکایتیں کرتے رہے ہیں۔

'نقطۂ نگاہ' کے عنوان سے مشرف عالم قاسمی کی مختصر مگر مفید تحریر بھی شامل اشاعت ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ رسالہ اڈیشا میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ معاصر ادبی رسائل کے ساتھ ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ قاری اور قلمکار کے قحط کی وجہ سے رسالے میں وہ معنی خیز مباحث شامل نہیں ہو پاتے جن سے نئے ادب کی سمت و رفتار اور پرانے ادب کے مسائل سے آگہی کی کوئی صورت سامنے آئے۔ اسی وجہ سے سرسری نوعیت کے مشمولات پر ہی رسائل کے مدیران کو قناعت کرنی پڑتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے رسائل کا منہج تبدیل کریں تاکہ رسائل کا افادی دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ مجھے امید ہے کہ 'فروغ ادب' اس سمت میں پیش قدمی کرے گا۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

داراشکوہ ہندوستان کے ثقافتی تشخص کا حقیقی نمائندہ تھا: شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل میں شیامل گنگوپادھیائے کے ناول 'شہزادہ داراشکوہ' کے اردو ترجمے کا اجرا

نئی دہلی: آج یہاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں معروف بنگالی ادیب شیامل گنگو پادھیائے کے ضخیم ناول 'شہزادہ داراشکوہ' کے اردو ترجمہ کا ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور دیگر شخصیات کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اردو ترجمہ معروف مترجم جناب خورشید عالم نے کیا ہے اور یہ ناول ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ اس موقعے پر شیخ عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ میں داراشکوہ کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ شہزادہ تھا، بلکہ اس لیے ہے کہ وہ ہندوستان کے ثقافتی تشخص اور انفرادیت کا پروردہ اور اس کا حقیقی نمائندہ تھا، وہ شہزادہ ہونے کے باوجود ایک صوفی منش انسان تھا، تمام مذاہب کو ایک ساتھ لے کر چلنے اور ان کے اندر پائے جانے والے مشترک نکات کو پیش نظر رکھ کر سماجی ہم آہنگی کے قیام میں دلچسپی رکھتا تھا، اسی وجہ سے وہ ہر مذہب کی اہم شخصیات اور کتابوں کا مطالعہ کرتا اور ان کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ بعد کے دنوں میں ایک بڑے حلقے میں اس کی شخصیت مجروح قرار دی گئی اور علمی اعتبار سے بھی اس پر کم کام کیا گیا، مگر اب حالات بدل رہے ہیں اور داراشکوہ کی شخصیت و افکار کے مطالعے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اسی سلسلے کا 'شہزادہ داراشکوہ' نامی دو جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم ناول ہے، جو دراصل بنگلہ زبان میں لکھا گیا ہے، پھر اس کا ہندی ترجمہ ہوا اور اس کا اردو ترجمہ محترم خورشید عالم نے کیا ہے جس کے لیے موصوف لائق مبارکباد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اس نے اس ناول کی ورق گردانی کی ہے، مجھے محسوس ہوا کہ خورشید صاحب نے بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ترجمے میں تخلیقیت اور اصل متن کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس ناول کے مطالعے سے نہ صرف داراشکوہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے بہت کچھ جاننے کا موقع ملتا ہے بلکہ پورے ایک عہد کی عکاسی ہو جاتی ہے۔

معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے داراشکوہ کی شخصیت، اس کی مظلومیت اور ہندو مسلم اتحاد و اشتراک کے فروغ کے تئیں اس کی غیر معمولی دلچسپی پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ داراشکوہ تاریخ ہند کا ایک بدنصیب کردار ہے، جو ہندوستان کی تقدیر اور تصویر بدلنا چاہتا تھا، مگر اقتداری سیاست کی ستم ظریفی نے اس کی تقدیر و تصویر ہی بگاڑ دی۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ داراشکوہ ہر مذہب و فکر میں موزونیت کا متلاشی تھا، تصوف اور بھگتی سے خاص تعلق رکھتا تھا۔ اپنی معروف کتاب مجمع البحرین میں اس نے اسلام اور ہندومت کے درمیان ہم آہنگی و امتزاج کے نکات پر ہی گفتگو کی ہے، داراشکوہ کا ذہن تکثیریت پسند تھا اور وہ مذہبی رواداری اور بقائے باہم کا قائل تھا۔ داراشکوہ پر لکھے گئے ناول کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ مغلیہ تاریخ کے المیہ کردار داراشکوہ پر مختلف زبانوں میں بہت کام ہوا ہے، اردو میں بھی متعدد تذکرے، ناول اور ڈرامے لکھے گئے ہیں، شیامل گنگوپادھیائے نے بنگلہ زبان میں 'شہزادہ داراشکوہ' کے عنوان سے دو جلدوں میں ناول لکھا تھا، جس کا ہندی سے اردو ترجمہ خورشید عالم نے کیا ہے، اردو دنیا میں اس ترجمہ شدہ ناول کا استقبال ہونا چاہیے۔

کتاب کے مترجم جناب خورشید عالم نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو تخلیقی شکل میں پیش کرنے کی دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کتاب کا مختصر تعارف کروایا اور بتایا کہ جلد اول میں جہانگیر اور شاہجہان کے دور کا احاطہ کیا گیا ہے اور دوسری جلد میں داراشکوہ، اورنگزیب اور ان کے دور کے احوال و واقعات کا بیان ہے۔ انھوں نے کتاب کے پلاٹ، کہانی اور کرداروں کی پیش کش کی خوبی کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو ایک بار شروع کرنے کے بعد اختتام تک پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس موقعے پر انھوں نے کونسل کے ڈائرکٹر اور تمام حاضرین کا خصوصی شکریہ بھی ادا کیا۔ پروگرام میں کونسل کا اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 نومبر 2021

صوبہ جموں میں اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی پر پانچ روزہ ورکشاپ

جموں: شعبہ اردو جموں یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے ''صوبہ جموں کے اردو صحافیوں اور صحافت کے طالب علموں کی صلاحیت سازی'' میں اضافے کے سلسلے میں پانچ روزہ ورکشاپ 26 تا 30 نومبر 2021 کو منعقد ہوئی جس کی افتتاحی تقریب 26 نومبر کو پروفیسر گیان چند جین سیمی نار ہال جموں یونیورسٹی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت وائس چانسلر جموں یونیورسٹی کر رہے تھے جبکہ مہمان خصوصی پروفیسر عقیل احمد، ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور

مہمان ذی وقار نامور صحافی وسماجی کارکن سہیل کاظمی شریک ہوئے۔ اس دوران مختلف موضوعات پر بات چیت کی گئی اور سب سے پہلے صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی پروفیسر ریاض احمد نے کہا کہ صوبہ جموں کے اردو صحافیوں اور صحافت کے طالب علموں کی صلاحیتوں میں نکھار لانے کے حوالے سے شعبہ اردو، این سی پی یو ایل (NCPUL) نئی دہلی کے تعاون سے پانچ روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں نامور صحافی حضرات ریسورس پرسنز شامل ہوں گے اور اردو اخبارات میں کام کر رہے صحافیوں کو تربیت دیں گے۔ افتتاحی تقریب کے صدارتی خطبہ میں پروفیسر منوج کمار دھر نے کہا کہ اردو صحافیوں کیلیے یہ ورکشاپ کافی معلوماتی اور انھیں اپنی تحریری وتکنیکی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کیلیے اہم ثابت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اردو برصغیر کی تاریخی زبان ہے اور اس زبان کا جموں وکشمیر میں بھی اہم مقام ہے۔ افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر عقیل احمد، ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنے خطبہ میں کہا کہ اردو کو تحفظ دینا ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے اور صحافیوں کی صلاحیت سازی سے نہ صرف صحافت بلکہ مجموعی طور پر اردو کو تحفظ ملے گا۔ مہمان ذی وقار نامور صحافی سہیل کاظمی نے کہا کہ اردو صحافت نے جدوجہد آزادی میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور اردو ایک عوامی زبان ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو کسی مخصوص مذہب سے جوڑنا نا انصافی ہوگی۔ اردو اخبارات ملک کی 18 ریاستوں اور یونین ٹیریٹریز (U.T) میں شائع ہوتے ہیں لیکن موجودہ وقت میں دیگر زبانوں کی طرح اردو صحافت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا لازمی ہے اور یہ ورکشاپ اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ افتتاحی تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرحت شمیم نے انجام دیے جبکہ شکریہ کی تحریک ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے پیش کی۔ ورکشاپ میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ افراد صحافیوں، ڈائریکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز کے اہلکاران، اسکالرس، فیکلٹی ممبران اور معزز شہریوں بشمول خالد حسین، اسیر کشتواڑی، خورشید کاظمی اور دیگر معزز شخصیات نے شرکت کی۔ بعدازاں دو اکیڈمک سیشن منعقد ہوئے جن میں شاہنواز خان، بیورو چیف نیوز نیشنل اور پروفیسر محمد کاظم نے صحافت سے متعلق اہم موضوعات پر لیکچر دیئے جنھیں شرکا نے خوب سراہا اور سوالات وجوابات بھی ہوئے۔

'اردو صحافیوں کی صلاحیت سازی' ورکشاپ کے دوسرے دن انورادھا بھسین، سمیر بٹ، پردیپ دتہ اور الطاف جنجوعہ نے لیکچر دیے۔ منعقدہ پانچ روزہ ورکشاپ کے دوسرے دن چار تکنیکی سیشن منعقد ہوئے جن میں معروف ریسورس پرسنز نے مختلف موضوعات کے تحت شرکاء کو لیکچر دیے۔ نیوز 18 کے سینئر جرنلسٹ سمیر احمد بٹ، معروف صحافی مدیر اعلی انگریزی روزنامہ کشمیر ٹائمز انورادھا بھسین، نیوز نا ؤٹی وی چینل کے سینئر جرنلسٹ پردیپ دتہ اور ایگزیکٹو ایڈیٹر روزنامہ اڑان الطاف حسین جنجوعہ نے بالترتیب جرنلزم اور نئی نسل، صحافت میں اظہار رائے کی آزادی، صحافتی ذمہ داری اور سٹوری کو کیسے کور کریں اور اخبارات میں ادارتی امور اور طباعت واشاعت جیسے موضوعات پر تفصیلی خیالات کا اظہار کیا۔

پانچ روزہ ورکشاپ کے تیسرے دن تین اجلاس منعقد ہوئے جن میں معروف صحافیوں نے مختلف موضوعات کے تحت سامعین کو لیکچر دیے۔ ڈگری کالج راجوری کے پروفیسر عاشق ملک نے صحافت تعارف، تاریخی حیثیت اور صحافتی امن، ای ٹی وی (ETV) اردو کے محمد اشرف نے موجودہ عہد میں صحافت کی اہمیت اور کشمیر ٹائمز کے سدھیر کمار نے سرخیاں کیسے بنائی جاتی ہیں جیسے موضوعات پر تفصیلی خیالات کا اظہار کیا۔ اس دوران شرکاء نے لیکچر کے بعد سوالات بھی قائم کیے جن کے تسلی بخش جوابات دیے گئے۔ اس موقعہ پر صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی پروفیسر محمد ریاض احمد، ڈاکٹر فرحت شمیم، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ، ڈاکٹر رضا محمود، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر محمد علی شہباز، مرتضی خان، سائیہ قاضی و دیگران بھی موجود رہے۔

منعقدہ پانچ روزہ ورکشاپ کے چوتھے روز تین سینئر صحافیوں نے صحافت سے متعلق مختلف موضوعات پر تفصیلی لیکچرز پیش کیے۔ پہلی نشست میں سنیئر اردو صحافی رحمت اللہ رونیال نے صحافت کی زبان موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے خبر، خبر لکھنے کا طریقہ، زبان، معلومات وغیرہ کے متعلق کئی اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ دوسری نشست میں انگریزی روزنامہ ایکسلشر کے خصوصی نامہ نگار نشی کانت کھجوریہ نے خبر لکھنے کی اہمیت پر لیکچر پیش کیا۔ تیسری اور آخری نشست میں عالمی شہرت یافتہ سنیئر صحافی اور دی ڈسپیچ کے مدیر اعلی ظفر چودھری نے اردو صحافت کا تاریخی پس منظر اور جموں کشمیر سے شائع ہونے والے موجودہ انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے اردو صحافت کے موجودہ معیار اور اس میں پائی جارہی خامیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ بہتری لانے کے لیے کئی اہم تجاویز پیش کیں۔ پانچ روزہ ورکشاپ میں عامل صحافیوں کے علاوہ شعبہ اردو کے پی ایچ۔ ڈی، ایم۔ فل اسکالرز صوبہ جموں کے مختلف کالجوں سے اردو پروفیسرز، لیکچررز حضرات حصہ لے رہے تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے انجام دیے جبکہ آخری نشست کے بعد شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد ریاض احمد نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔

ورکشاپ کا پانچواں اور آخری دن تین نشستوں پر مشتمل رہا، پہلی دو نشستوں میں ڈاکٹر محمد عاشق ملک اور فہیم ٹاک نے شرکا کی معلومات کو مزید نکھارنے کے لیے اردو صحافت اور Peace of Journalism جیسے فصیح و بلیغ موضوعات پر لیکچر دیے جبکہ فہیم ٹاک نے اردو زبان اور صحافت کے متعلق اپنے تجربات کو سامعین کے سامنے پیش کیا۔ اس ورکشاپ کی آخری سیشن میں پروفیسر شہاب عنایت ملک جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا موجودہ منظر نامہ پر پُرمغز لیکچر دیا جس کی پزیرائی شرکا، حضرات نے کھل کر کی۔

اس کے بعد Validatory سیشن منعقد ہوا جن میں سید اقبال کاظمی مدیر اعلیٰ اڑان مہمان خصوصی، پروفیسر شہاب عنایت ملک ایوان صدارت اور صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد ریاض احمد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس دوران نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرحت شمیم شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے انجام دیے۔ بعد ازاں شرکا کے درمیان اس ورکشاپ کی اسناد تقسیم کی گئیں۔ اس پانچ روزہ ورکشاپ میں کل سولہ ریسورس پرسنز نے الگ الگ موضوعات پر اپنے لیکچرز دیے اور ان تمام اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالرشید منہاس شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔

رپورٹ: ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، جموں

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

عظیم بیگ چغتائی اور مشتاق احمد یوسفی، ایک تقابلی جائزہ

جودھپور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور میں تیسرے عظیم بیگ چغتائی یادگاری خطبے کا انعقاد ہوا۔ یہ خطبہ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین جناب اے رحمٰن ایڈوکیٹ نے 'عظیم بیگ چغتائی اور مشتاق احمد یوسفی، ایک تقابلی جائزہ' کے موضوع پر دیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کہا کہ راجستھان عظیم بیگ چغتائی کی کرم بھومی اور مشتاق احمد یوسفی کی جنم بھومی رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں کا زمانہ الگ ہے۔ دونوں کے فکری سروکار بھی مختلف ہیں لیکن دونوں اردو ادب میں طنز و مزاح کے اساطین میں سے ہیں۔ دونوں کی اخلاقیات اور

تہذیبی ترجیحات اور کسی حد تک موضوعات بھی جداگانہ ہیں۔ انھوں نے مولانا آزاد یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو مبارکباد دی کہ انھوں نے اس لیکچر کو قائم کرکے عظیم بیگ چغتائی جواب جودھپور کی خاک کا حصہ ہیں انھیں ادبی منظرنامے پر ایک دفعہ پھر زندہ کیا ہے۔ اس خطبے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی تھے جنھوں نے کہا کہ قومی کونسل کے ذریعے ان خطبات کے انعقاد میں اشتراک اپنی ادبی روایات، شاہکار تخلیقات اور ان کے خالقوں کی بازیافت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور، یہاں کے چند جیالوں کے جذبے، جنون اور غیر معمولی ایثار کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ انھوں نے اس یادگاری خطبے کے قیام کے لیے یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر اختر الواسع کی کوششوں کو سراہا۔ انھوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ کونسل کے جن دوسرے پروگراموں کو مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی ہم سے مانگے گی ہم اس کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔

اس یادگاری خطبے کی صدارت، پدم شری پروفیسر اختر الواسع سابق صدر مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور و پروفیسر ایمریٹس، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے کی اور انھوں نے اے رحمان کے عالمانہ خطبے اور ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت پر شکریے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں طنز و مزاح کا کوئی تذکرہ عظیم بیگ چغتائی ہوں یا مشتاق احمد یوسفی کے بغیر ادھورا ہی رہے گا۔ دونوں کا تعلق علی گڑھ سے بھی تھا اور راجستھان سے بھی۔ انھوں نے کہا کہ عظیم بیگ چغتائی نے اپنی ذاتی زندگی میں کرب اور مایوسی کے باوجود جس طرح خود کو اور ہمیں اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے ہنسایا، وہ غیر معمولی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشتاق احمد یوسفی کی جہاں اور خوبیاں ہیں وہاں وہ تصرف کے بھی بادشاہ ہیں۔

اس موقعے پر مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے برہانی کالج ممبئی کے سابق صدر شعبۂ اردو اور مشہور شاعر ڈاکٹر قاسم امام نے شرکت بھی کی اور مولانا آزاد یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو ایسے بامعنی اور پرمغز لیکچر کے لیے مبارکباد دی۔ لیکچر کے آغاز میں مولانا آزاد یونیورسٹی کے چیئرپرسن الحاج محمد عتیق نے مہمانوں کا استقبال کیا اور یونیورسٹی کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی۔ آخر میں یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر جمیل کاظمی نے مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ آئندہ بھی ایسے پروگرام کرتے رہیں گے تاکہ جن کے ذریعے نئی نسل اور اردو کا رشتہ بنا رہے۔ اس پروگرام کی نظامت مولانا شاہد حسین ندوی نے کی۔ اس تقریب میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، جودھپور کے صدر محمد علی چندری گر، جنرل سکریٹری نثار احمد خلجی، خازن عطاء الرحمٰن قریشی، یونیورسٹی کے رجسٹرار انور علی، ڈپٹی رجسٹرار محمد امین، ڈین اکیڈمکس ڈاکٹر عمران خان پٹھان، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، کنوینر پروگرام عزیز الحسن، حاجی محمد اسحاق، محمد صابر یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 نومبر 2021

خواجہ میر درد: فن اور شخصیت

نئی دھلی: مدرسہ اکرام الاسلام ٹرسٹ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'خواجہ میر درد: فن اور شخصیت' کے موضوع پر کمیونٹی ہال، مدرسہ اکرام الاسلام ٹرسٹ میں ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا، جس کی صدارت دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ذاکر خان نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی کی نامور سماجی تنظیم 'صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ' کے نوجوان صدر محمد سلیم دہلوی نے شرکت کی، جب کہ نظامت معروف شاعر و ناظم محمد انس فیضی نے کی۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ذاکر خان نے کہا کہ خواجہ میر درد کا شمار دنیا کے نامور بزرگوں میں ہوتا ہے، اس لیے بستی خواجہ میر درد میں مقیم افراد

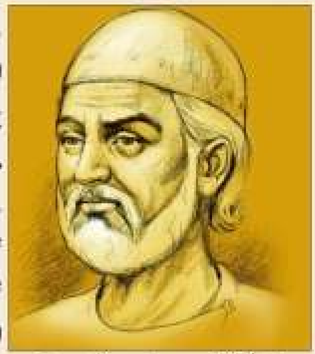

کے لیے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں، بلکہ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں خواجہ کی چوکھٹ نصیب ہوئی ہے۔ اس سے قبل مدرسہ اکرام الاسلام ٹرسٹ کے عہدیداروں نے مہمانوں کا شال اوڑھا کر استقبال کیا۔ ٹرسٹ کے صدر محمد حفیظ بھلو پردھان نے ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم ان کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارے اس مخصوص مشن کی ابتدا کرنے میں ہمارا تعاون کیا۔ سماجی تنظیم 'صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ' کے جواں سال متحرک و فعال صدر محمد سلیم دہلوی نے کہا کہ مدرسہ اکرام الاسلام ٹرسٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ انھوں نے اس عظیم ہستی پر سمینار کے لیے سوچا کیونکہ یہ بستی خواجہ میر درد کے نام نامی سے ہی منسوب ہے، اس لیے یہاں پر یہ سمینار بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔ معروف سماجی کارکن اعتبار نے کہا کہ یقیناً یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم خواجہ کی چوکھٹ سے وابستہ ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئر مین ذاکر خان سے درخواست کی کہ جواہر لال نہرو مارگ کا نام تبدیل کرکے 'خواجہ میر درد روڈ' کرانے میں ہماری رہنمائی فرمائیں، کیونکہ یہ روڈ براہ راست اس بستی سے منسلک ہے۔ ڈاکٹر سرفراز جاوید نے خواجہ میر درد کی شخصیت اور فن پر مقالہ پیش کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2021

اختر الایمان: حیات و خدمات

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے نہرو یوا کلب ہاتھی پور چتو کے زیر اہتمام 'اختر الایمان حیات اور خدمات' کے عنوان سے ایس آر پبلک اسکول خواجہ نگر میں ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر شفیع ایوب جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی نے کہا کہ علامہ اقبال کے بعد اگر کوئی نظم کا سب سے بڑا شاعر ہوا ہے تو وہ اختر الایمان ہیں، جہاں ایک طرف

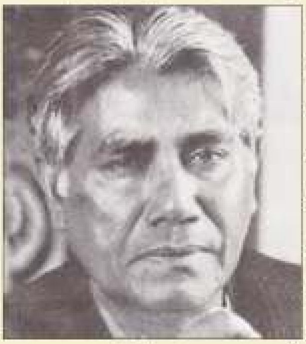

انھوں نے فلم اداکار دلیپ کمار کو وقت، قانون، دھرم پتر جیسی ایک درجن سے زائد ہٹ فلمیں دیں، وہیں دوسری طرف انھوں نے راج کمار کو مشہور ڈائیلاگ 'جن کے گھر شیشے کے ہوتے ہیں، وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے' دیا۔ انھوں نے کہا کہ اختر الایمان نے بجنور کے نجیب آباد میں جنم لے کر پوری دنیا میں نام روشن کیا۔ انھوں نے فلمی دنیا میں 50 سے زائد ہٹ فلمیں دیں اور مکالمے لکھے۔ 1962 میں اختر الایمان کو قومی ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ آل انڈیا مسلم فیڈریشن کے قومی صدر بابر خان نے اختر الایمان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کے بارے میں بتایا۔ سماجی کارکن محمد احمد نے بھی اس شاندار شخصیت کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ سمینار میں محمد معروف، معین، گلشن جہاں، سید آصف، تمیم احمد سیمی، مشرفی انجم وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر معراج عالم، ڈاکٹر اسحاق، سلیم حسین، فصیح الرحمٰن بیگ، مرزا عارف بیگ، محمد روشان ترکی، رویندر کمار گپتا، فرزانہ انقلاب عالم، اکرام احمد وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض سید آصف حسن نے سرانجام دیے اور کلمات تشکر کلب کے صدر محمد جان ترکی نے پیش کیے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 29 نومبر 2021

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

مولانا آزاد ایک مجتہد عصر

نئی دھلی: مولانا ابوالکلام آزاد نایاب شخصیت کے مالک تھے، جیل میں بند رہتے ہوئے انھوں نے گراں قدر علمی خدمات انجام دیں، آزادی کی تحریک سے لے کر آزادی کے بعد 1958 تک وہ سرگرم رہے، انھوں نے تین اکادمیوں کی بنیاد ڈالی، آئی سی سی آر، آزاد بھون انھی

سے منسوب ہے۔ وہ نہ صرف ملک کے پہلے وزیر تعلیم رہے، بلکہ اولین آئی آئی ٹی بھی انھی کی رہین منت ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر کرن سنگھ سابق مرکزی وزیر حکومت ہند و سابق صدر آئی سی سی آر نے مولانا آزاد اکیڈمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام آئی سی سی آر، آزاد بھون میں 'مولانا ابوالکلام آزاد ایک مجتہد عصر' کے موضوع پر منعقدہ ایک روزہ نیشنل سمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج مولانا آزاد کا یوم پیدائش ہی نہیں، بلکہ ہمارا یوم احتساب بھی ہے کہ ہم نے آزادی کے بعد سے اب تک کیا کھویا اور کیا پایا، مولانا آزاد کی نگاہیں مستقبل کی تعمیر و ترقی پر مرکوز تھیں، انھوں نے کم عمری میں ہی تمام متداول کتابیں پڑھ لی تھیں، خاندانی وجاہت کو مستعار نہیں لیا، بلکہ وہ جو کچھ بھی بنے اس میں ان کی جد و جہد کو دخل تھا۔ مولانا آزاد کو جو فہم و ادراک ملا وہ عطائے خداوندی تھا۔ سمینار کے روح رواں اور مولانا آزاد اکیڈمی کے جنرل سکریٹری نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد مفکر و مدبر، مفسر قرآن اور صحافی تھے۔ انھوں نے جو اجتہادی کارنامے انجام دیے، ان کو نہ صرف باقی رکھنے بلکہ آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ آزاد اکیڈمی کے صدر محمد ادیب سابق ایم پی راجیہ سبھا نے اپنے خطاب میں مولانا آزاد کی قومی و ملی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد ایک نابغہ شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے ملک کی تعمیر و ترقی کا جو خاکہ قوم کو دیا آج اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے گم گشتہ میراث کو پا سکتے ہیں۔ قبل ازیں مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی امیر جمعیۃ اہل حدیث نے افتتاحی خطاب میں مولانا آزاد کے علمی و اجتہادی کارناموں سے سامعین کو روشناس کرایا۔ سابق چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ اقبال انصاری، پروفیسر خالد محمود سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی مولانا آزاد کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کیے۔ سمینار کی پہلی نشست میں پروفیسر نعیم الحسن اثری، صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، پروفیسر ابوبکر عباد، استاذ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، معروف صحافی سہیل انجم اور ڈاکٹر جسیم الدین نے مقالات پڑھے۔ کلمات تشکر مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے پیش کیے، سمینار کی نظامت ڈاکٹر شیث محمد ادریس تیمی نے کی۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 12 نومبر 2021

موجودہ دور میں تفہیم آزاد

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت کے موقعے پر 'موجودہ دور میں تفہیم آزاد' کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر منعقد کیا۔ پروفیسر ایس عرفان حبیب، سابق مولانا آزاد چیئر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن نے یہ اہم خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر نجمہ اختر شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروگرام کی صدارت فرمائی جس میں نائب شیخ الجامعہ پروفیسر تسنیم فاطمہ، مسجل، جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر ناظم حسین الجعفری، پروفیسر اعجاز مسیح، ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن اور یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ اور غیر تدریسی عملے نے شرکت کی۔ پروفیسر ناہید ظہور صدر شعبہ آئی اے ایس ای، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مہمان مقرر کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر ارشد اکرام احمد، صدر شعبہ تعلیمی مطالعات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر عرفان حبیب نے مولانا آزاد کے سیاسی اور دانشورانہ کیریئر، ان کی فکر اور ان کے تصور قومیت کے مختلف اہم اور نامعلوم پہلوؤں سے سامعین کو آگاہ کرایا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد جیسی نابغہ اور قد آور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ایک لیکچر میں سمیٹنا مشکل ہے۔ پروفیسر نجمہ اختر شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ قومی تعلیم کا دن ہمیں بھارت رتن اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو صرف خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتا بلکہ گزشتہ سال کی ہماری حصولیابیوں کا تنقیدی جائزہ لے کر نئے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مشن کے حصول کے لیے خود کو تیار کرنے کا بھی موقع دیتا ہے۔ پروفیسر اختر نے مزید کہا کہ ہم آج قومی تعلیم کا دن منا کر اپنی دوہری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ممتاز ہستی جن کا نام دنیا کی اہم شخصیات کے ساتھ لیا جاتا ہے انھیں یہ ہماری تازہ اور شاندار کامیابی مناسب خراج ہے۔ شیخ الجامعہ نے سامعین سے یہ کہتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشن کو آگے لے جانے کے سلسلے میں نئے سرے سے عہد کریں اور جامعہ کو اس کی موجودہ کامیابیوں سے اور بھی اوپر لے جانے میں ان کے سچے متبع اور پیروکار بنیں۔ اس موقعے پر شیخ الجامعہ اور پروفیسر ایس عرفان حبیب نے سینٹر فار انفارمیشن اور ٹکنالوجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خطبے کے آغاز سے قبل مولانا ابوالکلام آزاد پر کتابوں کی نمائش کا بھی افتتاح کیا۔ پروفیسر اعجاز مسیح، ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 14 نومبر 2021

پڑھنے کی دلچسپی نئی سمتوں پر

نئی دھلی: قومی کتاب ہفتہ کے موقعے پر ساہتیہ اکادمی نے 'پڑھنے کی دلچسپی نئی سمتوں پر' عنوان سے ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا۔ اس موقعے پر نامور صحافی اننت وجے،

ڈائریکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن سنجے دویدی، ٹیکنیشین بلیند وشرما ددھیچ، ایڈیٹر اور بچوں کے ادیب پنکج چترویدی، شاعر اور نقاد راجیش کمار ویاس اور کہانی نویس گیتا شری نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سرینواس راؤ کی تحریری استقبالیہ تقریر ساہتیہ اکادمی کے ہندی ایڈیٹر اور پروگرام ڈائرکٹر انوپم تیواری نے پیش کی۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ نئی نسل میں پڑھنے کا شوق بیدار کرنے کے لیے نئے فنی ذرائع کی مدد سے نئے مضامین پر بھی غور کرنا ہوگا۔ راجیش کمار ویاس نے اپنے بیان میں کہا کہ تکنیکی ذرائع نے بڑے پیمانے پر نصابی کتب تک رسائی کو ممکن بنایا ہے، تاہم یہ کہنا غلط ہوگا کہ لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا رجحان کم ہوا ہے۔ ریویو یا سوشل میڈیا میں جان بوجھ کر بعض کتابوں کو بیسٹ سیلر بنانے کے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کتابوں کی دنیا میں صرف اچھے مضامین ہی زندہ رہتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کا پروپیگنڈہ بے معنی ہے۔ نامور صحافی اور ماس کمیونی کیشن آف انڈیا کے ڈائرکٹر سنجے دویدی نے کہا کہ کتابیں مشکل وقت میں امید لاتی ہیں۔ بالیند وشرما ددھیچ نے کہا کہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ایک نئی ریڈرشپ پیدا ہوئی ہے اور اس کے پڑھنے کی عادت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ بچوں کے نامور ادیب پنکج چترویدی نے بچوں کے ادب کی کتابوں اور ان کی اشاعت کے بارے میں تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ بچے تکنیکی علم سے بھی اچھوتے نہیں ہیں، لیکن انھیں دقیانوسی افسانوں کی کہانیوں کے علاوہ پڑھنے کے لیے کچھ نیا دینے کی ضرورت ہے جس کے بعد وہ پڑھنے کی فطری لذت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ رائٹرز پبلشرز کو بچوں کے سامنے نئی زندگی کی اقدار کو ابھارنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ کہانی کار اور صحافی گیتا شری نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کے بہتر ادب کے ساتھ ساتھ ہمیں نان فکشن صنفوں پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2021

کرنے کے لیے پروفیسر نجمہ اختر، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر خان نے طبی تحقیق، ادویات کی معیار بندی، دوائی پودوں کی کاشت اور سروے اور ادبی تحقیق میں سی سی آر یو ایم کی کامیابیوں پر روشنی ڈالی اور معاون اداروں بالخصوص جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعاون کا ذکر کیا۔ انھوں نے یونانی طب کے علم اور کلاسیکی کتابوں کے تحفظ، ترجمہ، تدوین و تالیف اور اشاعت میں جامعہ میں قائم حکیم اجمل خان انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹاریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی حصولیابیوں کا خاص طور پر ذکر کیا۔ پروفیسر خان نے اسٹینفورڈ کی فہرست میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 16 محققین کی شمولیت کا ذکر کیا اور اس حصولیابی کے لیے پروفیسر نجمہ اختر کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر نجمہ اختر نے اپنے خطاب کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حالیہ حصولیابیوں بالخصوص نیشنل انسٹی ٹیوشنل رینکنگ فریم ورک (این آئی آر ایف) 2021 میں ملک کی 'ٹاپ 10 یونیورسٹیوں' میں چھٹا مقام ملنے کے بارے میں بتایا۔ پروفیسر نجمہ اختر نے پروفیسر عاصم علی خان کے ساتھ اپنی قریبی وابستگی کا ذکر کیا اور امید ظاہر کی کہ یہ تعلق دونوں اداروں کے ماہرین تعلیم اور محققین کے درمیان بالخصوص دونوں اداروں اور بالعموم معاشرے کی بہتری کے لیے مضبوط تعلق کا باعث بنے گا۔ انھوں نے قومی اور عالمی سطح پر یونانی طب کی موجودگی کو سراہا اور سی سی آر یو ایم کے کام کی تعریف کی۔ انھوں نے یونانی طب میں تحقیقی حصولیابیوں کے لیے پروفیسر عاصم علی خان اور ان کی ٹیم کی ستائش کی۔ پروفیسر نجمہ اختر اور پروفیسر خان نے دونوں اداروں کے درمیان باہمی تعاون اور اشتراک کو مضبوط بنانے پر بھی تفصیلی بات چیت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 نومبر 2021

آف ایکسٹرنل افیرز، گورنمنٹ آف انڈیا کی معیت میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر مینا نقوی کی 3 کتابوں کی رونمائی عمل میں آئی۔ اس تقریب میں سب رس اکیڈمی کے ذریعے معروف ادیب اور صحافی ڈاکٹر شیخ نگینوی کو 'مینا نقوی اعزاز' سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام دو اجلاس پر مبنی تھا۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر مینا نقوی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی جب کہ دوسرا پروگرام محفل مشاعرہ پر مبنی تھا۔ پہلی نشست کی نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی جب کہ محفل مشاعرہ کی نظامت کے فرائض ملک زادہ جاوید نے انجام دیے۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر مینا نقوی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے معروف شاعر ملک زادہ جاوید نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام بہت معیاری اور ادبی حوالے سے بہت بڑا پروگرام تھا۔ ڈاکٹر مینا نقوی بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتی تھیں۔ ان کا لب ولہجہ اور ان کی شاعری اپنے عہد کی دوسری شاعرات سے منفرد اور اچھی تھی۔ ان کے کلام کی گہرائی اور گیرائی کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ 19 کتابوں کی خالق ڈاکٹر مینا نقوی کی وفات 2020 میں ہوئی تھی۔ ملک زادہ جاوید نے کہا کہ شاعری الہامی چیز ہے، اللہ تعالیٰ جن کو نوازتا ہے، وہی اچھی شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جو صرف خواص کو متاثر کرے وہ شاعری نہیں ہے، بلکہ شاعری وہ ہے جو خواص کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی متاثر کرے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خالد محمود سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر نصرت مہدی بھوپال، ڈاکٹر شیخ نگینوی وغیرہ نے ڈاکٹر مینا نقوی کے فن اور شخصیت پر تفصیلی گفتگو کی۔ دوسرے اجلاس میں محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت معروف شاعر شہپر رسول نے کی اور ڈاکٹر نصرت مہدی اور رضوان الدین فاروقی نے تمام شعرا کا استقبال کیا۔ محفل مشاعرہ میں ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر نصرت مہدی، عذرا نقوی، علینا عترت، شاہد انجم، خالد اخلاق، ترونا مشرا، مینا خان، عادل رشید اور سالم سلیم نے کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 نومبر 2021

اصولِ تحقیق پر قومی سمینار

نئی دھلی: سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم)، وزارت آیوش، حکومت ہند نے انڈیا ہیبی ٹیٹ سنٹر، نئی دہلی میں اصول تحقیق پر ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر عاصم علی خان، ڈائرکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم اور ایڈوائزر (یونانی)، وزارت آیوش، حکومت ہند نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت

یاد مینا نقوی

نئی دھلی: سب رس اکادمی: (سارہ ایجوکیشن اینڈ کلچرل سوسائٹی) بھوپال کے زیر اہتمام گولڈن ہال ہوٹل ریورویو، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی میں 'یاد مینا نقوی' کے تحت ضیا فاروقی، ڈاکٹر نصرت مہدی کی سرپرستی اور حفظ الرحمٰن ڈائرکٹر، لیٹن امریکہ اینڈ کیریبین ڈویژن منسٹری

صحافت و ادب کے لیے ایوارڈ تقریب اور مذاکرے کا انعقاد

نئی دھلی: اگر اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو اپنی گھریلو بول چال میں اسے رائج کریں۔ اپنے بجٹ کا کچھ حصہ اردو اخبارات اور رسائل کے لیے مختص کریں اور یہ تبھی ہوگا جب خود میں یہ جذبہ پیدا ہو۔ کانسٹی ٹیوشن کلب میں 'اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن' اور 'آل انڈیا یونانی طبی

صحافت وادب کے لیے ایوارڈ تقریب اور مذاکرے کا انعقاد

کانگریس' کے زیر اہتمام علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر ایوارڈ تقریب اور 'فروغ اردو کے لیے تحریکی لائحہ عمل' عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں یہ مشورے دیے گئے۔ جہاں ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اردو والے زبانی جمع خرچ زیادہ کرتے ہیں، وہیں مذکورہ دونوں تنظیموں کے بانی ڈاکٹر سید احمد خان اردو کی ترویج وارتقا کے لیے عملی کام کرتے ہیں۔ ہر سال ایوارڈ تقریب اور اردو کے تعلق سے محاسبہ کی دعوت دیتے ہوئے اردو والوں کو سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ اس سال مختلف تاریخی شخصیات کے نام پر صحافت وادب کی دنیا میں اہم خدمات کے اعتراف میں جن اہم لوگوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں ڈاکٹر شمس بدایونی، فاروق ارگلی، فاروق سید ممبئی، ڈاکٹر تابش مہدی، آفتاب حسنین ممبئی، ڈاکٹر شہاب الدین، محمد رامش، امیر احمد صدیقی امیر امروہوی، سنجے رائے، کوشل شرما، ڈاکٹر محمد نثار اور محترمہ شبانہ شامل تھیں۔ ایوارڈ یافتگان کی زندگی پر مختلف مگر اہم خاکے سینئر صحافی سہیل انجم نے لکھے۔ جن اہم اور سرکردہ شخصیات کو اسٹیج کی زینت بنایا گیا تھا ان میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر اختر الواسع، م افضل، ڈاکٹر سلیم قدوائی، مولانا محمد رحمانی اور معصوم مرادآبادی شامل تھے۔ قبل ازیں جن اہم لوگوں نے پروگرام کے آغاز پر لب کشائی کی اور اردو زبان کی چاشنی میں لپٹی ہوئی نظمیں پیش کیں، ان میں مولانا برہان قاسمی اور متین امروہوی نے سماں باندھ دیا۔ م افضل، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عبدالحق، معصوم مرادآبادی، مولانا محمد رحمانی اور ڈاکٹر سلیم قدوائی جیسی اہم شخصیات نے اردو کے تئیں اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ اردو زندہ کیسے رہے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو کی ترقی کے لیے جذبے اور کوشش کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خان نے اس موقع پر اپنا عزم دہرایا کہ وہ جس حد تک اردو کی خدمت کر سکتے ہیں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ تعلیم نسواں کی علمبردار خادمہ بیگم (بیگم ابوالخیر) کے نام سے حسب سابق عالمی یوم اردو یادگاری مجلے اور ایک کتابچے کا بھی اجرا عمل میں آیا۔ نظامت بہت خوبصورت انداز میں ڈاکٹر خبیب نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 نومبر 2021

'رفتگاں کا سراغ'

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ڈاکٹر سرورالہدیٰ کی کتاب 'رفتگاں کا سراغ' پر منعقدہ مذاکرے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو اور موقر ادیب وشاعر پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ ڈاکٹر سرورالہدیٰ کی کتاب نے میرے علم میں اضافہ کیا ہے۔ بہت سی باتیں جو حافظے سے محو ہوگئی تھیں، ان کی بازیافت ہوگئی۔ اس کتاب کا دائرہ وسیع ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں ناقدین، شعرا، محققین اور فکشن نگار سب موجود ہیں۔ سرورالہدیٰ کی نثر میں شفافیت، ترسیلیت اور انتقال معنی کی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کی یہ کتاب رفتگاں کا 'بامعنی سراغ' ہے۔ ممتاز دانشور اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ سرورالہدیٰ کی نظر اور گرفت کلاسیک اور جدید ادبیات پر یکساں ہے۔ 20-2004 میں لکھے گئے یہ مضامین یقیناً ادبی نگارشات کی قوس قزح ہیں۔ مرکز برائے السنہ ہند، جے این یو کے سابق سربراہ اور بزرگ ادیب و نقاد پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ سرورالہدیٰ نے 'رفتگاں کا سراغ' لکھ کر اپنے عہد کے ادیبوں کی زبانی تاریخ مرتب کردی ہے۔ اس کتاب میں نہ عقیدت ہے، نہ انکساری بلکہ ایک بالغ نظری ہے۔ ممتاز نقاد اور سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ سرورالہدیٰ نے خود کو ستی نمود و نمائش سے دور رکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ علمی انہماک سے وابستہ رکھا، یہ قابل قدر ہے۔ ممبئی سے تعلق رکھنے والے مشہور ادیب ونقاد محمد اسلم پرویز نے کہا کہ یادنگاری اور شخصیت نگاری کے ساتھ تجزیہ وتبصرہ کی آمیزش سرورالہدیٰ کی تحریروں کو وقیع اور منفرد بناتی ہے۔ بزرگ ادیب ودانشور پروفیسر عتیق اللہ نے مذاکرے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سرورالہدیٰ کی یہ کتاب مثالی ہے، جس میں انھوں نے نہایت صبر وتحمل کے ساتھ مختلف چہروں کی ایک انجمن سجادی ہے اور مختلف نظریہ وخیال کو یکجا کردیا ہے۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے معروف ادیب ودانشور پروفیسر سید خالد قادری نے کہا کہ 'رفتگاں کا سراغ' میں شامل تحریروں کی سرسری قرأت سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تاثراتی مضامین ہیں، لیکن گہرے مطالعے سے اس کی تردید ہوجاتی ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ علم وادب سے سرورالہدیٰ کی وابستگی بے نظیر وبے مثال ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز فکشن نگار اور شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر خالد جاوید نے کہا کہ آج کے انسان کو ماضی وحال کی فراموشی کا مرض لاحق ہے اور سرورالہدیٰ کی یہ کتاب اسی پر ایک ضرب کاری ہے بلکہ اس فراموشی کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ معروف ترجمہ نگار اور ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم والسنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر محمد اسدالدین نے اپنے پیغام میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔ صاحب کتاب ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ شام میرے لیے بہت تاریخی بن گئی ہے جس میں اہم شخصیات نے حصہ لے کر ان لمحوں کو یادگار بنادیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 نومبر 2021

اترپردیش

انتظار حسین کا فکشن

میرٹھ: انتظار حسین کی علمی وادبی فتوحات کی فہرست بہت طویل ہے۔ وہ داستان سے چل کر ایک دبستان کی

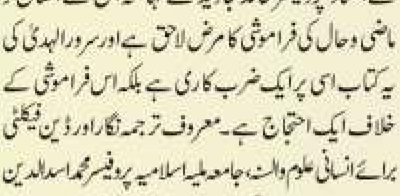

شکل اختیار کرچکے ہیں۔ انتظار حسین اپنی انسان دوستی اور اپنے ادبی کارناموں سے ایک طویل عرصے تک دلوں میں زندہ رہیں گے۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر قدوس جاوید کے جو بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن اور شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے مشترکہ اہتمام میں منعقد پروگرام بعنوان 'انتظار حسین کا فکشن' اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ انتظار حسین کے ناولوں اور افسانوں میں ہمیں انسانیت کا درس، سماجی کربناکی اور عام انسانوں کا درد نظر آتا ہے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی نے، شکریہ ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔ اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہاب ظفر اعظمی

نے کہا کہ انتظار حسین کے فکشن میں آج کے مسائل نظر آتے ہیں۔ انتظار حسین کے اسلوب کی خاصیت یہی ہے کہ آج کے سماجی، سیاسی مسائل کو ان کے اسلوب میں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کا اسلوب دیگر فکشن نگاروں سے منفرد ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ انتظار حسین کے یہاں ہجرت کا تصور ایک سرحد سے دوسری سرحد یا ایک بستی سے دوسری بستی میں چلے جانے کا نام نہیں ہے بلکہ ان سب سے پیدا ہونے والی اور ان سے نکلنے والی یادیں ہیں۔ ان کے لیے یہ یادیں ہی اس کے ماضی تک پہنچ پانے کا وسیلہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کی تخلیقات میں ذاتی، ملکی، قومی، اجتماعی یادوں کی زبردست کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس ہفتہ واری آن لائن پروگرام میں آیوسا کے سرپرست عارف نقوی، جرمنی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہت سے فکشن نگاروں کے فکشن میں یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ انھوں نے اپنی جڑوں کو ختم کردیا ہے مگر انتظار حسین واحد ایسے فکشن نگار گزرے ہیں جو ہمیشہ اپنی جڑوں سے جڑے رہے ہیں۔ آپ نے بڑی تعداد میں نئے ناقدین کو اپنی تخلیقات سے متاثر کیا ہے۔ اس موقعے پر جے این یو کے ڈاکٹر عمران عاکف نے بھی انتظار حسین کے فکشن پر اپنا پرمغز مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں محمد شمشاد، فیضان ظفر، مدیحہ اسلم، سیدہ مریم الٰہی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 نومبر 2021

اردو ادب کی ایک عبقری شخصیت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

لکھنؤ: منشی احتشام علی علوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام ماس کمیونیکیشنل سینٹر میں ایک سیمینار پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی یاد میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت معروف صحافی احمد ابراہیم علوی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر سابق جج بی ڈی نقوی رہے۔ اس موقعے پر ملک زادہ منظور احمد کی ادبی اور تحقیقی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ ملک زادہ کی ہر تحریر و تحقیق انفرادیت کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بھی فنکاری پائی جاتی ہے۔ وہ ان کے ایک عملی شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ ملک زادہ نے چھوٹے چھوٹوں کو بڑا بنا دیا مگر خود کبھی بھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھا تحقیق کی دنیا کے وہ ایک بے نظیر محقق تھے۔ الہدیٰ ماڈل اسکول کی پرنسپل تبسم علوی نے ان کے چند اشعار کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ عرصہ دراز قبل کہے ان کے اشعار آج بھی حالات حاضرہ پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ خطبۂ استقبالیہ میں مولانا فیروز خان ندوی نے کہا کہ سیاست کی طرح ادب میں بھی اقربا پروری اور جانب داری کا رجحان غالب نظر آنے لگا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ جن لوگوں نے ملک زادہ کے توسط سے شہرت و ناموری حاصل کی انھوں نے ہی ان کو فراموش کردیا۔ سابق جج بی ڈی نقوی نے کہا کہ جس شخص نے پوری دنیا میں اردو کو روشناس کرایا ہے اس کو شایان شان یاد کیا جانا چاہیے۔ معروف ناول نگار اے۔ ایم۔ یٰسین نے کہا کہ ملک زادہ صاحب ایک بے لوث اور مخلص خادم اردو تھے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے ملک زادہ صاحب کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پرویز ملک زادہ نے اپنے والد مرحوم کو ایک قلندر صفت انسان بتایا کہ تعلقات کی پاسداری میں بڑے بڑے پروگرام چھوڑ دیا کرتے تھے۔ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ اس موقعے پر شہر سخن کے دو معروف شاعر محسن عظیم اور عامر فاروقی کو انجینئر سید محمد شعیب کے ہاتھوں اعزاز سے نوازا گیا۔ ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عمیر منظر کو فخر ادب اور محسن خان منفرد طرز تحریر کے مالک کو پاسبان اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سیمینار میں معززین شہر نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 نومبر 2021

شمیم نکہت میموریل لکچر

لکھنؤ: شعاع فاطمہ چیریٹیبل ٹرسٹ اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام ہونے والا شمیم نکہت فکشن ایوارڈ کا آج کیفی اعظمی اکیڈمی میں انعقاد ہوا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر وسیم اختر نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جسٹس شبیہ الحسنین شریک رہے۔ اس تقریب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر طارق چھتاری نے پانچویں شمیم نکہت میموریل لکچر 'جدید فکشن کی فکری بنیاد' کی تخلیص پیش کی۔ پروفیسر چھتاری کے اس خطبہ کو شمیم نکہت میموریل کمیٹی کی جانب سے کتابی شکل میں تقسیم کیا گیا۔ منعقدہ پروگرام میں شمیم نکہت فکشن مقابلہ میں اول مقام حاصل کرنے والی کہانیاں پڑھی گئیں۔ جن میں لکھنؤ یونیورسٹی کی اسکالر حمرا عالیہ اور ممتاز پی جی کالج کی بی اے کی طالبہ الفت فاطمہ کی کہانیاں شامل رہیں۔ واضح رہے کہ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کی کل 6 کہانیاں منتخب ہوئی تھیں جن کو جسٹس شبیہ الحسنین نے انعامات سے نوازا۔ ان دونوں کہانیوں کی قرأت کے بعد ڈاکٹر رشیماں پروین نے پروفیسر شمیم نکہت کا افسانہ انصاف بہترین انداز میں پیش کیا۔ تقریب کے آغاز میں شعاع فاطمہ چیریٹیبل ٹرسٹ کے فاؤنڈر پروفیسر شارب ردولوی نے استقبالیہ کلمات میں تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں شاعری میں دبستان قائم ہیں اور یہاں کے اساتذہ کے زیرتربیت شعرا پیدا بھی ہورہے ہیں اور تربیت بھی پارہے ہیں لیکن کہانی لکھنے کے لیے کوئی مخصوص دبستان یا اساتذہ کا گروہ نہیں جہاں کہانی لکھنے والوں کی تربیت کی جاسکے یا ان کو اس طرف رغبت دلائی جاسکے۔ اسی لیے ہم نے شمیم نکہت افسانہ کمپیٹیشن کا انعقاد کیا اور اول انعام یافتہ طلبہ کو آپ حضرات کی موجودگی میں اپنی کہانی پیش کرنے کا موقع دیا تاکہ طلبہ کی ہمت افزائی ہوسکے۔ اس موقعے پر ساتویں ڈاکٹر شمیم نکہت فکشن ایوارڈ یافتہ عبدالصمد نے اپنی تقریر میں پروفیسر شارب ردولوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ سارے ایوارڈ سے ممتاز اس لیے ہے کہ ہر ایوارڈ یہاں تک کہ نوبل انعام بھی 'کنٹروورسی' کا شکار رہا ہے لیکن اس ایوارڈ میں کسی طرح کا کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر محمد کاظم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تشریف لائے پروفیسر شہزاد انجم نے پروفیسر شمیم نکہت کو اپنی تقریر میں یاد کیا۔ شبیہ الحسنین نے اپنی تقریر میں کہا کہ شارب ردولوی کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔ ان کے یہاں بزرگی، انکساری، ہمدردی اور محبت کی ناقابل بیان مثال ملتی ہے۔ تقریب کے صدر اور انٹگرل یونیورسٹی کے چانسلر سید وسیم اختر نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ آج جن کے تعلق سے یہ پروگرام منعقد ہوا ہے یعنی ڈاکٹر شمیم نکہت وہ ایک بہترین افسانہ نگار، قابل استاد اور باکردار خاتون تھیں۔

مہمانوں کا شکریہ تنظیم کے صدر کرار زیدی نے ادا کیا اور اس کامیاب پروگرام کی نظامت کے فرائض لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر عباس رضا نیر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 نومبر 2021

اردو اور ماس میڈیا

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیراہتمام ایک آن لائن پروگرام بعنوان 'اردو اور ماس میڈیا' منعقد ہوا، جس میں مہمان خصوصی روزنامہ 'انقلاب' ممبئی کے ایڈیٹر

شاہد لطیف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً اردو زبان اب بھی ٹکنالوجی سے دور ہے، نئی نسل کو چاہیے کہ اردو زبان کو نئی ٹکنالوجی سے ہمکنار کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ گزشتہ پچاس سالوں سے یہ سنتے آرہے ہیں کہ اردو کے حالات مایوس کن ہیں لیکن اس کی سمت و رفتار ثابت کررہی ہے کہ یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو داں سماج کو یہ تاثر دینے سے قاصر ہیں کہ اردو زبان روزگار کے معاملے میں دوسری زبانوں سے کمتر نہیں ہے اور اسی لیے لوگ اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کرارہے ہیں۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب عارف نقوی، جرمنی اور صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ جبکہ مقالہ نگاران کے بطور روزنامہ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمد یامین انصاری، خواجہ معین الدین اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کے استاد ڈاکٹر محمد وصی اعظم انصاری اور دوردرشن، دہلی کے بلیٹن ایڈیٹر نیوز محترم نوازش مہدی شریک ہوئے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم نے ادا کیے۔ نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔ اس موقعے پر، پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اردو اور ماس میڈیا کے حوالے سے اپنی گفتگو میں کہا کہ موجودہ دور اطلاعاتی دھماکوں کا دور ہے۔ ذرائع ترسیل و ابلاغ کی فراوانی اور اس کے اثر و سوخ کے سبب علم و معلومات میں جس طرح روز افزوں اضافہ ہورہا ہے اس نے پوری دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کردیا ہے۔ پروگرام اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے سرپرست محترم عارف نقوی نے کہا کہ میڈیا کی اثر پذیری کی طرف مغربی زبانیں تو بہت پہلے ہی متوجہ ہوگئی تھیں اسی لیے انھوں نے میڈیا کو ایک علم کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے اس سے متعلق تحقیقات اور نت نئے تجربے کو اپنے ترقیاتی پروگرام میں نہ صرف شامل کیا ہے بلکہ اس کی درس و تدریس کا بھی اہتمام کیا ہے مگر اردو والوں نے اس طرف بہت دیر سے قدم بڑھایا جس کے سبب اردو زبان اس میدان میں کچھ پیچھے ضرور ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو زبان اس کے ذریعے بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر پروفیسر جہانگیر وارثی نے پڑھے گئے مقالوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ میڈیا انسانی زندگانی کا ایک ایسا جزو ہے، جس کے بغیر زندگی اور تہذیب و ثقافت کا تصور ناممکن ہے۔ ڈاکٹر یامین انصاری نے اردو اور انٹرنیٹ کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور کہا کہ کچھ برس پہلے تک یہ مشکل تصور تھا کہ ہم اردو والے بھی کمپیوٹر کے دور میں شامل ہوں گے، لیکن آج ہم اس کا استعمال نہ صرف اپنی ضروریات بلکہ زبان و ادب کے فروغ کے لیے بھی کررہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد وصی اعظم انصاری نے 'ہندوستانی فلموں میں اردو زبان' کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ فلموں نے بھی اردو زبان کے فروغ میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ نوازش مہدی کے مقالے کا عنوان 'ٹیلی ویژن اور اردو عصر حاضر کے تناظر میں' تھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ولا جمال العسیلی، ڈاکٹر ہما مسعود، ڈاکٹر عفت ذکیہ، عرشی خان، شبانہ خاتون، شفا، ربا عارف، سیدہ مریم الٰہی، محمد شمشاد، صامیہ، فیضان ظفر، علما، وغیرہ متعدد طلبہ و طالبات آن لائن موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2021

جگر مرادآبادی: قلم کا سپاہی

رامپور: جگر مرادآبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سرمستی اور سرشاری، والہانہ پن، جذبہ عشق کی کارفرمائی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مگر حالات حاضرہ کے مسائل، تصوف، یکجہتی، حب وطن جیسے موضوعات پر بھی انھوں نے زبردست شاعری کی ہے۔

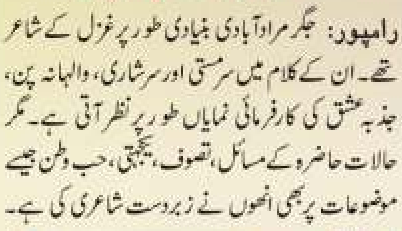

یہ بات رامپور رضا لائبریری میں امرت مہوتسو کے تحت کرائے جانے والے توسیعی خطبہ کے پروگرام کی صدارتی تقریر میں معروف شاعر اظہر عنایتی نے کہی۔ گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج کے پروفیسر شریف احمد قریشی نے اپنے توسیعی خطبہ میں کہا کہ جگر ایک حساس اور دردمند شاعر تھے۔ وہ انگریزوں کے ظلم اور بربریت پر چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے آزادی کے بعد اپنے ملک کے حکمرانوں کی بے حسی اور فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف بھی برملا آواز اٹھائی۔ بنگال، چھپرا کے تشدد اور روزمرہ فسادات، بناوٹی تعلق اور باہمی منافرت کے واقعات نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ امن پسند شاعر تھے، بیدار مغز اور روشن ضمیر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے امن وخلوص کے پیغام کو عام کیا۔ انھوں نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ یہ ملک ایک دن آزاد ہوگا۔ شاعر شکیل غوث نے بھی جگر کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 نومبر 2021

فلمی دنیا میں اردو

لکھنؤ: اردو ہندوستان کی بیٹی و ہندی کی بہن ہے اور بغیر زبان سیکھے ہم ہندوستان کی ثقافت اور تاریخ کو سمجھ نہیں سکتے، اگر ہم بغیر اردو کے ہندوستان کی تاریخ و ثقافت کو سمجھنا چاہیں گے تو وہ نصف جانکاری ہی ہوگی۔ یہ ماننا تھا ان مقررین کا جو یہاں اتر پردیش اردو اکادمی میں منعقد جشن کے افتتاح کے موقعے پر موجود تھے۔ فلمی دنیا میں اردو موضوع پر منعقد سمینار میں مشہور فلمی اداکار رضا مراد کے ساتھ مہابھارت فیم ارجن 'فیروز خان' نے بھی حصہ لیا۔ پہلا سیشن فلموں میں اردو کا دخل کے عنوان سے ہوا جس میں بولتے ہوئے فلم اداکار رضا مراد نے کہا کہ آج بیشتر شاعر زبان سے ناواقف ہیں۔ پہلے کی زبان میں جو چاشنی اور مٹھاس تھی وہ آج دکھائی نہیں دیتی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے لیے اپنے بچوں کو گھر میں ٹیوشن لگا کر اردو سکھانی چاہیے۔ وامق خان کی نظامت میں ہوئے اس سیشن میں متخیل آزاد، اسرار خان، سنجے سنگھ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فلموں پر مرکوز پہلے سیشن کے بعد دوسرے سیشن 'صحافت کا خوبصورت چہرہ اردو' میں اے پی سنگھ، ڈاکٹر اکبر علی، اور زبیر احمد، ایس این لال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو اور سیاست پر ہوئے تیسرے سیشن سیاست میں اردو کی کرامات میں مرتضیٰ علی، قمر علی، سریندر راجپوت، پردیپ سنگھ، ارجن سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو کی تعریف کی۔ یہاں مقررین نے کہا کہ اردو کے مستقبل کو لے کر جہاں لوگ فکرمند ہیں وہیں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اردو کا مستقبل روشن مانتے ہیں۔ فلم ہو یا ٹی وی شو سب جگہ اردو کی ضرورت ہے۔ اسی ضمن میں اطہر نبی اور چندر پرکاش، اور دیگر نے اردو کا گہوارہ ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے درمیان ہی یٰسین صاحب کی کتاب 'خدا کی عجیب و غریب مخلوقات' کا اجرا کیا گیا۔ ساتھ ہی چار بیت، داستان گوئی، کوفوزیہ اور ادیبہ نے پیش کیا جس سے لوگ لطف اندوز ہوئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 دسمبر 2021

بہار

شوق نیموی اور امداد امام اثر: حیات وخدمات

پٹنہ: اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ کے زیر اہتمام اردو کے معروف شاعر محقق و ادیب شوق نیموی

اور سرکردہ ناقد و ادیب امداد امام اثر کی خدمات کے اعتراف میں بہار ریاستی آرکائیو ڈائریکٹوریٹ کے کانفرنس ہال میں مشترکہ یادگاری تقریبات کا انعقاد ہوا۔ تقریب دو اجلاس پر مشتمل تھی۔ پہلے اجلاس میں شوق نیموی کی حیات و خدمات پر مقالے پیش کیے گئے۔ اس سیشن کی صدارت ڈاکٹر عتیق الرحمٰن (سابق اسسٹنٹ لائبریری اینڈ انفارمیشن آفیسر، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) نے کی جب کہ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر امتیاز احمد (معروف تاریخ داں و سابق ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ) نے کی۔ تقریب کا آغاز اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود اور دیگر اسٹیج کے شرکا کے ہاتھوں شمع روشن کرکے ہوا۔ ڈائرکٹر احمد محمود نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ احمد محمود نے پروگرام کی غرض و غایت پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام ہر سال بہار سے تعلق رکھنے والے 24 ادبا و شعرا مرحومین کی یادگاری تقریبات کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ اس سال کورونا بحران کے سبب یادگاری تقریبات کے انعقاد میں دشواری پیش آئی۔ کچھ تقاریب آن لائن منعقد کی گئیں۔ اب جب کہ حکومت کی جانب سے کچھ شرائط کے ساتھ پروگرام کے انعقاد کی اجازت ملی ہے تو ہماری کوشش ہوگی کہ جاری مالی سال میں مارچ تک زیادہ سے زیادہ اہم شخصیات پر پروگرام منعقد کرالیے جائیں۔ شوق نیموی یادگاری تقریب میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن نے کہا کہ بہار کی سرزمین بڑی مردم خیز ہے۔ اس سرزمین پر بڑی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں اور عالمی سطح پر بہار اور ہندوستان کا نام روشن کیا۔ انھیں میں ایک بڑی شخصیت علامہ شوق نیموی کی تھی۔ شوق نیموی بچپن سے ہی ذہین اور محنتی تھے۔ علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے آثار السنن لکھ کر عالمی سطح پر ہندوستان اور بہار کا نام روشن کیا ہے۔ بلاشبہ شوق نیموی نابغہ رزگار تھے۔ ڈاکٹر شکیل احمد قاسمی، پروفیسر حامد علی خان اور ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے شوق نیموی کے حوالے سے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں امداد امام اثر کی حیات و خدمات پر مقالہ نگاروں نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جلال اصغر فریدی نے کہا کہ امداد امام اثر باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی علمی اور تحقیقی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی کتاب کاشف الحقائق نہایت وقیع ہے جس سے علمی و ادبی دنیا فیضیاب ہورہی ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ امداد امام اثر کثیر الجہات اور کثیر التصانیف شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی کتاب کاشف الحقائق نے عالمی شہرت حاصل کی۔ ان کی دوسری کتاب جو مقبول خاص و عام ہوئی وہ 'دیوان اثر' ہے۔ ان کی تمام کتابوں میں مذکورہ دونوں کتابوں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ محسن رضا رضوی نے امداد امام اثر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ امداد امام اثر جیسی نابغہ روزگار شخصیت اور ان کی علمی و ادبی شخصیت کو کسی ایک مقالہ میں نہیں سمیٹا جاسکتا ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر امتیاز احمد نے امداد امام اثر کے چند اہم تاریخی پہلوؤں پر بڑی جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت حسیب الرحمٰن انصاری اور محمد شکیب ایاز نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ پروگرام کا اختتام ڈائرکٹر احمد محمود کے تشکراتی کلمات پر ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالصمد، ناشاد اورنگ آبادی، امتیاز کریم، اثر فریدی، معین گریڈیہوی، نصر عالم نصر وغیرہ سمیت متعدد علمی و ادبی شخصیتیں موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2021

تلنگانہ

مولانا آزاد اور مذہبی و ثقافتی تنوع کا آئینی نظم

حیدرآباد: مولانا آزاد اتحاد کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ وہ ایک دور اندیش مفکر تھے۔ انھیں ہندوستان کے بٹوارے کے بعد دونوں ملکوں میں موجود اقلیتوں ہندوستان میں مسلمان اور پاکستان میں ہندوؤں کے مسائل کا ادراک تھا۔ اسی لیے انھوں نے پاکستان بننے تک بھی تقسیم کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی میں تقسیم کے خلاف اپنا ووٹ دیا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ماہر قانون پروفیسر فیضان مصطفیٰ، وائس چانسلر نلسار یونیورسٹی آف لا نے آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں یوم آزاد یادگاری خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ خطبہ کا عنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد اور مذہبی و ثقافتی تنوع کا آئینی نظم' تھا۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ یوم آزاد تقاریب کا آغاز مانو ماڈل اسکول، فلک نما، حیدرآباد میں 3 نومبر کو ایک رنگارنگ پروگرام کے ساتھ ہوا تھا۔ پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے بتایا کہ سپریم کورٹ نے آزاد ہندوستان کے وفاقی ڈھانچے کے لیے مولانا آزاد کے خیالات سے استفادہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ دستور میں شامل شق 30 کے تحت اقلیتیں اپنے تعلیمی ادارے قائم کرسکتی ہیں۔ مولانا آزاد نے قرآن مجید کے پیغام کو اپنا کر اپنے خیالات کو ترتیب دیا تھا اس سلسلے میں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان پر تحقیق ہونی چاہیے۔ پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ وزیر اعظم نے آج ٹویٹ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام کو یاد کیا۔ مولانا ایک عظیم شخصیت تھے۔ انھوں نے اپنی آواز لوگوں تک الہلال کے ذریعے پھر البلاغ کے ذریعے پہنچائی۔ ان کا یہ درد تھا جو انھوں نے ان اخبارات کے ذریعے پیش کیا اور وہ درد بڑھتا ہی رہا۔ مولانا کی اہلیہ بیمار ہوگئیں تو انھیں جیل سے گھر جانے کا موقع مل سکتا تھا لیکن انھوں نے جنگ آزادی کے پیش نظر انگریز افسران سے درخواست کرنا گوارہ نہ کیا۔ ڈاکٹر ایس چتم ریڈی، ڈائرکٹر، این آئی ٹی ایچ ایم، حیدرآباد نے کہا یہ پرانے دور کے طلبہ ہیں اور آج کے طلبہ میں بڑا فرق ہے۔ آج کے طلبہ کو تقریباً معلومات ان کے موبائل پر دستیاب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قدرتی ذرائع کا تحفظ اور کفایت کے ساتھ استعمال کرنے سے فنڈس کی بچت ہوتی ہے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، پرووائس چانسلر نے کہا کہ مولانا آزاد مفکر تعلیم تھے۔ مفکر تعلیم کا مرتبہ ماہر تعلیم سے بھی اعلیٰ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2021

لائبریری کی اہمیت

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سید حامد سنٹرل لائبریری بہت ہی قیمتی خزانہ ہے، جس میں اردو، عربی، فارسی، ہندی، مینجمنٹ، سوشل سائنسز اور سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ لائبریری بہت سے آن لائن جرنلس اور میگزینس کی خریدار ہے، جن سے یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کو استفادہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر اختر پرویز، لائبریرین، سید حامد سنٹرل لائبریری نے توسیعی خطبہ دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ شعبۂ عربی کے زیر اہتمام 'مانو سنٹرل لائبریری کا تعارف' کے موضوع پر اس لیکچر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اختر پرویز نے لائبریری سے استفادے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آن لائن پورٹل کے ذریعے کتابوں تک رسائی کیسے کی جائے۔ انھوں نے ریسرچ پیپر میں حوالے دینے میں تکنیک کا استعمال کرنے کا صحیح طریقہ اور حوالہ دینے میں ہونے والی دشواریوں کے ازالے جیسے اہم موضوعات کی طرف توجہ دلائی۔ ای بکس اور ای ریسورسز پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر پرویز نے نیشنل ڈیجیٹل لائبریری آف انڈیا اور کئی دوسری اہم ویب سائٹس سے بھی طلبا و طالبات کو روشناس کرایا۔ ڈاکٹر فیصل مصطفیٰ اسسٹنٹ لائبریرین نے لائبریری کی آن لائن رسائی پر پاور پریزینٹیشن دیا تاکہ طلبہ

کے لیے لائبریری سے استفادہ آسان ہوسکے۔ پروفیسر سید علیم اشرف جائسی، صدر شعبۂ عربی، مانو نے مہمان، اساتذۂ شعبۂ عربی، ریسرچ اسکالرز، اور تمام طلبا وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں شعبۂ عربی کے اساتذہ ڈاکٹر جاوید ندیم ندوی، ڈاکٹر ثمینہ کوثر تابش، ڈاکٹر مفتی محمد شرف عالم، ڈاکٹر طلحہ فرحان، ڈاکٹر آصف لئیق، ڈاکٹر شمس الدین کے علاوہ کافی تعداد میں ریسرچ اسکالرس اور بی اے وایم اے کے طلبا وطالبات نے شرکت کی۔ جلسے کے اختتام پر سوال وجواب کا سیشن بھی منعقد ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 دسمبر 2021

راجستھان

اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے ہاتھوں کمپیوٹر سینٹر کا افتتاح

جودھپور: مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی،

جودھپور کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ذریعے دیے گئے ایک کمپیوٹر سینٹر کا افتتاح کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد صاحب کے ہاتھوں ایک شاندار تقریب میں ہوا۔ اس کمپیوٹر سینٹر کے افتتاح میں مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے سابق صدر پروفیسر اخترالواسع خاص طور پر شریک ہوئے جن کی کوششوں سے کمپیوٹر سینٹر منظور ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، جودھپور، جس طرح تعلیم وتربیت کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دے رہی ہے اس کا تقاضا تھا کہ یہ سینٹر ان کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ ہم قومی کونسل اور خاص طور پر عقیل احمد کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے درخواست کو منظور کرتے ہوئے یہ سینٹر ہمیں دیا۔ اس موقعے پر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے چانسلر محمد عتیق نے بھی کہا کہ ہم اردو کے حوالے سے اپنے بچوں اور بچیوں کو کمپیوٹر کی تربیت دینے میں کامیاب ہوں گے اور اس طرح ان کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کریں گے۔ اس تقریب میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، جودھپور کے صدر محمد علی چندری گر، جنرل سکریٹری نثار احمد خلجی، خازن عطاء الرحمٰن قریشی،

یونیورسٹی رجسٹرار انور علی، ڈپٹی رجسٹرار محمد امین، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، حاجی محمد اسحاق، محمد صابر وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 نومبر 2021

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی دہلی کا 2020 کا بال ساہتیہ پرسکار

نئی دھلی: اس بار مرکزی منسٹری آف کلچر اینڈ لٹریچر کے تحت مرکزی ساہتیہ اکادمی دہلی نے 2020 کے بال ساہتیہ پرسکار کے تاریخی جلسے کے لیے ریاست اڑیسہ کی راجدھانی بھونیشور کا انتخاب کیا۔ یہ تاریخی جلسہ بھونیشور کے جے جے بھون اشوک نگر میں منعقد کیا گیا۔ جلسہ پانچ بجے شام کو شروع ہوا جس میں ہندوستان کی چوبیس زبانوں کے ادب اطفال کے شعرا وادبا کو ان کی گرانقدر خدمات پر بال ساہتیہ پرسکار سے نوازا گیا۔ اس جلسے میں استقبالیہ تقریر کے سری نواس راؤ سکریٹری ساہتیہ اکادمی دہلی نے پیش کی اور سبھی شعرا وادبا کا استقبال کیا۔ اس یادگار جلسے کی صدارت کے فرائض ساہتیہ اکادمی دہلی کے نائب صدر مادھوکوشک نے ادا کیے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہندوستان ایک گلشن کی طرح ہے، جس طرح گلشن کی خوب صورتی رنگارنگ پھولوں سے بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے حسن میں ہندوستان کے الگ الگ علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کا ادب اضافہ کرتا ہے اور اس کے کلچر کو رنگارنگ بناتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کی اہمیت پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ بچوں کا ادب ہی بچوں کے دلوں میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ بزرگ شاعر رما کانت رتھ نے سبھی شعرا اور ادبا کو مبارکباد دی۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کے کاموں کو سراہا۔ اس بار 2020 کے لیے جن شعرا وادبا کو بال ساہتیہ پرسکار سے نوازا گیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: حافظ کرناٹکی 'فخر وطن' (اردو)، مدھوریما گھر پھالیہ (آسامی)، پراچیتا گپتا (بنگال)، اجیت بورو (بوڈو)، شیودیو سنگھ سوشیل (ڈوگری)، وینیتا کوئیلو (انگریزی)، نٹورلال گردھرداس پاٹیل (گجراتی)، بال سوروپ راہی (ہندی)، ایچ ایس بیا کوڈ (کنڑا)، سید اختر حسین منصور (کشمیری)، وی کرشنا وداِیصار (کونکنی)، سیارام جھا سارس (میتھلی)، گریسی جوسیپ (ملیالم)، ناوریم ودیا ساگر سنگھ (منی پوری)، ابا گوندامہاجن (مراٹھی)، دھوریا چوہان (نیپالی)، راما چندرانا یک (اڑیا)، کرنیل سنگھ سومال (پنجابی)، منگت بادل (راجستھانی)، اروند کمار تیواری (سنسکرت)، جے رام ٹوڈو (سنتھالی)، صاحب بجانی (سندھی)، ایس، بال کرشنا (تمل)، کنّے گنتی انا سویا (تیلگو)، حافظ کرناٹکی نے پریس سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اسکول وکالج چلتے چلاتے اور نصابی ضرورت کے تحت نظمیں لکھتے لکھتے، مجھے بچوں کے ادب سے ایسا عشق ہوگیا ہے کہ یہی میری زندگی بن گئی۔ مدھوکوشک نائب صدر ساہتیہ اکادمی دہلی نے سبھی زبانوں کے شعرا وادبا اور تمام حاضرین مجلس اور شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2021

مولانا وحیدالدین خان

نئی دھلی: معروف اسلامی اسکالر مولانا وحیدالدین خان مرحوم کو راشٹرپتی بھون کے عظیم الشان دربار ہال میں منعقدہ تقریب میں صدر رام ناتھ کووند نے ملک کے دوسرے اعلیٰ شہری اعزاز پدم وبھوشن سے نوازا۔ وحیدالدین

خان کو پدم وبھوشن اعزاز کے لیے جنوری 2021 میں منتخب کیا گیا تھا اور اس وقت وہ باحیات تھے لیکن اس ایوارڈ کی تقریب سے قبل ہی 21 اپریل 2021 کو 96 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مولانا وحیدالدین خان کا شمار ہمارے عہد کے ان ممتاز علما میں ہوتا ہے جنھوں نے دین کی تعبیر وتشریح کے ضمن میں اہم علمی کام کیا ہے، تصنیف وتالیف کے میدان میں ان کے نمایاں کارنامے ہیں۔ مولانا وحیدالدین خان ہندوستان کی مردم خیز سرزمین اعظم گڑھ میں یکم جنوری 1925 کو پیدا ہوئے اور وہاں کی عظیم درسگاہ مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کی تحریریں بلاتفریق مذہب ونسل مطالعہ کی جاتی ہیں۔ وہ عام طور پر دانشور طبقہ میں امن پسند مانے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، اسلام کے متعلق غیر مسلموں میں جو غلط فہمیاں ہیں انھیں دور کرنا تھا۔ اس موقعے پر نائب صدر ایم وینکیا نائیڈو، وزیر اعظم نریندر مودی اور مرکزی وزیر داخلہ امت شاہ سمیت کئی معززین موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 نومبر 2021

شیومورتی

نئی دھلی: مشہور افسانہ نگار شیومورتی کو سال 2021 کے لیے 'شری لال شکلا اسرتی افکو ساہتیہ سمن' سے نوازا جائے گا۔ انڈین فارمرز فرٹیلائزر کوآپریٹو لمیٹڈ (افکو)، جو کھاد کے شعبے میں ایک سرکردہ کوآپریٹو تنظیم ہے، نے ہفتہ کو یہ اعلان کیا۔ نامور ادیب چترا مدگل کی سربراہی میں سلیکشن کمیٹی میں محترمہ مدھوسودن آنند، وشنونگر، جے پرکاش کردم، مرلی منوہر پرساد سنگھ اور ڈاکٹر دنیش کمار شکلا شامل تھے۔ افکو کے مینیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر اودے شنکر اوستھی نے مسٹر شیومورتی کو سال 2021 کے لیے 'سری لال شکلا اسرتی افکو ساہتیہ سمن' سے نوازے جانے پر مبارکباد دی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سال 2011 میں نامور افسانہ نگار شری لال شکلا کی یاد میں شروع ہونے والا یہ اعزاز ہر سال ہندی کے ایک مصنف کو دیا جاتا ہے جس کی تخلیقات میں بنیادی طور پر دیہی، زرعی زندگی اور پسماندہ لوگوں، مسائل، خواہشات اور جدوجہد شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 نومبر 2021

علی جواد زیدی میموریل انعام

نئی دھلی: علی جواد زیدی میموریل انعام برائے اردو-انگریزی ترجمہ کے لیے رواں سال کا انعام جیوری نے مشترکہ طور پر دہلی ہندوستان سے عالم اختر کے ذریعے ذکیہ مشہدی کی تحریر کردہ 'ہری بول' کہانی کے ترجمے اور بلال حسن منٹو کی تحریر کردہ 'پیراسائٹ' (کیڑا) کے بلال تنویر کے ترجمے کو مشترکہ طور پر دیا ہے۔ ذکیہ مشہدی کی کہانی 'ہری بول' میں زندگی کو بنیادی سطح پر دیکھا گیا ہے۔ ذکیہ مشہدی ہندوستان کی نامور افسانہ نگار ہیں، ترجمے کی زبان سہل ہے اور ترجمہ اصل متن کے بہت قریب، واضح اور قابل رسائی ہے۔ ایوارڈ پانے والے عالم اختر سنٹر فار انگلش اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں پی ایچ ڈی اسکالر ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں بیچلرز کی ڈگری اور جے این یو میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد، عالم نے جے این یو اور ذاکر حسین دہلی کالج، ڈی یو میں انڈر گریجویٹ طلبہ کو پڑھایا ہے۔ اپنے موجودہ مرکز میں ترجمہ کے مطالعے کے کورس کے ایک حصے کے طور پر، عالم نے منٹو کے 25 سے زیادہ مائیکرو فکشن، ایک ڈراما، امتیاز علی تاج کے 'انارکلی' اور جون ایلیا کی کچھ نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے دی بک ریویو (ستمبر 2020) کے لیے سری کانت ورما کے دوبارہ شروع ایک ناول کا بھی جائزہ لیا ہے، جس کا ترجمہ کرشنا بلدیو ویدنے کیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 5 دسمبر 2021

رسم اجرا

چراغاں سرخواب

ٹونک: ارشد عبدالحمید راجستھان کا فخر ہیں اور صحیح معنی میں اکیسویں صدی کے معاملات کی شاعری کر رہے

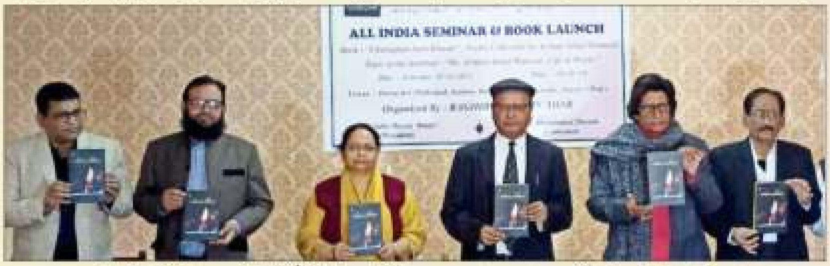

ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ آج ایک کل ہند سمینار میں اردو کی مشہور شخصیت شین کاف نظام نے معروف شاعر اور نقاد ارشد عبدالحمید کی شاعری کے دوسرے مجموعے چراغاں سر خواب کا اجرا کیا۔ راجستھان یونیورسٹی دیا شری شکشک سدن ہال میں رسمِ اجرا اور سمینار کا انعقاد راغب اکیڈمی ٹونک نے کیا تھا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سابق صدر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر خالد محمود نے ارشد عبدالحمید کی شاعری کو طنز بلیغ کی خوبصورت مثال قرار دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی کے پروفیسر خالد مبشر نے ارشد عبدالحمید کی شاعری میں آہنگ کی خوبصورتی کو نشان زد کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود کی اہلیہ مشہور سائنس داں پروفیسر تسنیم فاطمہ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پرو وائس چانسلر بنائے جانے پر اعزاز سے نوازا گیا۔

اس سمینار کے افتتاحی اجلاس کی نظامت راجستھان اسکل یونیورسٹی کے کنٹرولر آف اگزامس ڈاکٹر محمد حسین نے کی۔ اس اجلاس کے اعزازی مہمان پروفیسر راجیندر پرساد گرگ اور لوکیش کمار سنگھ ساحل نے بھی حاضرین سے خطاب کیا۔ سمینار کے آغاز میں راغب اکیڈمی کے صدر اور مشہور شاعر صابر حسن رئیس نے اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشد عبدالحمید کی ادبی اہمیت کے جواز پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سمینار کے دوسرے اجلاس میں عبدالغفار زید، ڈاکٹر شکیلہ بانو اور محمد شاہد پٹھان نے اپنے مقالات میں ارشد عبدالحمید کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر محمد حسین نے اپنے خطاب میں ارشد عبدالحمید کو جدیدیت سے متاثر لیکن منفرد شاعر قرار دیا۔ سمینار میں ٹونک کی مختلف ادبی تنظیموں سے متعلق ادیبوں نے ارشد عبدالحمید کا شال اوڑھا کر اعزاز کیا۔ ان میں شوق اجمنی، حسن اقبال، انور علی خاں انور اعجازی، مرزا نسیم بیگ، وسیم سیفی، ندیم سیفی، محمد عاطف صدیقی اور ڈاکٹر غفار علی بھی شامل تھے۔

آہنگران گرلس کالج، جیپور کے پرنسپل ڈاکٹر اجمل حمید نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ارشد عبدالحمید کی شاعری ملک اور بیرون ملک بھی پسند کی جاتی ہے اور اس عہد کی شاعری کا کوئی بھی تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔

سمینار کے آخر میں صابر حسن رئیس اور ڈاکٹر محمد حسین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 21 نومبر 2021

ابھی ویکتی

بتیا: ادبی و تہذیبی تنظیم 'انوراگ' کے زیر اہتمام ایم جے کے کالج بتیا کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر شاردا شرن شری واستو کی تصنیف کردہ ہندی و بھوجپوری زبان کا سنگم 'ابھی ویکتی' کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروگرام کی صدارت کر رہے ڈاکٹر سریندر پرساد کیسری نے کہا کہ یہ کتاب آسان اور پراثر زبان کی وجہ سے قارئین کے دلوں میں جلد جگہ بنالے گی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر پریشور جھگت نے کہا کہ لسانیات اور اس کے موضوعات اور نکات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے یہ کتاب مصنف کی گوناگوں قابلیت و صلاحیت کا اعتراف کرنے پر ہمیں مجبور کرتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر دیوی لال یادو اور سوشانت کمار شرما نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ارون گوپال نے کتاب کی کویتا 'گھن ارچن' پیش کی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر سریندر پرساد کیسری جب کہ نظامت انوراگ تنظیم کے ترجمان ڈاکٹر جگ موہن کمار نے کی۔ دوسری نشست میں ایک شعری محفل کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں شاعر ڈاکٹر ظفر امام قادری، پروفیسر قمرالزماں قمر، ڈاکٹر گورکھ پرساد مستانہ، ڈاکٹر ذاکر حسین ذاکر، ورت راج دوبے، ڈاکٹر انور ادھاپانک، پنڈت چتربھج مشر، وجے ناتھ تیواری، انیل انل، اودھیش کمار ورما، للن پانڈے، ڈاکٹر دیوا کررائے، آبھاش جھا اور اسلم چشتی وغیرہ نے اپنے کلام و اشعار پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 نومبر 2021

شدت

سنبھل: اتر پردیش کے سنبھل ضلع میں مشہور شاعر ڈاکٹر معراج نقوی سنبھلی کی غزلوں کی کتاب 'شدت' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شہر کے کوٹ غربی میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شاعروں نے اپنے کلام پیش کیے۔ ڈاکٹر کیفی سنبھلی نے کتاب کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پرشانت نے کہا کہ شاعری ہمارے ملک کا خاص حصہ ہے اور اس طرح کی کتابیں لکھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر کیفی سنبھلی نے کتاب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب اردو زبان کے فروغ میں کارآمد ہوگی۔ مشاعرے کا آغاز حسن سرسوی نے کیا۔ کلام پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر معراج نقوی، حکیم برہان سنبھلی، کیفی سنبھلی، امیر امام، ماجد سنبھلی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 نومبر 2021

دستک

نئی دہلی: مسلم راشٹریہ منچ کے رہنما اندریش کمار نے کہا ہے کہ زبانیں انسانوں کے دلوں کو جوڑ کر آپس میں بھائی چارہ پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے نکلنے والے الفاظ کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اگر ایسا کرلیا تو ایک بہتر زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدائی رشتہ بہن اور بھائی کا ہے اور اس کے بعد رشتہ انسانیت اور دوستی کا ہے، جس کو سمجھنا ہوگا۔ یہ باتیں انھوں نے سابق جسٹس محمد اعجاز سہیل صدیقی کی تخلیق 'دستک' کے اجرا کے موقعے پر کہیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے کہا کہ یہ کتاب بہت ہی اہم دستاویز ہے جس کو نوجوانوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ یہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کو آگے بڑھائے گی۔ جسٹس سہیل صدیقی نے کتاب کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم مسلمانوں کو اب اقلیت ٹائٹل سے پرہیز کرنا چاہیے اور اس کے بجائے ملک کی دوسری بڑی اکثریت کہنا چاہیے۔ اس کے بعد ہمارے اندر وہ حوصلہ پیدا ہوگا کہ ہم بڑے سے بڑے طوفانوں سے بھی ٹکرا جائیں گے۔

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے چیئر مین سراج الدین قریشی نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اقلیت کا درجہ دلوانے میں جسٹس سہیل صدیقی کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ جہاں ہندو یا مسلمان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی الگ کردیا جائے تو یہ ملک ہندوستان نہیں رہے گا۔ خطبہ استقبالیہ مرزا قمرالحسن بیگ نے پیش کیا اور تقریب کی نظامت شہاب الدین علی نے کی۔ معروف بزرگ شاعر متین امروہوی نے دستک پر نظم پیش کی۔ اس موقعے پر مسلم راشٹریہ منچ دہلی کے کنوینر حافظ محمد صابرین، پروفیسر وسیم، صہیب قاسمی، ڈاکٹر جسیم الدین، خورشید راجیکا، ڈاکٹر سید محمد اقبال، پروفیسر خالد اور پروفیسر جاوید اختر کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی اہم ترین شخصیت نے شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 نومبر 2021

وہ جو شمس تھا سر آسماں

نئی دہلی: اردو کے معروف صحافی ڈاکٹر عبدالقادر شمس پر کتاب 'وہ جو شمس تھا سر آسماں' اور مشہور افسانہ نگار احسان قاسمی کی کتاب 'سیمانچل کے افسانہ نگار' پر اظہار خیال کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامیات

کے سابق ڈین پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ عبدالقادر شمس سوتے دہلی میں تھے مگر خواب وہ سیمانچل کا دیکھتے تھے۔ یہ بات انھوں نے ادارہ ادب اسلامی، حلقہ دہلی بہ اشتراک فورم فور انٹیلکچول ڈسکورس کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب میں دونوں کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے احسان قاسمی کی کتاب 'سیمانچل کے افسانہ نگار' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جہاں اس کتاب سے سیمانچل کی شناخت کو نمایاں کرنے میں مدد ملے گی، وہیں ہمعصروں کو اس کتاب سے تحریک ملے گی۔ ڈاکٹر عبدالقادر شمس کی شخصیت کا احاطہ کرنے والی یہ کتاب ڈاکٹر نعمان قیصر اور محمد اسلام خان کی ادبی کاوشوں کا ثمر ہے۔ متذکرہ دونوں حضرات اس کتاب کے مشترکہ مرتب ہیں۔ مشہور افسانہ نگار اور این سی ای آر ٹی کے ایڈیٹر ڈاکٹر پرویز شہریار نے عبدالقادر شمس کو بہترین انسان دوست قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر انسان میں انسان دوستی نہیں ہے تو اسے کبھی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ سیمانچل کے افسانہ نگار پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے اسے ادب میں ایک اضافہ قرار دیا اور کہا کہ اردو افسانہ کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کتاب کا نام ضرور آئے گا۔ انھوں نے کہا کہ احسان قاسمی نے بہت اہم کام انجام دیا ہے اس کی قدر کی جانی چاہیے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابوبکر عباد نے سیمانچل کے افسانہ نگار کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ سیمانچل کے ادیبوں کو تعارف کرانے میں یہ کتاب اہم رول ادا کرے گی، خاص طور پر ان ادیبوں کو جنھیں حاشیائی ادیب سمجھ کر اب تک نظر انداز کیا جارہا تھا۔ مشہور نقاد اور ادیب حقانی القاسمی نے عبدالقادر شمس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ 'وہ جو شمس تھا سر آسماں' یہ صرف تعزیتی تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک اموشنل اوڈیسی ہے۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا یادوں کا یہ کولاژ ایک طرح سے اوڈی تاثر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی تحریریں دماغ سے نہیں دل سے لکھی جاتی ہیں۔

یوجنا کے مدیر عبدالمنان نے سیمانچل کے افسانہ نگار کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے احسان قاسمی کی شخصیت کو سیمانچل کے لیے غنیمت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نئے قلم کاروں کو بھی اس میں جگہ دی ہے اور ان کا تعارف کرایا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر خالد مبشر نے ڈاکٹر عبدالقادر شمس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ قلم کے دھنی تھے۔ مشہور افسانہ نگار اور سیمانچل کے افسانہ نگار کے مصنف احسان قاسمی نے اس موقعے پر کہا کہ سیمانچل ایک جغرافیائی حلقہ ہے جہاں ملی جلی تہذیب اور زبان ہے۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر احمد علی جوہر نے سیمانچل کے افسانہ نگار کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ صحافیوں میں زین شمسی، سراج نقوی، ڈاکٹر وارث مظہری، ڈاکٹر جسیم الدین نے بھی عبدالقادر شمس کی شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ جب کہ جے این یو اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر اجمل قاسمی نے استقبالیہ کلمات ادا کیے، منظر امام نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور یو این آئی کے صحافی عابد انور نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 نومبر 2021

الکتاب فی تشریح بطن

دیوبند: جامعہ طبیہ دیوبند کے سابق پرنسپل اور اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج پریاگ راج کے شعبۂ تشریح کے صدر و پروفیسر انیس احمد انصاری کی چھٹی کتاب 'الکتاب فی تشریح بطن' کا اجرا کالج کے اڈیٹوریم میں ڈائرکٹر یونانی طبی خدمات اترپردیش ڈاکٹر سکندر حیات صدیقی کے ہاتھوں میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سکندر حیات صدیقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر انیس احمد انصاری مضمون تشریح پر وسیع مطالعہ اور گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے طویل تدریسی تجربہ اور مطالعہ کا نچوڑ اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے جو نہایت واضح اور جامع ہے۔ ڈاکٹر انیس نے تالیف و تصنیف کا محققانہ انداز تحریر اردو، انگریزی، مترادف اصطلاحات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب کالج کے دیگر اساتذہ کے لیے محرک بنے گی اور اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے موصوف کی دیگر کتابیں بھی سامنے آئیں گی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر ڈی سی لال نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں نے کتاب میں دیے گئے خاکوں اور تمام عنوانات کو بغور دیکھا، تشریح کی اطلاقی اور سطحی تشریح جو اکثر کتابوں میں ناپید ہے، اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ یقیناً یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 نومبر 2021

رابطہ

میرٹھ: مشہور و معروف شاعر و افسانہ نگار ڈاکٹر انجم جمالی کی غزلوں پر مبنی البم 'رابطہ' کا اجرا ڈاکٹر انجم جمالی میموریل فاؤنڈیشن کی جانب سے دہلی روڈ پر واقع ہوٹل میں کیا گیا۔ فاؤنڈیشن کے سکریٹری انجینئر رفعت جمالی نے بتایا کہ ان کا مقصد اپنے والد محترم مرحوم ڈاکٹر انجم جمالی کی قلم بند غزلوں کو ویڈیو البم رابطہ کے ذریعہ منظر عام پر لانے کی کوشش ہے۔ اس ویڈیو البم میں ان کی مشہور غزل 'آنکھوں آنکھوں میں ایک دل نشیں رات میں' و دیگر غزلوں کا ویڈیو البم رابطہ تیار کیا گیا ہے۔ رفعت جمالی نے بتایا کہ البم کی شوٹنگ اتراکھنڈ میں ہوئی ہے جسے پلے بیک سنگر رجنی تنور اور آیوش نے گایا ہے۔ اداکاری انکش اور سومیا نے کی ہے۔ رفعت نے بتایا کہ وہ ایک اور غزل کے ویڈیو البم پر کام کر رہے ہیں جس کو آواز دے رہے ہیں اودت نارائن اور الکایا گنک اور ہدایت کار کمل ناتھانی ہیں۔ جس کی شوٹنگ میرٹھ، ممبئی اور شملہ میں کی جائے گی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 نومبر 2021

راہ کے پتھر

میرٹھ: پروفیسر وکاس شرما کا ناول 'راہ کے پتھر' دور حاضر کا تخلیقی بیانیہ ہے جو بظاہر محبت کے مثلث کو پیش کرتا ہے۔ دل و دماغ کی کشاکش کا خوبصورت اظہار، نہایت مربوط پلاٹ قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ دل کا اظہار کرنے والے سیاست سے پرے ہوتے ہیں۔ وہ سود و زیاں کا سودا نہیں کرتے بلکہ محبت، انسانیت اور بھائی چارے کو فروغ دیتے ہیں جیسا کہ صابر اور چتا کے توسط سے کہانی ابھرتی ہے۔ یہ الفاظ تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تشریف لائے پروفیسر صغیر افراہیم کے جو شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد میرٹھ کے معروف فکشن ناقد اور ناول نگار پروفیسر وکاس شرما کے نئے ہندی ناول 'راہ کے پتھر' کی رسم اجرا کے دوران مہمان ذی وقار کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ادا کر رہے تھے۔ صدارت کے فرائض ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر نوین چند لوہنی نے انجام دیے اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹ پروفیسر پربھا سنگھ اور معروف کہانی کار اور ناقد ڈاکٹر ہیتو بھاردواج نے شرکت کی اور مہمان مکرم کے بطور پروفیسر چندر پال شرما نے شرکت کی۔ مصنف کا تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور ناول پر تبصرہ فیض عام ڈگری کالج کے استاد ڈاکٹر اسلم صدیقی نے پیش کیا اور نظامت کے فرائض اتر راشٹریہ کلا منچ کے صدر اور معروف ہندی کوی ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ نے انجام دیے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر وکاس شرما کا ناول 'راہ کے پتھر' ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار ہے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ایس این شرما نے کہا کہ پروفیسر وکاس شرما باصلاحیت فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے اس ناول کے ذریعے معاشرے کو اتحاد کا سبق دیا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ ناول نئی نسل میں مقبول ہوگا۔ ڈاکٹر ہیتو بھاردواج نے کہا کہ ناول میں جذبات نگاری بہت زیادہ ہے لیکن ناول ہندو مسلم اتحاد کی بے نظیر مثال پیش کرتا ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر نوین چند لوہنی نے کہا کہ ناول میں جن سوالات کو وکاس شرما نے اٹھایا ہے وہ سماج کا اہم حصہ ہیں۔ ناول کی تکنیک اور اسلوب پر ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول آج کے وقت کو سامنے رکھتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی ناول میں نئے مضامین آئیں گے تو وہ سماج اور عام لوگوں کو چونکانے کا کام کریں گے۔ پروگرام کے آخر میں مہمانوں کو مومنٹو پیش کیے گئے۔ پروگرام میں عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 نومبر 2021

اجالا کہاں گیا

الہ آباد: 'سوپان' کے زیر اہتمام ممتاز شاعر ثروت جمال (گورکھپور) کے مجموعہ کلام 'اجالا کہاں گیا' کا اجرا ایک باوقار تقریب میں کیا گیا۔ تقریب کی صدارت ڈائرکٹر آکاشوانی الہ آباد لوکیش شکلا نے کی۔ 'بزم یاراں' کے سربراہ اور معروف ادیب کاظم عابدی اور بزرگ شاعر طلب جونپوری بطور مہمان اعزازی شریک ہوئے۔ تقریب کا آغاز چراغ روشن کرکے ہوا۔ بعد ازاں معززین کی گلپوشی ہوئی اور شال پہنا کر انھیں اعزاز سے نوازا گیا، نیز کتاب 'اجالا کہاں گیا' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کاظم عابدی نے کہا کہ شاعری کے جس سفر کا آغاز امیر خسرو نے ہندوی کی شکل میں کیا تھا وہ رفتہ رفتہ ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے فراق اور مجنوں گورکھپوری تک پہنچا، ثروت جمال اس کارواں کے امین اور حدی خواں ہیں۔ ان کے کلام میں عصری حسیت، ادراک اور طبقاتی شعور کے عناصر بدرجہ اتم ہیں۔ ان کی شاعری کا محور اخلاص ہے، اخلاص ہی کسی فنکار کو عظیم بناتا ہے۔ علاوہ ازیں لوکیش شکلا، طلب جونپوری اور ثروت جمال وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ شالنی سریواستو نے اپنے مخصوص انداز میں تقریب کی نظامت کی۔

پروگرام کے دوسرے سیشن میں مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت طلب جونپوری نے کی۔ کاظم عابدی مہمان خصوصی تھے، ڈاکٹر پرینکا ترپاٹھی-شہڈول، ثروت جمال، شالنی سریواستو، لکھنؤ، انا الہ آبادی، طلب جونپوری، شاہد علی شاہد، اشوک سریواستو اور طارق جعفر وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی نظامت شاہد علی نے کی۔ 'سوپان' کے صدر راجیو نصیب نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 دسمبر 2021

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں کتابوں کا اجرا

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایک تقریب کے دوران مختلف کتابوں کا اجرا اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ان میں مصنفہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی

کی تخلیق 'جنھیں میں نے دیکھا، جنھیں میں نے جانا'، عذرا نقوی کی تخلیق 'شعر، کتابیں، یادیں'، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی تخلیق 'کچھ دل نے کہا' اور یادیں باتیں کے علاوہ رخشندہ روحی مہدی کی تخلیق 'مانسون اسٹوز' کے نام شامل ہیں۔ اس پروقار تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر جشن بہار کی روح رواں کامنا پرساد نے اظہار خیال کرتے ہوئے نسائی ادب سے وابستہ تمام قلمکاروں کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو ادب و تہذیب کو عزت بخشنے میں خواتین بھی نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب ہے، خواتین کے قلم نے اردو ادب و تہذیب کی خوب آبیاری کی ہے اور اس کو تقویت دی ہے۔ مہمان خصوصی سیدہ سیدین حمید نے بھی اظہار خیال کیا اور چاروں خواتین قلم کاروں کو مبارکباد دی اور مستقبل کے لیے نیک خواہشات سے نوازا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ خواتین کے لیے اردو ادب میں جو حد بندی اور فاصلے تھے وہ اب کم ہونے لگے ہیں، ہمارے معاشرے پر الزام تھا کہ ہم اپنی خواتین کو الگ تھلگ رکھتے ہیں، انھیں گھروں کی چہار دیواری میں رکھتے ہیں، اب یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حد بندی کی دیواریں جو کھڑی کی گئی تھیں وہ گر رہی ہیں اور خواتین اپنے وجود کو منوانے کے لیے آگے آ رہی ہیں اور مرد حضرات ان کو ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ پروفیسر انیس الرحمٰن نے کہا کہ جس طرح خواتین اردو ادب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں، یہ ایک خوش آئند قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے قبل کبھی کوئی ایسی تقریب منعقد نہیں ہوئی، جہاں ایک نہیں بلکہ چار خواتین کی تخلیق کا اجرا ہوا ہو۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں نسائی ادب پر بہت گفتگو ہو رہی ہے۔ خالد محمود، خالد علوی، پرویز شہریار، سہیل انجم، کمل دیوبندی، خورشید حیات اور حقانی القاسمی نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے سبھی خواتین قلمکاروں کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 نومبر 2021

مائی

نئی دھلی: پوروانچل مذہب، علم، فن، ثقافت، بہادری اور قربانی کی سرزمین ہے۔ یہاں کی مٹی بہت زرخیز ہے، اس سرزمین نے ایسی شخصیات کو جنم دیا ہے جن پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو فخر ہے۔ 'مائی' کا شعری مجموعہ کچھ ایسی ہی شخصیات اور کچھ نئے لکھنے والوں پر مشتمل ہے، یہ ہماری مائی اور اپنی آبائی سرزمین سے ہماری محبت اور ممنونیت کی علامت بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمان خصوصی، حکومت میں بھاری صنعتوں کے وزیر ڈاکٹر مہندر ناتھ پانڈے نے پوروانچل کے 108 شاعروں اور شاعرات کی سوانح حیات اور تخلیقات پر مشتمل تالیف 'مائی' کی تقریب اجرا میں کیا، جس کی تدوین آصف نے کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب کوئی بھی ادب مٹی سے منسلک ہوتا ہے تو اس کی اہمیت اور وسعت بڑھ جاتی ہے۔ پروگرام کا اہتمام 'مائی' تنظیم نے کیا تھا جو پوروانچل کے فن، ادب، لوک ثقافت اور پکوان کے لیے وقف ہے۔ پچھلے چار سالوں میں، چار عظیم الشان سالانہ 'مائی' پوروانچل میلوں کا انعقاد کیا گیا ہے، جس میں پوروانچل کی مصنوعات کی نمائش سے لے کر وہاں کے لوگوں کے ہنر اور فن کو پیش کیا جاتا ہے۔ کتاب کے اجرا کے پروگرام میں بڑی تعداد میں دہلی، این سی آر میں رہنے والے پوروانچل کے باشندوں کے علاوہ پوروانچل کے اراکین پارلیمنٹ، ایم ایل اے اور نوکر شاہوں نے شرکت کی جن میں مہمان خصوصی بھاری صنعتوں کے وزیر ڈاکٹر مہندر ناتھ پانڈے، وزیر کامرس حکومت ہند میں انوپریا پٹیل، بلیا کے ایم پی وریندر سنگھ مست، ایودھیا کے ایم پی للو سنگھ، پریاگ راج ایم پی ریتا بہوگنا جوشی، جونپور ایم پی شیام سنگھ یادو، نیتی آیوگ کے سی ای او امیتابھ کانت، حکومت ہند میں شہری امور کے سکریٹری درگا شنکر مشرا، ایم ایل اے دلیپ پانڈے وغیرہ شامل ہیں۔ پرکھر مالویہ کانہا نے نظامت کی۔ مہمان اعزازی وزیر انوپریہ پٹیل نے کہا کہ ملک اور دنیا جہاں بھی جائیں، ایک منی پوروانچل ملے گا اور یہ یہاں کے فن اور ثقافت کی وجہ سے ہے جو نہ صرف دلوں کو لبھانے والا اور لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس، نئی دہلی میں منعقدہ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے مائی کے صدر رام بہادر رائے نے کہا کہ مٹی کا شعری مجموعہ اشاعت اور تدوین کے کامل معیار پر پورا اترتا ہے۔ یہ تین چار نسلوں کی شاعری اور تاریخ مرتب کرنے کے مترادف ہے۔ مستقبل میں مائی تنظیم پوروانچل کے فنون پر کچھ ایسا ہی مثبت کام کرنے کی کوشش کرے گی۔ کتاب کے ایڈیٹر آصف اعظمی نے بتایا کہ کورونا کی دوسری لہر کے درمیان جب پوری عالمی برادری ڈپریشن سے گزر رہی تھی، 'مائی' تنظیم نے پوروانچل کے شاعروں کو ٹوئٹر اسپیس کے شعری سیمینار میں شامل کیا، جس کے سبب انھیں اپنی تخلیقات کی پیشکش کا ایک جدید پلیٹ فارم بھی ملا اور عام آدمی کو صاف ستھری تفریح بھی۔ 'مائی' شعری مجموعہ خاص طور پر انھی شعرا پر مبنی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 دسمبر 2021

دور جدید

نئی دھلی: انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے شعبہ اردو صحافت کے طلبا کے ذریعے تیار کردہ لیب جرنل کا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جنرل پروفیسر سنجے دویدی نے اجرا کیا۔ اس موقعے پر آئی آئی ایم سی کے ڈائرکٹر جنرل پروفیسر سنجے دویدی نے کہا کہ ہندوستانی زبانوں کی صحافت نے تحریک آزادی میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ اردو صحافت اس میں پیش پیش رہی ہے۔ لالہ لاجپت رائے جیسے ہند سماچار کے بانیوں اور دوسرے انقلابیوں نے اسے ایک نئی سمت دی۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیا نے بھی آزادی کے بعد کافی ترقی کی ہے۔ اردو اخبارات نے بھی نئی ٹیکنالوجی کو اپنانے کے بعد کافی تقویت حاصل کی ہے۔ آج اردو میڈیا کو ایک عالمی شناخت حاصل ہے۔ اردو صحافت کورس کے ڈائرکٹر پروفیسر (ڈاکٹر) پرمود کمار نے بتایا کہ اس لیب جرنل کے ذریعے طلبا رپورٹنگ، ایڈیٹنگ اور لے آوٹ کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن کا مقصد کتابی علم کے ساتھ عملی تربیت فراہم کرنا بھی ہے۔ ادارے کے مختلف شعبہ جات کے طلبا بھی اس طرح کے لیب جرنل کو باقاعدگی سے شائع کرتے ہیں۔ شعبۂ اردو صحافت کے اکیڈمک ایسوسی ایٹ ڈاکٹر افسر علی، لیب جرنل کی ایڈیٹوریل ٹیم کے سرور علی، آمنہ فاروق، محمد سمیر اور منیر الاسلام بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 1 دسمبر 2021

اندر کا موسم

مالیگاؤں: مالیگاؤں کے بزرگ اور استاد شاعر کے اولین مجموعہ کلام 'اندر کا موسم' کا اجرا اتوار کی شب نقاد، شاعر اور ادبی شخصیت سلیم شہزاد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اجرا کی اس پروقار تقریب کی صدارت شہر کے معروف سرجن ڈاکٹر سعید احمد فارانی نے کی۔ تقریب کا آغاز قاری رفیق احمد ملی کی تلاوت قرآن سے ہوا، بعد ازاں فیضی عدنان ملک اور گلریز شہزاد ہاشمی نے بالترتیب صاحب اعزاز کی تحریر کردہ حمد اور نعت کو اپنی خوش الحانی سے آراستہ کرتے ہوئے سماں باندھ دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی نے مجموعہ کلام کی تقدیسی شاعری پر پرمغز تبصرہ سامعین کے سامنے پیش کیا۔ مجموعہ کلام کے رنگ تغزل پر لئیق انور اور متفرقات پر جمیل کرانتی نے اپنے خوبصورت تبصروں کو سامعین کی سماعتوں کے حوالے کیا۔

اس سے قبل ارم پرائمری اسکول کے پرنسپل اور صاحب کلام کے شاگرد مختار قریشی نے صالح ابن تابش کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو کی اور ایک شاگرد کی حیثیت سے اپنے استاد کو خراج تحسین پیش کیا۔ دریں اثنا کتاب کے دیدہ زیب سرورق کی رونمائی پینٹر نثار احمد اور خوبصورت پس ورق کی رونمائی رشید آرٹسٹ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انجمن معین الطلبا اور ادارہ گنج ادب کے اشتراک سے منعقد کی گئی اس شاندار تقریب کی نظامت محمد یاسین اعظمی نے کی۔

تقریب کے اختتامی مراحل میں ڈاکٹر سعید احمد فارانی نے خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے صاحب اعزاز صالح ابن تابش کو ایک خوبصورت مجموعہ کلام کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ صدارتی خطاب کے بعد صدر محفل اور حاضرین کی درخواست پر صالح ابن تابش نے مترنم آواز میں اپنے مجموعہ کلام سے منتخب نعتیہ کلام پیش کیا۔

پریس ریلیز: رضوان ربانی، 6 دسمبر 2021

وفیات

ونود دُوا

نئی دھلی: معروف صحافی ونود دُوا کا 4 دسمبر کو یہاں کے اپولو اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 67 برس تھی۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ چھوٹی بیٹی ملیکا دُوا نے بتایا کہ ونود دوا نے شام تقریباً ساڑھے چار بجے آخری سانس لی۔ ان کی دوسری بیٹی بکل دُوا ماہر نفسیات (کلینکل سائیکولوجسٹ) ہیں۔

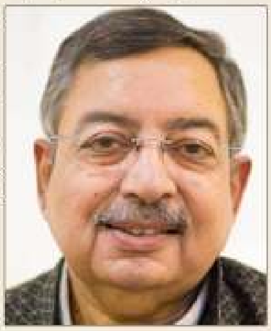

ونود دوا، جنھیں جگر کے انفیکشن کی وجہ سے کچھ دن پہلے پرمانند اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، گزشتہ پانچ دنوں سے اپولو اسپتال کے آئی سی یو میں زیر علاج تھے۔ وہ کورونا سے متاثر ہوئے تھے مگر اس کے چنگل سے نکل آئے تھے، البتہ اس کے بعد سے ان کی صحت مسلسل گرتی چلی گئی۔ ان کی اہلیہ چنّا دوا کا انتقال 11 جون کو کورونا ہی کے سبب ہوا تھا۔ ایک خوش مزاج اور زندہ دل صحافی ونود دوا ملک کے ٹیلی ویژن صحافیوں کی پہلی نسل کے معروف ناموں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے دوردرشن، این ڈی ٹی وی اور سہارا نیوز چینل میں کام کیا۔ انھیں 1996 میں رام ناتھ گوئنکا جرنلزم ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ وہ اس اعزاز کو حاصل کرنے والے پہلے ٹی وی صحافی تھے۔ انھیں 2008 میں منموہن سنگھ حکومت کے دور میں پدم شری سے نوازا گیا تھا۔ جون 2017 میں انھیں ممبئی کے پریس کلب میں 'ریڈ انک' کا 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' بھی دیا گیا تھا۔ ونود دوا، 11 مارچ 1954 کو ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے تھے جو اب پاکستان میں ہے۔ ان کا خاندان تقسیم ہند کے وقت دہلی آیا تھا۔ انھوں نے دہلی کے ہنس راج کالج سے گریجویشن مکمل کیا اور دہلی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ٹی وی کی دنیا کو اپنی موجودگی سے پرکشش بنانے والے ونود دوا انکُر ناٹک گروپ کے ایک فعال رکن تھے۔ ان کا پروگرام 'ذائقہ انڈیا کا' کافی مقبول ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 دسمبر 2021

شوکت علی ایڈوکیٹ

رامپور: معروف وکیل، سینئر ادبی شخصیت، بے باک لیڈر، مصنف تاریخ رامپور شوکت علی خاں ایڈوکیٹ کا 21 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر پھیلی ان کی رہائش گاہ مسجد پیلو واقع راجدوارہ پر لوگ پہنچنے لگے۔ شوکت علی خاں کی ولادت 11 جون 1946 کو رامپور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم راجدوارہ میں ہوئی۔ رضا انٹر کالج سے 1962 میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ 1967 میں لکھنؤ سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور تب سے ہی رامپور کچہری میں پریکٹس شروع کردی تھی۔ شوکت علی خاں تاریخ رامپور سمیت درجن بھر کتابوں کے مصنف و مرتب تھے۔ 24 اکتوبر کو وہ صولت پبلک لائبریری کے صدر منتخب ہوئے اور 4 نومبر کو تقریب حلف برداری کا عظیم الشان پروگرام منعقد کرایا تھا۔ وہ سیاسی، سماجی اور ادبی، ملی شخصیت کے مالک تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 نومبر 2021

ہارون رشید غافل

اررِیہ: اردو کے مشہور شاعر ہارون رشید غافل کا 29 نومبر کی شام حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر صرف 56 سال تھی۔ پسماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور چار بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی موت کی خبر نے ضلع اور اطراف کے شہروں اور گاؤں بالخصوص ادبی حلقوں میں غم واندوہ کی لہر دوڑا دی۔ وہ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے اور مقامی زبانوں میں بھی نظم ونثر لکھتے تھے۔ ان کی تجہیز وتدفین 30 نومبر کو بعد نماز ظہر ان کے آبائی گاؤں

گیاری میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں ہزاروں لوگ شریک رہے۔ مرحوم کی طبیعت 29 تاریخ کو اچانک خراب ہوئی جس کے بعد انھیں شہر کے سٹی ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے ان کی نازک حالت کے پیش نظر پورنیہ صدر اسپتال ریفر کردیا لیکن ان کے اہل خانہ نے میکس اسپتال میں داخل کرایا مگر تب تک دیر ہوچکی تھی، وہ زندگی کی جنگ ہار چکے تھے۔ ان کے اچانک انتقال سے سماجی اور ادبی حلقوں میں لوگ مغموم ہیں، وہ سیمانچل کے خطے میں بے پناہ عوامی مقبولیت کے حامل بااثر شخصیت تھے۔ ان کی آواز کا جادو دور دور تک لوگوں پر چلتا تھا۔ ان کا شمار بہار کے چہیتے شاعروں میں تھا۔ وہ الخنس ملیہ کالج میں لکچرر اور آل انڈیا ریڈیو پورنیہ میں اناؤنسر تھے۔ مقامی زبان کلہیا میں بھی شاعری کرنے کی وجہ سے وہ جہاں اردو آبادی میں معروف تھے وہیں ان کی مقبولیت غیر اردو داں عوام میں بھی تھی۔ 1999 میں خواندگی مہم کو عوام تک لے جانے اور ناخواندہ افراد کو خواندہ بنا کر مرکزی دھارے میں لانے کے لیے ایک نعرہ ضلع میں بہت مشہور ہوا تھا، وہ نعرہ تھا 'پڑھے گی رضیہ، پڑھے گا ہریا، ساکشر ہوگا ضلع اررِیہ'۔ یہ نعرہ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں گیاری کے باشندے ہارون رشید غافل نے دیا تھا۔ ہارون رشید غافل نے ضلع بھر میں اسٹیج اناؤنسر کا کردار بھی ادا کیا، وہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ ہارون رشید غافل 5 مئی 1965 کو اپنی ننیہال بسنت پور کگڑوا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1980 میں علاقائی کلہیا میں شاعری کا آغاز کیا۔ 1999 میں خواندگی مہم کا نعرہ لکھا اور پورے ضلع میں نام کمایا۔ ہارون رشید غافل کو ان کی شعری صلاحیتوں کے اعتراف اور نمایاں خدمات کے لیے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری انعامات واعزازات سے سرفراز کیا گیا۔ اہل علم و ادب اور سیاسی شخصیات نے ان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو ملک وملت خاص طور پر اررِیہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 نومبر 2021

صادقہ تسنیم

لکھنؤ: معروف ملی، ادبی و سماجی رہنما صادقہ تسنیم صاحبہ ایک ماہ سے موذی مرض سروایکل کینسر سے لڑ رہی تھیں۔ علاج کے دوران بعد فجر وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ بعد نماز ظہر ان کی نماز جنازہ ٹڑھی مسجد کے امام مولانا محمد اکمل نے پڑھائی اور سوگواروں کی کثیر تعداد کی موجودگی میں ان کی تدفین آمنہ مسجد قبرستان بنگلہ بازار لکھنؤ میں ہوئی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا صادق سکندر اور بہو ان کے بچے ہیں۔ ان کے شوہر خضر حیات سکندر کا بیس سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔ صادقہ تسنیم نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر زندگی کو خدمت خلق کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کا اکادمی و شہر کی مختلف ادبی و سماجی تنظیموں سے تعلق اور لگاؤ تھا۔ موجودہ وقت میں بجنور کے اپنے مکان پر انھوں نے لڑکیوں کو خودکفیل بنانے کے لیے ایک دستکاری سینٹر زیب تن کے نام سے چلا رکھا تھا جہاں سے کافی لڑکیاں دستکاری کی تعلیم حاصل کر خودکار اور باوقار ہو گئیں۔ بے لوث، بے غرض و انسان پرور خاتون محترمہ صادقہ تسنیم کی کمی علاقے اور شہر کے ادبی حلقوں میں ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 دسمبر 2021

خراج عقیدت

علامہ شبلی نعمانی

اعظم گڑھ: علامہ شبلی نعمانی جیسی شخصیات بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح کے عالم دین تھے۔ انھوں نے علی گڑھ، حیدرآباد اور ندوۃ العلما لکھنؤ میں خدمات انجام دیں۔ آخر میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی ادارہ قائم کیا اور اس ادارے نے علم و تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ آج ان کی وفات کے 107 سال مکمل ہوئے ہیں۔ علامہ شبلی نے 1883 میں جو نیشنل اسکول قائم کیا تھا آج وہ کالج بن چکا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈائرکٹر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سابق چیئرمین دہلی اقلیتی کمیشن ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے شبلی نیشنل کالج میں یوم علامہ شبلی نعمانی پر منعقد تقریب میں بہ حیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر مسلمانوں میں مختلف میدانوں کے ماہرین پیدا ہوں گے تو اس کی قدر ہوگی اس لیے بہترین تعلیمی ادارے قائم کریں، تب ہی ترقی ممکن ہے، ہمارے بزرگوں نے جو کام کیے ہیں ہم ان کو آگے نہیں بڑھا سکے ہیں اس لیے ہمیں اور ہر نسل کو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ شادیوں میں بے جا خرچ سے گریز کریں اور قوم کی ترقی کو بہترین مقصد بنائیں۔ مہمان خصوصی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں وکشمیر یونیورسٹی وائس چانسلر پروفیسر اکبر مسعود نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ابھی چند روز قبل اعظم گڑھ میں حکومت کی جانب سے یونیورسٹی بنانے کا اعلان ہوا ہے لیکن شبلی کالج کسی یونیورسٹی سے کم نہیں ہے اس کو یونیورسٹی کی طرف پیش رفت کرنا چاہیے۔ مہمان اعزازی ڈائرکٹر آئی او ایس سینٹر فار ہسٹوریکل اینڈ سولائزیشن اسٹڈیز دہلی پروفیسر جمال الدین نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی علوم کی انجمن تھے۔ انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ پروفیسر انور مسعود نے کہا کہ جب شبلی کی علی گڑھ میں تقرری ہوئی تو سرسید اور شبلی کے نظریہ میں میل نہیں تھا اس کے باوجود انھوں نے سرسید کی حیات تک علی گڑھ کو نہیں چھوڑا۔ شبلی کی کوشش تھی کہ قوم میں گریجویٹ پیدا ہوں جو قوم کی ذمہ داریوں کو سنبھالیں۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے کہا کہ شبلی کو صرف 32 سال کی عمر میں شمس العلما کا خطاب ملا تھا۔ ان کی زندگی سیرت رسولؐ سے شروع ہوئی اور اختتام بھی اسی پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ.................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

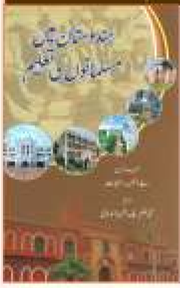

ترتیب وتدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

مغربی تعلیم اور مسلمان

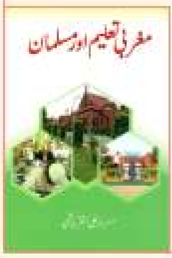

مصنف ومترجم: مسرور علی اختر ہاشمی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 240

قیمت: 130 روپے

دیوان داراشکوہ

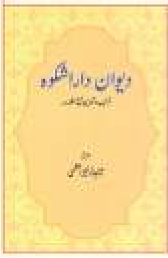

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 208

قیمت: 125 روپے

علم البیان: اقسام نثر ونظم

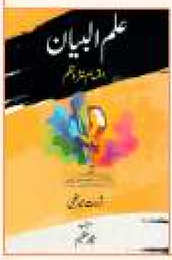

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

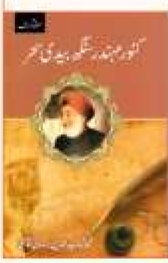

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

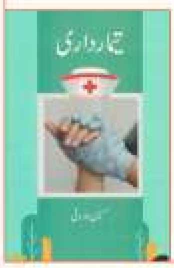

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

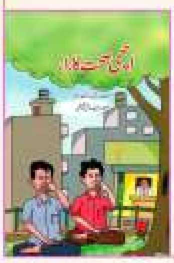

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जनवरी-२०२२,वर्ष:२४, अंक:१

URDU DUNIYA Monthly, January-2022, Vol.24, Issue:01

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2020-22

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:24/12/2021

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6